دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
اگست 2014
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
عید مبارک
دو سلسلہ وار
لاوارث - چمگادڑ
اسلم راہی کی تاریخی کہانی
سمرقند کا ساحر
مُعاشرتی ناول
احساس کی قید

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی : محمود ریاض

مدیرِ اعلیٰ : عامر محمود

منتظم : محمد شفیع

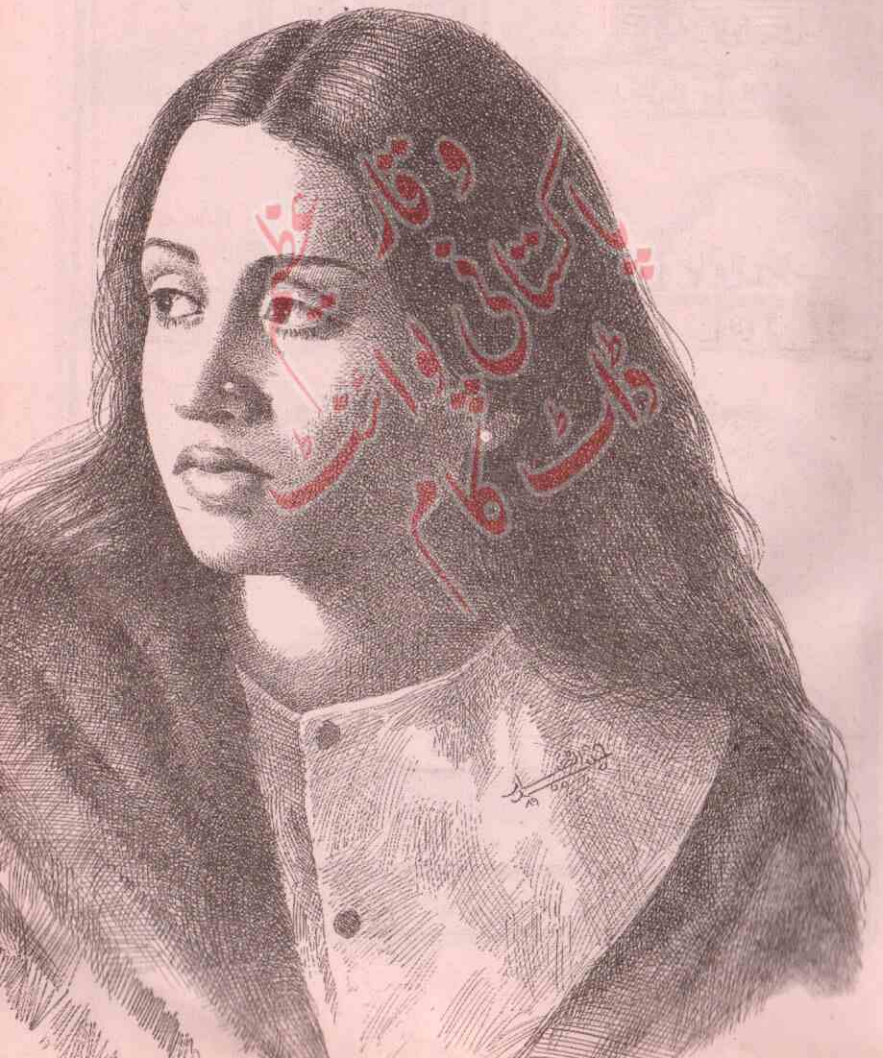

سمرقند کا ساحر — اسلم راہی — 8

یادگار — احمد صغیر صدیقی — 37

تاوان کلینک — ایم الیاس — 48

چمگادڑ — ایم اے راحت — 62

سرپرائز — اکرام اختر — 88

لاوارث — غزالہ جلیل راؤ — 94

ساتواں نقاب — فوزیہ ناہید — 118

چارہ ساز — سلطان جمیل نسیم — 157

فرضی مقتول — صابر حسین — 162

انتم سنسکار — عذرا نقوی — 180

فرار سے پہلے — فوزیہ ناہید — 184

آخری دعا — کامران جاذب — 193

حادثہ — اویس احمد — 197

توتا کہانی — ڈاکٹر سلیم اختر — 206

غم الفت — احمد رضا خان — 213

جنون — حمود الدین ناز — 223

احساس کی قید — سیدہ عطیہ زاہرہ — 234

مسکراہٹیں

اگست 2014ء ❁ قیمت 40 روپے ❁ جلد 44 ❁ شمارہ 4

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی۔

Pakistanipoint Waqar Azeem

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

سمر قند کا ساحر

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں، اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم، ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور راستے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

لشکر میں چونکہ لشکریوں اور سالاروں کے اہل خانہ بھی تھے لہٰذا رات کو لشکر کا ایک حصہ جاگنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا تا کہ دشمن شب خون نہ مار سکے۔

چنانچہ جب خیمے نصب کر دیے گئے تب علی بن ربیع اپنے خیمے میں داخل ہوا۔ خیمے کے اندر راحیل اسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ خیمے کے اندر دو صاف ستھرے بستر لگا رکھے تھے آگے بڑھ کر علی بن ربیع راحیل کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک راحیل کو دیکھتا رہا۔ راحیل مسکراتی رہی پھر علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"آپ مجھے اس طرح غور اور حیرت سے دیکھ رہے ہیں جیسے اس سے پہلے میری آپ کی شناسائی ہی نہ ہو، میرا آپ کا تعلق ہی نہ ہو۔" راحیل کے ان الفاظ پر علی بن ربیع کھلکھلا کر ہنس دیا پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"راحیل ایسی بات نہیں ہے۔ تمہاری شخصیت ہی ایسی ہے کہ جب بھی میں تمہیں دیکھتا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پہلی بار تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" اس پر راحیل مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں اب آپ کی بیوی ہوں، ایک ایسی بیوی جو اپنے شوہر کی خدمت کرنا جانتی ہے، میری شخصیت اور میرے چہرے کی ساری خوب صورتی اور میری رعنائیاں آپ کے لیے ہیں پھر بھی مجھے اجنبی خیال کرتے ہیں۔" علی بن ربیع پھر مسکرا دیا، کہنے لگا۔

"نہیں راحیل! وہ تو میں مذاق کر رہا تھا در اصل میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں خیمہ میں زندگی بسر کرنے کا تمہارا پہلا موقع ہے کہیں تم اسے اپنے لیے پریشانی یا مصیبت کا باعث تو نہیں سمجھ رہی ہو۔"

علی بن ربیع کے ان الفاظ پر راحیل سنجیدہ ہو گئی پھر کہنے لگی۔ "یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں، میں آپ کی بیوی ہوں، بیوی بھی ایسی جس نے شادی سے پہلے آپ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ آندھی ہو طوفان ہو جھونپڑا ہو میدان ہو کوہستانی سلسلہ ہو بیابانی ہو جہاں کہیں بھی آپ مجھے رکھیں گے آپ کے ساتھ رہتے ہوئے میں سمجھوں گی مجھے دنیا بھر کی نعمتیں میسر ہیں۔ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے آپ دیکھیں گے میں کسی قسم کا شکوہ شکایت اپنی زبان پر نہیں لاؤں گی جس طرح کی زندگی میں نے آپ کے ساتھ شروع کر رکھی ہے میں ایسی ہی زندگی کی خواہش مند تھی۔

مجھے یہ بھی تسلی ہے کہ میرا بھائی بھی لشکر میں شامل ہو چکا ہے اور وہ اپنی بیوی حبہ کے ہمراہ ہمارے ساتھ ہے۔"

یہاں تک کہتے کہتے راحیل کو رک جانا پڑا اس لیے کہ روبیل اور حبہ عبدالرزاق اور معارہ چاروں خیمے میں داخل ہوئے تھے۔ چاروں مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور خیمے میں جو بستر لگے ہوئے تھے ان پر بیٹھ گئے۔ گفتگو کا آغاز علی بن ربیع نے کیا اور آنے والے چاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم چاروں کی آمد سے پہلے میں راحیل سے خیمے کی زندگی سے متعلق گفتگو کر رہا تھا کہ یہ خیمے کی زندگی کی عادی نہیں ہے کہیں گھبرا تو نہیں گئی اور یہ کہہ رہی تھی کہ اصل زندگی تو یہی خیمے کی ہے حویلی میں زندگی بسر کرتے ہوئے یکسانیت کا شکار ہو گئی تھی اب تم چاروں آ گئے ہو تو جو صورت حال پیش آ رہی ہے اس سے عبدالرزاق نے آپ لوگوں کو آگاہ کر دیا ہو گا۔"

علی بن ربیع کے ان الفاظ پر روبیل بولا اور کہنے لگا۔

"بھائی! آپ کا اندازہ درست ہے، بھائی عبدالرزاق ہمیں بتا چکے ہیں کہ آج رات آپ اپنے خیمے میں آرام کریں گے اور جس وقت لشکر یہاں سے کوچ کرے گا تب آپ اپنی کسی نئی مہم پر جائیں گے۔"

اس پر راحیل چونک سی پڑی تھی۔ غور سے علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ علی بن ربیع نے اس کے چہرے کا اندازہ لگا لیا تھا

لہٰذا اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"راحیل! تمہیں پریشان اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر تک کھانا آنے والا ہے پہلے کھانا کھاتے ہیں اس کے بعد جو مہم مجھے پیش ہے اس کی تفصیل میں تمہیں بتاؤں گا۔"

راحیل مطمئن ہو گئی تھوڑی دیر تک کھانا آ گیا لہٰذا سب اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تھے۔

امیر مودود نے اپنے لشکر کو ایک رات اور ایک دن مکمل طور پر آرام اور ستانے کا موقع فراہم کیا اور اگلی شب کو پڑاؤ ختم کر دیا گیا۔ خیمے اکھیڑ دیے گئے جب رات گہری ہو گئی تب آنے والے تین مخبروں میں سے دو کے ساتھ امیر مودود لشکر کے دو حصے لے کر آگے بڑھا تھا اور ایک مخبر کی راہنمائی میں علی بن ربیع لشکر کا تیسرا حصہ لے کر بائیں جانب کے کوہستانی سلسلوں میں غائب ہو گیا تھا۔

نئے سلطان محمد کے بیٹے احمد کا وہ لشکر جسے اس نے گھات میں بٹھا رکھا تھا، تا کہ جنگ کے دوران وہ مودود کے لشکر کی پشت کی طرف سے حملہ آور ہو بالکل مطمئن اور آسودہ تھا کیونکہ وہ لوگ کوہستانی سلسلے کے پشتی حصے میں گھات لگائے ہوئے تھے لہٰذا وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اچانک ان پر کوئی حملہ آور بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف علی بن ربیع اور امیر مودود صلاح مشورہ کرنے کے بعد ایک مناسب رفتار سے پیش قدمی کر رہے تھے۔

علی بن ربیع اس وقت گھات میں بیٹھے لشکر کے قریب پہنچا جس وقت دور مشرق سے سورج اپنے سرخ چہرے سے دھرتی سے تانک جھانک کرنے لگا تھا، علی بن ربیع اپنی پوری تیاری اور ترتیب کے ساتھ وہاں پہنچا تھا جونہی رہبری کرنے والے مخبر نے یہ اطلاع دی کہ گھات میں بیٹھنے والا لشکر بالکل سامنے اور نزدیک ہے تب علی بن ربیع اپنے لشکر کو بھاگتے وقت کے پاسبانوں کی طرح حرکت میں لایا پھر وہ ہولناک مخالفت کے پیچ و تاب میں زندگی کا سکون چھین لینے والے قدرت کے احتساب کی طرح آگے بڑھا پھر وہ احمد کو گھات میں بٹھائے لشکر پر صدیوں کے راز کھولتی خوفناک اور بے روک قوتوں جذبوں اور احساسات پر ضربیں لگاتے بحر کے غصیلے رقص سکون و آسودگی چھین لینے والے فطرت کے جلال کے عکس اور فنا خیر انجام سے دوچار کرتی ہولناک طاقتور قضا کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے گھات میں بیٹھا ہوا لشکر بھی بے پہرگی کے روگ خیالات سے آشنا لمحوں اور خوف پھیلاتے بگولوں کی طرح حرکت میں آیا تھا لیکن اس وقت تک علی بن ربیع نے گھات میں بیٹھے لشکر کو اس طرح دبوچ لیا تھا جیسے کوئی شاہین اپنے پنجوں میں بے بس فاختہ کو دبوچ کر اپنے سامنے مجبور کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی حالت گھات میں بیٹھے ہوئے اس لشکر کی بھی تھی اپنے تیز حملوں سے علی بن ربیع نے گھات میں بیٹھے ان لشکریوں کو دم نہیں لینے دیا۔ جس وقت وہ جوابی کارروائی کر کے حرکت میں آئے تھے اس وقت تک علی بن ربیع نے کافی حد تک ان کی تعداد کم کر دی تھی اس کے بعد وہ مزید بپھر گیا اور گھات میں بیٹھے اس لشکر پر دو اطراف سے وہ سیاہ رنگ حوادث کے غبار رقص ماتم خیز، فراق اور ہجر کے دکھ انحطاط اور زوال طاری کرتے ان دیکھے اندیشوں کی طرح بڑی تیزی سے چھانا شروع ہو گیا تھا۔

بہت جلد گھات میں بیٹھے اس لشکر کی حالت علی بن ربیع کے سامنے بستر کو ترستے تھکے ہارے سیاحوں، حرارت کو ترستے ٹھٹھرتے انسانوں، تیروں کو ترستے شکاریوں، منزل کے نشانات کو ترستے مسافروں اور تعبیر کو ترستے خوابوں سے بھی زیادہ ابتر ہونا شروع ہو گئی تھی یہاں تک کہ علی بن ربیع نے ان سارے لشکریوں کو کوہستانی سلسلے میں گھیر کر ان کا خاتمہ کر دیا تھا اور جس قدر ان کے پاس سامان تھا اس سارے سامان پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔

دوسری طرف امیر مودود احمد کے لشکر کے

سامنے اس وقت آیا جس وقت دھوپ چڑھ چکی تھی دوسری طرف گھات میں بیٹھے لشکر سے ابن ربیع مکمل طور پر نبٹ چکا تھا۔

چنانچہ مودود کے لشکر کو دیکھتے ہی احمد نے اپنے لشکر کو صفیں درست کرنے کا حکم دے دیا تھا چنانچہ اس کے حکم پر اس کے لشکر میں بڑے بڑے طبل اور دفیں بج اٹھی تھیں۔

احمد نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا وسطی حصے میں وہ خود رہا اپنے ساتھ اس نے ناتھو کو رکھا۔ دوسرے حصے کی کمان داری سلیمان بن یوسف کے پاس تھی۔ رام دیو اس کی نیابت کر رہا تھا۔ تیسرا لشکر علی خویشاوند کی کمان داری میں تھا اور تو لک اس کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

احمد اور اس کے سالاروں نے جب دیکھا کہ اس کے مقابلے میں مودود کے لشکر کی تعداد بہت کم ہے تو انہوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا وہ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ اتنے سے لشکر کو تو وہ لمحوں کے اندر کھنگال کر رکھ دیں گے اس طرح اپنی کامیابی اور فتح مندی کو یقینی بنالیں گے لیکن اسی وقت ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب دائیں جانب کے کوہستانی سلسلے کے اوپر سے علی بن ربیع اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے کوہستانی سلسلے سے نیچے اترنا شروع کیا تھا۔

جس وقت یہ حادثہ ہوا تھا اس وقت احمد اپنے سارے سالاروں کے ساتھ اپنے لشکر کے آگے کھڑا تھا کچھ دیر تک کوہستانی سلسلے کے اوپر سے اترنے والے لشکر کی طرف وہ غور سے دیکھتا رہا پھر اپنے سالاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا یہ جو لشکر ہمارے دائیں جانب کوہستانی سلسلے سے اتر رہا ہے یہ کم از کم ہمارا وہ لشکر تو نہیں ہے جسے ہم نے گھات میں بٹھایا تھا اگر یہ ہمارا لشکر نہیں ہے تو پھر اس سے دو باتیں سامنے آسکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ یہ مودود کا لشکر ہے گویا مودود دو مختلف سمتوں سے ہمارے سامنے آنے کی منصوبہ بندی کر چکا ہے۔

اور اگر یہ مودود کا لشکر ہے تو جس سمت سے آیا ہے اسی سمت میں ہمارے ایک لشکر نے گھات لگائی تھی اگر یہ لشکر صحیح سلامت اتر رہا ہے تو پھر اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوہستانی سلسلے سے اترنے والے اس لشکر نے ہمارے لشکر کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا ہوگا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قدر بے باکی اور اس قدر سکون کے ساتھ یہ لشکر کوہستانی سلسلے سے نیچے نہ اترتا۔

یہاں تک کہنے کے بعد احمد رکا کچھ دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ احمد چونک اٹھا اور کہنے لگا۔

وہ دیکھو کوہستانی سلسلے سے اترنے والا وہ لشکر مودود کے لشکر کا رخ کر رہا ہے۔ اس موقع پر علی خویشاوند گھبراہٹ اور فکر مندی میں چونک اٹھا۔

یہ لشکر واقعی مودود کا ہے اس لیے کہ جو لشکر کوہستانی سلسلے سے اتر رہا ہے اس کے سامنے اس لشکر کا جو سالار ہے اسے غور سے دیکھو میں اسے پہچان چکا ہوں وہ علی بن ربیع ہے۔

علی بن ربیع کا نام سن کر احمد ہی نہیں اس کے سالاروں پر بھی کپکپی طاری ہو گئی تھی لہٰذا علی خویشاوند کے اس انکشاف میں احمد بولا اور کہنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے یہ علی بن ربیع گھات میں بیٹھے ہمارے لشکر کا خاتمہ کرنے کے بعد کوہستانی سلسلے سے اترا ہے۔ میرے عزیز ساتھیو! اپنے لشکریوں تک یہ خبر نہیں پہنچنی چاہیے کہ جس لشکر کو ہم نے گھات میں بٹھایا ہے۔۔۔“

یہاں تک کہتے کہتے احمد کو خاموش ہو جانا پڑا اس لیے کہ یہ ایک طرف سے ایک گھڑ سوار اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا۔ گھبراہٹ اور فکر مندی میں کہنے لگا۔

”ہمارا جو لشکر گھاٹی میں تھا میں اسی سے بچ کر آیا ہوں صبح سویرے علی ربیع لشکر کے ایک حصے کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا اور تقریباً سارے لشکریوں کا خاتمہ کر دیا۔ میں اور میرے چند ساتھی بڑی مشکل سے کوہستانوں کی بھول بھلیوں سے ہوتے ہوئے

اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔“ احمد کا رنگ اس موقع پر پیلا ہو گیا تھا پھر وہ سارے سالاروں اور آنے والے اس شخص کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”کسی لشکری پر بھی یہ بات عیاں نہیں ہونی چاہیے کہ جو لشکر ہم نے گھات میں بٹھایا تھا اس پر علی بن ربیع حملہ آور ہوا اور مکمل طور پر ان کا خاتمہ کر دیا ہے اگر ایسا ہو گیا تو یاد رکھنا ہمارے لشکر میں بددلی پھیل جائے گی اور اگر بددلی پھیلے گی تو شکست ہمارا مقدر بن جائے گی۔“

آنے والے مخبر اور سارے سالاروں نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا صفوں کو آخری شکل دینے کے بعد سارے سالار اپنے اپنے حصے کے لشکر کے سامنے چلے گئے تھے۔

دوسری سمت علی بن ربیع جب اپنے لشکر کے پاس آیا اور اس نے یہ خبر دی کہ دشمن کا جو لشکر گھات میں بیٹھا ہوا تھا اس کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا ہے تب امیر مودود اور دوسرے سالاروں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لشکریوں کے اندر بھی ایک جذبہ اور ولولہ پھیل گیا تھا۔ اتنی دیر تک لشکر کے پیچھے پڑاؤ قائم کر دیا گیا تھا جس میں عورتوں اور لشکریوں کے اہل خانہ کو منتقل کر دیا گیا تھا۔ لشکر کا ایک چھوٹا سا حصہ ان کی حفاظت پر مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد لشکر کی ترتیب کو آخری شکل دی جانے لگی تھی۔

خود امیر مودود وسطی حصے میں رہا اپنے ساتھ اس نے عبدالرئیس بن عبدالعزیز کو اور دائیں حصے کی کمان داری علی بن ربیع کو اور بائیں حصے کی کمان داری عبدالزارق کو سونپی گئی تھی۔ اب امیر مودود علی بن ربیع اور عبدالرزاق اپنے دشمن کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد احمد نے جنگ کی ابتدا کی۔ اپنے لشکر کو اس نے تپتے صحراؤں کی لو میں عذاب کا باعث بنتے جھلسا دینے والے بگولوں کی طرح آگے بڑھایا، پھر وہ امیر مودود کے لشکر پر انجان راستوں سنسان راہوں پر جسموں کو سلگا دینے والے اور زندگی کے چراغ بجھاتے موت کے الجھتے گرداب کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

جوابی کارروائی کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنے لشکر کے وسطی حصے کے ساتھ تو امیر مودود حرکت میں آیا۔ اس نے بھی اپنے لشکر کو سانسوں کے تسلسل میں بے نام وحشتیں بھر دینے والے بپھرتے جذبوں کے طوفانوں کی طرح آگے بڑھایا پر وہ احمد کے لشکر پر زیست کے ہنگاموں میں بربادی کا کرب پھیلاتی درد ہجر کی کہانیوں پامال راستوں روندھی ہوئی شاہراہوں پر نفرت کی آگ کے بھنور اور رنج غم کے کھلیان کھڑے کرتی بے زنجیر سرکش آندھیوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

امیر مودود کے بعد علی بن ربیع نے بھی اپنے لشکر کو دکھوں کی معیاد بڑھاتے، ستم کی برسات کی طرح آگے بڑھایا پھر وہ احمد کے لشکر پر خونی لمحوں کی کہانیوں، تازیانوں کو جھیر جھیر کر کے کپکپی طاری کرتی بحری آندھیوں، سماعتوں پر برق ابن کر نزول کرتی قہربانی طغیانیوں اور زندگی کی مسافتوں میں زنگ آلود سوچیں بھر دینے والے ہولناک اعصابی ہیجان کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

اس کے ساتھ ہی عبدالرزاق بھی حرکت میں آچکا تھا اور وہ بھی احمد کے لشکر پر زیست میں ہر شے کو زبان گرفتہ کرتے غموں کے اٹھتے بھنور اور شب کی نیرنگی میں موت کی سی یورش کر دینے والے ہولناک صحرائی جھکڑوں اور مرگ کے مناظر کھڑی کرتی کرب کی صدیوں کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

اس طرح کوہستانی سلسلوں کے اندر کٹھن کٹھور منزلیں دکھوں کی آنچ جسم و جان کا کرب موت کے دائمی عذاب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وقت کی بساط میں ہر کوئی نفرت کے رنگ بھرنے لگا تھا۔ تمدن کی روحیں ریزہ ریزہ کر دینے والے زخموں کا شکار ہونے لگی تھیں۔

چاروں طرف بادل کی اداسیاں تباہی کی

دیوداسیاں وہموں کی سنسانیاں زیست کے ہنگاموں کی کہانیاں اور کھولتے ہوا کی طغیانیاں رقص کرنے لگی تھیں۔

جس وقت دونوں لشکر بری طرح ایک دوسرے سے ٹکرار ہے تھے اس موقع پر امیر مودور کے مخبروں نے ایک زبردست کام کیا وہ کسی نہ کسی طرح دشمن کے پڑاؤ اور لشکر کے پچھلے حصے میں گھس کر یہ خبریں پھیلانے میں کامیاب ہوگئے کہ احمد نے اپنے لشکر کا جو ایک حصہ کوہستانی سلسلوں میں پیچھے گھات میں بٹھایا تھا تا کہ مودود کے لشکر کی پشت پر حملہ آور ہو کر اپنی فتح مندگی کو یقینی بنائے اس کا علی بن ربیع نے مکمل طور پر خاتمہ کر دیا ہے اور علی بن ربیع اس لشکر کا خاتمہ کرنے کے بعد مودود سے آملا ہے۔

دوسری خبر انہوں نے یہ بھی پھیلا دی کہ جو لشکر اس وقت امیر مودود کا زن سے ٹکرایا ہے اس کے پاس صرف یہی لشکر نہیں بلکہ اس کے پیچھے پیچھے اس کی رسد اور کمک کے طور پر ایک اور بڑا لشکر آرہا ہے جو کسی بھی لمحہ کسی پہلو یا پشت کی جانب سے احمد کے لشکر پر حملہ آور ہوسکتا ہے۔

یہ افواہیں جب احمد کے لشکر میں پھیلنا شروع ہوئیں تو پھر احمد کے لشکر کے اندر اس صورت حال میں احمد کے لشکر کی حالت بڑی تیزی سے رات کی تاریکیوں میں رقص کرتی موت اور نیستی کے لامتناہی سلسلوں، راحت اور اطمینان سے محروم کر کے ہر شے کے احساس ذات کی گہرائیوں میں گھس جانے والے اندھی سوزش و اضطراب اور دھواں دھواں شام میں روٹھی تمناؤں کی سی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ احمد کے لشکر کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بھاگ کھڑا ہوا جبکہ امیر مودود نے اپنے سالاروں اور لشکر کے ساتھ سرابوں کی پیاس اور خوف و ہراس کے سناٹوں کی طرح کچھ دور تک تعاقب کر کے انہیں مزید موت اور مرگ کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد مودود اپنے لشکر کے ساتھ اس جگہ لوٹا جہاں اس کا پڑاؤ تھا احمد شکست اٹھانے کے بعد اپنی ہر شے وہیں چھوڑ گیا تھا لہٰذا اس کے لشکر کے پڑاؤ پر قبضہ کر لیا گیا۔

اس موقع پر مودود نے یہ خیال نہیں کیا کہ جنگ کے دوران کون مارا گیا، کون گرفتا ہوا۔ سب سے پہلے جنگ میں کام آنے والے اپنے لشکریوں کی تدفین کا اہتمام کیا۔ اس کے بعد زخمیوں کی خوب دیکھ بھال کی گئی۔ اس سارے کام سے نمٹنے کے بعد اس نے اپنے سارے سالاروں کو ایک جگہ جمع کیا۔

جب سارے سالار امیر مودود کے سامنے جمع ہو گئے تب سب سے پہلے مودود نے اپنے سالاروں اور اپنے لشکریوں کو اس شان دار فتح پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد بڑے قیدیوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔

اس ٹکراؤ کے دوران مودود کا چچا سلطان محمد مارا جا چکا تھا۔ بہر حال مورخین کے مطابق جن بڑے سالاروں کو قیدی اور اسیر کی حیثیت سے مودود کے سامنے پیش کیا گیا ان میں توشکین بلخی، علی خویشاوند کا بیٹا ابو علی سلیمان بن یوسف نئے سلطان محمد کا بیٹا احمد اور عبدالرحیم شامل تھے۔

مودود نے کھا جانے والی نگاہوں سے پہلے سب کا جائزہ لیا پھر اپنے قریب بیٹھے علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”علی بن ربیع! باقی لوگوں کا بھی کچھ پتا چلا۔“
اس پر علی بن ربیع نے ایک لمبا سانس لیا پھر کہنے لگا۔

”امیر۔۔۔! بات یہ ہے کہ علی خویشاوند، ناتھ تو لک، رام دیو اور کچھ دوسرے سالار بھاگنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ابو علی خویشاوند آپ کے سامنے ہے، بڑا سازشی ہے۔ سلیمان بن یوسف بھی آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ توشکین بلخی بعد میں ان سازشیوں کے ساتھ شامل ہوا تھا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔“

مودود تو اب ایک طرح سے سلطان ہو چکا تھا کچھ دیر گہری سوچوں میں ڈوبا رہا پھر اس نے علی خویشاوند کے بیٹے ابو علی سلیمان بن یوسف اور نئے سلطان محمد کے سارے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

دو بیٹے بچ گئے تھے اس کے علاوہ چار سالار بھی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

بھاگنے والے سالاروں میں ایک ناتھ دوسرا تو لک تیسرا علی خویشاوند چوتھا رام دیو تھا۔ بچنے والے بیٹوں میں ایک کا نام نامی تھا جو باغی سالاروں کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ وہ علی خویشاوند کا ہی ایک طرح سے دست راست تھا اور دوسرا بچنے والا بیٹا عبدالرحیم تھا جسے مودود نے قتل کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مورخین لکھتے ہیں عبدالرحیم کو قتل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ سلطان مسعود کے عہد اسیری میں ایک اور عبدالرحیم اپنے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ سلطان مسعود کو دیکھنے قید خانے میں گیا۔ عبدالرحمٰن نے سلطان مسعود کو دیکھتے ہی یہ جملہ کسا کہ اب یہ سر تاج شاہی کے قابل نہیں رہا اور پھر مسعود کے سر سے ٹوپی اتار لی عبدالرحیم نے اپنے بھائی کی اس ناشائستہ حرکت پر اسے بہت ڈانٹا اور اس کے ہاتھ سے ٹوپی چھین کر چچا کے سر پر رکھ دی اس وجہ سے جب ان سارے حالات کی خبر مودود کو ہوئی تو اس نے عبدالرحیم کی عزت افزائی کی، اسے اپنے ساتھ رکھا اسے قتل نہیں کیا بلکہ مرنے والے سلطان مسعود کی عزت کرنے کی وجہ سے مودود نے عبدالرحیم کی بھی عزت کی تھی۔

جب باغیوں کا خاتمہ کیا جا چکا تب مورخین لکھتے ہیں کہ جس جگہ یہ جنگ ہوئی تھی وہاں نئے سلطان مودود نے ایک نیا چھوٹا شہر آباد کیا جس کا نام فتح آباد رکھا گیا، ساتھ ہی اس جگہ مورخین کے مطابق سلطان مودود نے ایک شان دار سرائے بھی مسافروں کے لیے تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ سرائے سلطان مودود کی موجودگی ہی میں تیار ہوگئی تھی۔ اس دوران مودود نے اطراف و اکناف میں جو مخبر پھیلا رکھے تھے انہوں نے مختلف علاقوں کی خبریں مودود تک پہنچانا شروع کر دی تھیں۔ ان خبروں کی روشنی میں ایک بار پھر مودود نے اپنے سارے سالاروں کا اجلاس طلب کیا۔ سارے سالار جب اس کے پاس جمع ہو گئے تب مودود انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”یہاں قیام کے دوران ہمیں بہت اچھی خبریں ملی ہیں ان کی روشنی میں اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔

مخبر یہ خبریں لے کر آئے ہیں کہ ہمارے لیے اب ایک نہیں مزید کئی معرکہ آرائیاں تانک جھانک کرنے لگی ہیں۔

پہلی بری خبر یہ ہے کہ میرے مرنے والے چچا کا بیٹا نامی جو بھاگنے میں کامیاب ہو چکا ہے اس نے نا صرف باغی لشکریوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف راجہ جو میرے دادا اور میرے باپ کے دور میں شکستوں پر شکستیں اٹھاتے رہے ہیں وہ بھی ہمارے خلاف تیار ہو گئے ہیں لہٰذا ہندوستان کی سرزمین میں نامی نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔

دوسری بری خبر ہمارے لیے یہ ہے کہ میرا بھائی مجدود جسے میرے باپ نے ہندوستان کے علاقوں کا حاکم مقرر کیا تھا وہ بھی میرے خلاف جنگ کی تیاری کرنے لگا ہے۔ میرے مخبروں نے مجھے بتایا ہے کہ میرے والد محترم مسعود کے مارے جانے کے بعد مجدود نے ملتان کی سکونت ترک کر دی تھی حالانکہ سلطان مسعود نے اسے ملتان کا علاقہ حکمرانی کے لیے دیا تھا اور لاہور میں ایاز کو عامل کے طور پر مقرر کیا تھا لیکن مجدود اب ہمارے خلاف جنگ کی تیاری میں مصروف ہے۔ ملتان سے نکل کر وہ لاہور پہنچ چکا ہے ایاز، میں سمجھتا ہوں اس کے سامنے بے بس اور اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گا اور مخبروں نے مجھے یہ خبر بھی دی ہے کہ مجدود دریائے سندھ سے لے کر تھانیسر اور اردگرد تک کے سارے علاقے پر قبضہ مکمل کر چکا ہے اور اس نے بڑی قوت حاصل کر لی ہے لہٰذا وہ دن بدن ہمارے لیے خطرناک صورت اختیار کرتا چلا جائے گا۔ مخبروں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر جلد مجدود کی سرکوبی کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو مجدود ہمارے لیے بہت بڑی آفت بن کر نمودار ہوگا۔

تیسری بری خبر یہ ہے کہ علی خوشیاوندناتھ تو لک اور رام دیو چاروں بھاگ کر اس مجدود کا رخ کر رہے ہیں اور میں آپ لوگوں پر واضح کر دوں کہ مجدود اگر ہمارے خلاف بغاوت اور سرکشی نہ بھی کرنا چاہے تب بھی یہ چاروں باغی سالار مجدود کو ہمارے خلاف ضرور اکسائیں گے۔ ان ساری مصیبتوں سے نبٹنے کے لیے میں نے ایک منصوبہ بندی کی ہے اس کا اظہار میں آپ لوگوں سے کرتا ہوں اس کے بعد آپ لوگ بھی اپنا مشورہ دیجیے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سلطان مودود پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتا وہ کہہ رہا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں لشکری اس وقت تھکے ہارے ہیں پہلے تو ہم نے ایک لمبا سفر بلخ سے غزنی تک کیا پر غزنی کے یہاں آتے ہی جنگ کی، دشمنوں کو شکست دی لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ فی الحال واپس غزنی کا رخ کیا جائے اس لیے کہ لشکریوں کے پاس مال غنیمت کی صورت میں ملنے والے بہت سے اموال ہیں وہ اپنے گھروں تک پہنچا دیں گے چند دن اپنے گھروں میں آرام بھی کر لیں گے اس کے بعد ہم نئے انداز میں اپنے دشمنوں کے خلاف حرکت میں آئیں گے۔''

سلطان مودود کی اس منصوبہ بندی سے سارے سالاروں نے اتفاق کیا تھا لہٰذا مودود اپنے پورے لشکر کو لے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا تھا۔ سلطان نے غزنی میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ہی قیام کیا ہو گا کہ اسے خبریں ملیں کہ آنے والے سلطان محمد کا بیٹا نامی بری طرح حرکت میں آ چکا ہے اس نے ایک خاصا بڑا لشکر تیار کر لیا ہے وہ بڑی تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ دریائے سندھ کے دائیں کناروں کے ساتھ لشکر کو بڑھاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہے اور بہت سے علاقوں پر قبضہ کرتا چلا جا رہا ہے۔

یہ صورت حال یقیناً سلطان مودود کے لیے حوصلہ شکن تھی۔ ساتھ ہی مخبروں نے یہ بھی اطلاع دی کہ نامی نے ایک خاصا بڑا لشکر جس نے اسے ''مقدمہ الجیش'' کا نام دیا ہے اپنے بڑے لشکر کے آگے رکھا ہے تاکہ لشکر کے لیے رسد کے علاوہ کمک بھی حاصل کرتا چلا جائے۔

اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے سلطان مودود نے بہت جلد ایک فیصلہ کیا اس نے ایک لشکر روانہ کیا اسے ''مقدمہ الجیش'' ہی کا نام دیا اس کا سالار بقول مورخین امیر ابونصر محمد بن امجد کو بنایا اور اسے حکم دیا کہ وہ نامی کے لشکر کے ''مقدمہ الجیش'' سے ٹکرائے اور اس کی پیش قدمی کو روک دے۔ امیر ابونصر محمد بن امجد کے پیچھے ہی پیچھے مودود نے علی بن ربیع اور عبدالرزاق کی کمان داری میں ایک لشکر روانہ کیا اور ان دونوں کے لیے حکم تھا کہ وہ نامی سے ٹکرائیں اور ہر صورت میں نامی کا خاتمہ کر کے دریائے سندھ کے دائیں کنارے کی سرزمینوں کو باغیوں سے بالکل پاک کر دیں اس لیے کہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے ایک طرح سے سلطان مودود کا بھائی مجدود قابض ہو چکا تھا۔

سلطان مودود کا سالار ابونصر جب اپنے مقدمہ الجیش کو لے کر پشاور کے قریب پہنچا تب مخبروں نے اسے اطلاع دی کہ نامی کو اس کی آمد کی خبر ہو چکی تھی لہٰذا اس نے اپنے مقدمہ الجیش کو واپس بلا لیا ہے تاکہ اپنے سارے لشکر کے ساتھ مغرب کی طرف پیش قدمی کرے اور سلطان مودود کی قوت سے ٹکرائے یہ خبر ملنے کے بعد ابونصر نے ایک دانشمندانہ قدم اٹھایا جس وقت اسے یہ خبر ملی وہیں اس نے اپنے لشکر کا پڑاؤ کر لیا تیز رفتار قاصد اس نے اپنے پیچھے آنے والی علی بن ربیع اور عبدالرزاق کی طرف بھجوائے اور جونئی صورت حال پیش آئی تھی اس سے انہیں مطلع کر دیا یہ خبر ملنے کے بعد علی بن ربیع اور عبدالرزاق بھی اپنے لشکر کو لے کر بڑی تیزی اور برق رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے ابونصر سے جا ملے تھے۔

علی بن ربیع اور عبدالرزاق جب دونوں ابونصر

سے جا ملے اور مقدمہ الجیش کو اپنے اندر ضم کر لیا تب انہوں نے مشرق کی طرف پیش قدمی کی دوسری طرف مرنے والے سلطان محمد کا بیٹا نام جس کا نامی تھا وہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ مغرب کا رخ کر رہا تھا اس نے چونکہ ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا تھا لہٰذا اسے یہ غلط فہمی اور گمان ہو چکا تھا کہ وہ فتح مند رہے گا۔ فتح کی صورت میں وہ اپنے باپ کا انتقام لے گا چنانچہ کوہستانی سلسلے کے اندر دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے۔

نامی کے لشکر میں زور شور سے نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے تھے ان کی تعداد کیونکہ زیادہ تھی لہٰذا وہ خوش تھے کہ کامیابی شاید انہی کے قدم چومے گی دوسری طرف علی بن ربیع نے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ آدھا اپنے پاس رکھا آدھا عبدالرزاق کی کمان داری میں دیا تھا اور لشکر کا وہ حصہ جو ابونصر کی کمانداری میں مقدمہ الجیش کی حیثیت سے علی بن ربیع سے پہلے غزنی سے کوچ کیا تھا، اسے علی بن ربیع نے اپنے لشکر کے پڑاؤ کی حفاظت پر مقرر کر دیا تھا اس طرح علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں جنگ کے لیے اپنی تیاریوں کو آخری شکل دے چکے تھے۔

چنانچہ مرنے والے سلطان محمد کا بیٹا نامی اپنے جرار لشکر کو دشت و بیابان میں کرن کرن پر اندھیروں کی مہر لگاتے عناصر کو چہ و بازار میں صدیوں کی تیرگی کا غبار پھیلاتے اوندھے اندھیاؤ کے فتور کی طرح اپنے لشکر کو حرکت میں لایا۔ اسی کے بعد وہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے لشکر پر آدمیت کی رگ رگ میں خوف، سینوں میں آگ، دلوں میں زہر بھر دینے والے قاتلوں کے قبیلے سیاہ پوش فضاؤں میں کرب خیزی سے ابھرتے نوحوں، دلوں کے نہاں خانوں میں بے ربط اور ہولناک وسوسے بھر دینے والی فراق کی شدت کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے سب سے پہلے علی بن ربیع نے نشاط و انبساط سے کہیں زیادہ طربناک موسیقی کے سروں سے زیادہ غنا ریز فہم ادراک کی بساط وجدانی موسیقی جذبات کی شگفتگی احساسات کی مہک اور کشف اسرار و رموز سے کہیں زیادہ پرکشش انداز میں تکبیریں بلند کیں۔ اس کی تکبیروں کے جواب میں عبدالرزاق نے بھی ایسا ہی کیا تھا پھر دونوں ایک ساتھ اپنے لشکر کو حرکت میں لائے۔ اس کے بعد وہ نامی کے لشکر پر خاموشی کے ساگر میں احساسات کے سفینوں کو سوختہ فکر کی راکھ میں بدل دینے والے عارف کے دل و جان کی تڑپ دائرہ در، دائرہ سلگتے چہروں کا کرب قلب کی داستانوں کے ہمزاد نفرت کے کھولتے زہر کی طرح حملہ آور ہو گئے تھے۔

دونوں لشکر جب ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرا گئے تب ان کے اندر وجدان و شعور فکر کی حدت حسن و جمال کے رنگ محبت کے نقش و نگار دلوں کی توانائی روحوں کی تونگری اسرار ہستی کے عرفان سب عمل کی موجزن قوت کے سامنے فنا پذیری اور خطا کاری کے سائے تلے لہولہو ہونا شروع ہو گئے تھے۔

چاروں طرف سکوت کو درہم برہم کرتا موت کا شور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

نامی کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن وہ ابن ربیع اور عبدالرزاق کی جنگی ہنرمندی اور فنون حرب کے تجربے کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا۔ بڑی تیزی سے اس کے لشکر کی حالت ٹمٹماتے لرزاں چراغوں، غیر آباد بستیوں، درد بھری یادوں، تنہائی کے کرب اور قضا کے گمبھیر سایوں سے بھی کہیں زیادہ بری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اسے احساس ہو گیا کہ اگر جنگ اسی طرح جاری رہی اور اس کے لشکر کی تعداد بڑی تیزی سے کم ہوتی گئی تو وہ اپنے برے انجام کو پہنچے گا۔

دوسری طرف علی بن ربیع اور عبدالرزاق نے بھی بھانپ لیا تھا کہ نامی اب بھاگنے اور پسپا ہونے کے چکر میں ہے لہٰذا انہوں نے تین اطراف سے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا اور جونہی نامی شکست اٹھا کر

بھاگا انہوں نے ایسا تعاقب کیا کہ میدان جنگ میں ہی نامی موت کے گھاٹ اتر گیا اور اس کے بہت کم ساتھیوں کو اپنی جانیں بچا کر بھاگنے کا موقع ملا اس طرح نامی کا خاتمہ ہوا۔

☆☆☆

عبدالرزاق ایک روز اپنے خیمے میں داخل ہوا اس وقت اس کی بیوی معارہ اکیلی بیٹھی ہوئی تھی عبدالرزاق آگے بڑھ کر معارہ کے سامنے بیٹھ گیا پھر کسی قدر سنجیدگی میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''معارہ! حالات کچھ سنگین ہونے لگے ہیں اس لیے کہ اب ہمیں مشرق کی طرف پیش قدمی کرنا ہوگی یہ فیصلہ علی بن ربیع نے ان دو قاصدوں کے آنے کی وجہ سے کیا ہے جن میں سے ایک قاصد سلطان کی طرف سے اور دوسرا قاصد لاہور سے امیر ایاز کی طرف سے آیا ہے۔''

عبدالرزاق کے یہ الفاظ سن کر معارہ چونکی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ عبدالرزاق اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جو قاصد سلطان کی طرف سے آئے ہیں انہوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ چندروز تک ایک اور لشکر ہماری مدد کے لیے پہنچ جائے گا جبکہ سلطان نے یہ بھی پیغام بھیجا ہے کہ لشکر کا وہ حصہ جو ہم سے آگے مقدمہ الجیش کی صورت میں ابونصر کی سرکردگی میں بھیجا گیا تھا اسے واپس کر دیا جائے چنانچہ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ ابونصر سلطان کے حکم کے مطابق جس لشکر کو لے کر آیا تھا اس کے ساتھ کل یہاں سے کوچ کر جائے گا اور اس لشکر کے ساتھ راحیل، روبیل اور روبیل کی بیوی حبہ بھی چلے جائیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد عبدالرزاق رکا ایک گہری نگاہ معارہ پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

''معارہ! تم سے متعلق میں نے ایک فیصلہ تم سے صلاح مشورہ کیے بغیر کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہماری بہن راحیل کے ہاں بچے کی پیدائش کی امید ہے۔ اس بنا پر علی بن ربیع اسے واپس غزنی بھیجنے کا فیصلہ کر چکا ہے اس فیصلے سے راحیل نے بھی اتفاق کیا ہے لہٰذا راحیل، روبیل اور حبہ واپس غزنی جائیں گے جبکہ میں نے علی بن ربیع سے یہ کہہ دیا ہے کہ چونکہ اس کے ہاں بچے کی امید ہے لہٰذا معارہ بھی راحیل کے ساتھ جائے گی تاکہ غزنی میں معارہ، راحیل کی دیکھ بھال کر سکے اس لیے کہ رابیل کی بیوی حبہ خود ابھی ناتجربہ کار اور نوجوان ہے وہ راحیل کی دیکھ بھال نہیں کر سکے گی میرے خیال میں اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد عبدالرزاق جب خاموش ہوا تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معارہ کسی قدر مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''اگر آپ یہ فیصلہ نہ بھی کرتے تب بھی جس وقت مجھے یہ خبر ہوئی کہ راحیل، روبیل اور حبہ واپس جا رہے ہیں تب میں خود آپ سے کہتی کہ مجھے بھی راحیل کے ساتھ بھیج دیا جائے جہاں آپ علی ربیع کو اپنا چھوٹا بھائی خیال کرتے ہیں وہاں میں بھی راحیل کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہوں لہٰذا میں اس کے ساتھ جاؤں گی اور اپنی ماں کے ساتھ اس کی خوب دیکھ بھال کروں گی۔''

معارہ کا یہ فیصلہ سن کر عبدالرزاق خوش ہو گیا تھا دوبارہ بولا اور کہنے لگا۔

''دوسرا معاملہ یہ ہوا ہے کہ آج ہی جو قاصد امیر ایاز کی طرف سے لاہور سے آئے ہیں انہوں نے علی بن ربیع کے نام یہ پیغام بھیجا ہے کہ سلطان مسعود نے اپنے بیٹے امیر مجدود کو ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا لیکن سلطان مسعود کے مارے جانے کے بعد جب سلطان مودود حکمران بنا تب اس مجدود نے پر پرزے نکالے اس نے اپنے لشکر کے ساتھ لاہور میں آ کر قیام کر لیا ان دنوں وہ ایک لشکر لے کر تھانیسر کی طرف گیا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ مزید کچھ علاقے فتح کر کے اپنی حکومت کو وسیع کرتا چلا جائے چنانچہ امیر ایاز نے علی بن ربیع کے نام یہ بھی پیغام بھیجا ہے کہ وہ مجدود کے سامنے بالکل بے بس اور کمزور

ہے۔ لاہور کی حفاظت کے لیے اس کے پاس جو لشکر ہے وہ چھوٹا ہے اس لیے کہ اس سے پہلے لاہور کو کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اب جبکہ مجدود اپنے بڑے لشکر کے ساتھ لاہور پہنچ چکا ہے تو امیر ایاز اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا لہٰذا امیر ایاز نے علی بن ربیع کے نام یہ پیغام بھیجا ہے کہ جو لشکر اس کے پاس ہے اس کے ساتھ وہ پیش قدمی کرے اور لاہور میں قیام کرے، مجدود سے ٹکرائے اسے واپس ملتان جانے پر مجبور کر دے۔ اس بنا پر لشکر اس وقت آگے بڑھے گا جس وقت وہ لشکر پہنچ جائے گا جو سلطان مودود نے ہماری مدد کے لیے غزنی سے بھیجا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد عبدالرزاق جب رکا تب معارہ بولی اور کہنے لگی۔

''اگر میں نے کل کوچ کرنے والے لشکر کے ساتھ یہاں سے کوچ کرنا ہے تو پھر میں اپنے سامان کی تیاری کر لوں۔''

اس پر عبدالرزاق اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے مل کر جو سامان معارہ نے لے جانا تھا اسے باندھا دوسری طرف راحیل اور روبیل بھی اپنی تیاری مکمل کر چکے تھے لہٰذا اگلے روز ابونصر لشکر کے اس حصے کو لے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا جسے وہ اپنے ساتھ غزنی سے لایا تھا راحیل، روبیل، معارہ اور حبہ چاروں اس لشکر میں شامل تھے

☆☆☆

سلطان مسعود کا بیٹا مجدود اپنے لشکر کے ساتھ تھانیسر شہر سے باہر خیمہ زن تھا کہ ایک روز اس کے محافظ نے اسے علی خویشاوند، رام دیو، اور ناتھ کے آنے کی اطلاع دی۔ ان کی آمد کا سن کر مجدود چونکا تھا۔ خوشی کا بھی اظہار کیا تھا اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ وہ چاروں مرنے والے سلطان مسعود غزنوی کے بہترین سالاروں میں شمار کیے جاتے تھے لہٰذا یہ اطلاع دینے والے لشکری کو مخاطب کر کے مجدود کہنے لگا۔

وہ اس وقت اپنے خیمے سے باہر آیا۔ بڑے پرجوش اور پرتپاک انداز میں ان چاروں سے ملا پھر ان چاروں کو اپنے خیمے میں لے گیا۔ مجدود کے سامنے جب وہ چاروں نشستوں پر بیٹھ گئے تب گفتگو کا آغاز مجدود نے کیا۔ پھر باری باری ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں سمجھتا ہوں تمہارا آنا کسی وجہ اور علت کے بغیر نہیں ہے کہو کیا معاملہ ہے؟''

اس پر تو لک ناتھ رام دیو، علی خویشاوند کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ علی خویشاوند نے اپنا گلا صاف کیا اس کے بعد دھیمی سی آواز میں کہنے لگا۔

''امیر مجدود! ہم آپ کے لیے اچھی خبر لے کر آئے ہیں ہم آپ کے دشمن نہیں دوست ہیں۔ آپ جانتے ہیں نئے سلطان مودود کی طرف سے ایک لشکر مشرق کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے اور لشکر کی کمان داری علی بن ربیع اور عبدالرزاق کر رہے ہیں آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دیں کہ آپ کا چچازاد بھائی نامی جس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا تھا اس کا ٹکراؤ علی بن ربیع اور عبدالرزاق سے ہوا جس کے نتیجے میں نامی کو بدترین شکست ہوئی اور وہ علی بن ربیع کے ہاتھوں مارا گیا۔

اب جو خبریں ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق علی بن ربیع لاہور کی طرف کوچ کرے گا اور ہمارا اندازہ ہے کہ وہ آپ سے ٹکرائے گا اس لیے کہ مرنے والے سلطان مسعود نے آپ کو ملتان کا حاکم مقرر کیا تھا آپ ملتان چھوڑ کر لاہور آ گئے ہیں لہٰذا نیا سلطان مودود یقیناً آپ کے خلاف کارروائی کرے گا اور یہ کارروائی علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے ذریعے ہو گی۔

ہم چاروں آپ کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے آئے ہیں اگر آپ کو ہماری ضرورت ہے تو ہم آپ کے لشکر میں قیام کرتے ہیں نہیں تو ہم آگے دہلی کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ دہلی کے راجہ سے بھی ہمارا رابطہ ہے، ہم نے اپنے کچھ قاصد پہلے ہی دہلی کے راجہ کی طرف روانہ کر دیے ہیں اور جو کچھ ہم

اسے کہنا چاہ رہے ہیں امید ہے کہ وہ ہماری بات مان جائے گا۔ اب آپ بولیں آپ کیا کہتے ہیں؟ جو کچھ ہم نے دہلی کے راجہ کو پیغام کی صورت میں پہنچایا ہے اس کی تفصیل ہم آپ کو بعد میں بتائیں گے۔''

علی خویشاوند کی اس گفتگو سے مجدود نے خوشی کا اظہار کیا پھر کہنے لگا۔

''میں تم چاروں کو اپنے لشکر میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم جیسے چاروں سالاروں کے میرے ساتھ رہنے سے میری عسکری طاقت اور قوت میں اضافہ ہوگا۔'' پھر مجدود نے آواز دے کر کسی کو بلایا۔ اس پر ایک شخص خیمے کے دروازے پر نمودار ہوا۔

☆☆☆

''میں آپ پر یہ بھی انکشاف کر دوں کہ غزنی کے لشکر میں بہت عرصہ پہلے سے ہندوؤں کا ایک بہت بڑا لشکر ہی نہیں بلکہ بہت سے اعلا پائے کے سالار بھی شامل تھے۔

اب جن سالاروں نے غزنی کی حکومت کے خلاف بغاوت کی ہے ان میں سے تین ہندو اور ایک مسلمان ہے۔ ہندو سالاروں کے نام ناتھ، تولک، رام دیو ہے اور مسلمان سالار کا نام علی خویشاوند ہے ہم جو دو قاصد بن کر آئے ہیں ہم بھی ہندو ہیں دراصل ان سالاروں نے پہلے سلطان مودود کے چچا زاد کا ساتھ دیا جس کا نام نامی تھا لیکن مودود کے ایک سالار کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی جس کی بنا پر تینوں ہندو سالار اور مسلمان سالار مرنے والے سلطان مسعود کے بیٹے مجدود کی طرف چلے گئے ہیں جو پہلے ملتان کا حاکم تھا اب لاہور پر بھی اس نے قبضہ کر لیا ہے اور ان دنوں تھانیسر کے مقام پر اپنے لشکر کے ساتھ قیام کیے ہوئے ہے۔

ہمیں ہمارے ہندو سالاروں نے آپ کے نام یہ پیغام دیا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے دور میں نگر کوٹ کا شہر اور قلعہ فتح کیا گیا تھا نگر کوٹ ہندوؤں میں بڑا مقدس شہر خیال کیا جاتا تھا لیکن اب اس کی پہلی جیسی حیثیت نہیں ہے اس لیے کہ وہاں اب مسلمانوں کا قبضہ ہے اور غزنوی حکمرانوں کی طرف سے وہاں حاکم مقرر ہے جو مسلمان ہے ہمارے تینوں ہندو سالار بشمول مسلمان سالار علی خویشاوند یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ ایک لشکر لے کر نگر کوٹ کا رخ کریں تو اس میں آپ کو بڑے فوائد حاصل ہوں گے اور مسلمانوں کی پیش قدمی مشرق کی طرف رک جائے گی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد دم لینے کے لیے وہ قاصد جب رکا تب دہلی کے راجہ کا رنگ پیلا ہو گیا کہنے لگا۔

''کیا ہماری طرف مسلمانوں کا کوئی لشکر پیش قدمی بھی کر رہا ہے؟''

اس پر قاصد بولا اور کہنے لگا۔

''میں نے جو اختصار کے ساتھ آپ کو حالات سنائے ہیں ان میں، میں نے واضح کیا ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے موجودہ سلطان کے اقتدار کے خلاف کام کیا تھا لیکن ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا موجودہ سلطان کا ایک سالار ہے، نام اس کا علی بن ربیع ہے شاید اس کے مقدر میں شکست نہیں لکھی ہوئی جس سمت کا بھی رخ کرتا ہے کامیاب رہتا ہے اور دشمن کے لشکریوں کی لاشیں اپنے پیچھے بساط کی طرح بچھاتا چلا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے سالار علی خویشاوند کا بیٹا اور اس کے کچھ ساتھی جو گزشتہ جنگ میں مارے جا چکے ہیں وہ اسی سالار علی بن ربیع کی وجہ سے مسلمانوں کے سلطان کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں اس لیے کہ موجودہ سلطان اور اس کا باپ اس علی بن ربیع اور اس کے ایک ساتھی عبدالرزاق کو بڑی اہمیت دیتے تھے حالانکہ یہ علی بن ربیع اور اس کا ساتھی غزنی کے رہنے والے نہیں ہیں ان دونوں کا تعلق سمرقند سے ہے۔''

سمرقند کے حاکم نے ان کے ماں باپ کو قتل کر دیا یہ وہاں سے ہجرت کر کے غزنی آئے۔ غزنی میں آ کر وہ اپنی کارکردگی اور جرات مندی، دلیری اور

بہادری کی وجہ سے نوعمر ہونے کے باوجود صف اول کا سالار بن گیا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ غزنی کے سلطان نے اسے اپنے لشکریوں کا سالار اعلا بنا دیا اب یہی سالار اعلا جس کا نام علی بن ربیع ہے اپنے ساتھی عبدالرزاق کے ساتھ ایک لشکر لے کر مشرق کا رخ کر رہا ہے۔

وہ ایک لشکر کو جس میں ہمارے تین ہندو اور مسلمان سالار تھے بدترین شکست دے چکا ہے اب تک جو خبریں ہم تک پہنچیں وہ یہ ہیں کہ وہ اب مشرق کی طرف پیش قدمی کرے گا پہلے وہ ملتان کے حاکم مجدود اور اس کے لشکر سے ٹکرائے گا جو اس وقت تھانیسر میں قیام کیے ہوئے ہے اور میں آپ پر یہ بھی واضح کر دوں کہ اب جو مجدود تھانیسر میں قیام کیے ہوئے ہے بہت جلد لاہور کی طرف روانہ ہو جائے گا وہ نہیں چاہتا کہ وہ تھانیسر میں پڑا رہے اور علی بن ربیع پیش قدمی کرتے ہوئے لاہور فتح کر کے اس پر غالب آ جائے اس لیے کہ لاہور پر ایک غزنویوں کا پرانا نمک خوار حاکم ہے نام جس کا ایاز ہے اگر مجدود لاہور نہ پہنچا تو ایاز یقیناً شہر علی بن ربیع کے حوالے کر دے گا چنانچہ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد یہ خوں خوار اور قتل و غارت گری کا شوقین مسلمانوں کا سالار اعلا بن ربیع لاہور سے نکل کر دہلی کا رخ کرے گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دہلی کی وہ اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دے گا اس لیے کہ شاید قدرت نے اس کے مقدر میں شکست نہیں لکھی۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ قاصد رکا، دم لیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری دوبارہ وہ کہتا چلا گیا تھا۔

''چنانچہ اپنے ہندو سالاروں کی طرف سے ہم دونوں آپ کے لیے یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ آپ ایک لشکر لے کر نگر کوٹ کا رخ کریں مسلمانوں کے سالار کے ارادے اس وقت یہی ہیں کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ لاہور کی طرف بڑھے گا چنانچہ اسے جب یہ خبر ہو گی کہ دہلی کے راجہ نے نگر کوٹ پر حملہ آور ہونے کے لیے پیش قدمی کی ہے تو یقیناً وہ دو طرح کے ردعمل کا اظہار کرے گا۔

پہلا یہ کہ وہ ششش و پنج میں پڑ جائے گا کہ کیا کرے زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے ایک حصہ اپنے پاس رکھے دوسرا اپنے ساتھی کے حوالے کر کے خود نگر کوٹ کا رخ کرے اور اپنے ساتھی کو لشکر دے کر لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے کہے گا ایسی صورت میں کیونکہ ان کا لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہوگا لہٰذا نہ وہ لاہور فتح کر سکیں گے نہ نگر کوٹ میں کامیابی حاصل کر سکیں گے اس طرح اچانک یہ اٹھنے والا فتنہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔

اور اگر وہ اپنی ساری طاقت اور قوت لاہور کی طرف مبذول کرتا ہے تو پھر آپ بڑی آسانی کے ساتھ نگر کوٹ کو فتح کر سکتے ہیں وہ آپ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوگا۔

اور اگر وہ لاہور کو نظر انداز کرتا ہے اور آپ کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تاکہ نگر کوٹ کی حفاظت کرے جب وہ ایسا کرے گا تب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مجدود جس کے لشکر میں اس وقت ہمارے تین ہندو ساتھی اور ایک مسلمان سالار ہے وہ مجدود کے ساتھ اس مسلمان سالار کے پیچھے لگ جائیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کا وہ سالار جس کی میں نے تھوڑی دیر پہلے تعریف کی ہے دو اطراف سے دو لشکروں میں گھر جائے گا ایک طرف آپ کا لشکر ہوگا اور دوسری طرف اس کے پیچھے پیچھے مجدود ہوگا۔ اس طرح یا تو وہ مقابلہ ہی نہیں کرے گا اور اگر مقابلہ کرے گا تو میرے خیال میں زندگی میں پہلی بار اس کے مقدر میں شکست کے حروف لکھے جائیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ قاصد خاموش ہو گیا دہلی کا راجہ کچھ دیر تک خاموش رہ کر سوچتا رہا پھر خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ بڑی مشکل مہم ہو گی اس میں ہمیں اپنی کامیابی کی امید بالکل ہی نہیں ہے اگر ہم اپنے لشکر کے ساتھ نگر کوٹ کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور

نگر کوٹ میں اس وقت مسلمانوں کا جو لشکر ہے وہ باہر نکلتا ہے اور دوسری سمت سے مسلمانوں کا غزنی سے آنے والا سالار علی بن ربیع نگر کوٹ کی طرف بڑھتا ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ دونوں لشکر ہمیں پیس کر رکھ دیں گے اور مجھے یہ بھی خدشہ ہے کہ ایک بار ہمیں شکست ہوگئی تو ہم دہلی کے راج سے بھی محروم ہو کر رہ جائیں گے۔"

اس موقع پر دہلی کے راجہ کے براہمن مشیر ماہا دیو نے راجہ کو مخصوص اشارہ کیا اس پر وہ دونوں قاصدوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"فی الحال دہلی میں قیام کرو مجھے اپنے مشیروں اپنے سینا پتی سے مشورہ کرنے دو، اس کے بعد میں تمہیں جواب دوں گا پھر تم لوگ واپس تھانیسر کی طرف چلے جانا دونوں قاصد اس جواب سے مطمئن ہو گئے تھے پھر دہلی کے راجہ کے کہنے پر اس کا ایک محافظ ان دونوں قاصدوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

قاصدوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد دہلی کا راجہ بڑے غور سے اپنے براہمن مشیر ماہا دیو کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم نے دوران گفتگو مجھے مخصوص اشارہ کیا تھا جس کی بنا پر میں نے دونوں قاصدوں کو بھیج دیا ہے اب بولو تم کیا کہنا چاہتے تھے۔"

اس پر براہمن مشیر بولا اور کہنے لگا۔

"میں آپ کو ایک ایسی ترکیب بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نگر کوٹ پر حملہ آور ہوں تو ہماری فتح اور کامیابی یقینی ہو جائے گی۔"

براہمن کے ان الفاظ پر دہلی کا راجہ ہی نہیں اس کی رانی دھرم دیوی راجکماری پوار دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے تھے یہاں تک کہ راجہ کے کہنے پر براہمن مشیر بولا اور کہنے لگا۔

"آپ جانتے ہیں نگر کوٹ شروع سے ہی ایک مقدس اور ہندوؤں کے لیے بڑا متبرک شہر رہا ہے یہ الگ بات ہے طاقت اور قوت کے بل بوتے پر محمود غزنوی نے اسے فتح کر لیا اور اس میں جو بت تھا جس کی ہندوؤں کے ہاں بڑی عزت بڑا وقار اور بڑی عظمت تھی اسے وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اب مذہبی جوش و جذبے ہی کو ابھارتے ہوئے ہم بڑی آسانی کے ساتھ نگر کوٹ کو فتح کر سکتے ہیں۔"

اس پر راجہ کچھ دیر تک غور سے براہمن کی طرف دیکھتا رہا پھر سوچوں میں ڈوبتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ کیسے؟"

جواب میں براہمن بولا اور کہنے لگا۔

"اس طرح کہ ایک دو روز کا وقفہ ڈال کر آپ ایک روز صبح کے وقت اپنے تمام امیروں وزیروں مشیروں کو جمع کر کے ان سے کہیں۔

کل خواب میں نگر کوٹ کے بت نے مجھے ایک ہدایت دی ہے میں چاہتا ہوں وہ میں تمہیں بھی بتا دوں۔

جمع ہونے والے سارے افراد کو آپ یہ کہیں کہ ہمارے معبود نے یہ فرمایا ہے کہ اب تک تو میں غزنی میں رہتا تھا وہاں رہنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو تباہ و برباد کرتا رہوں اور غزنوی سلطنت کو کمزور کر دوں اب میں اپنا مقصد پورا کر چکا ہوں اب میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے مرکز میں واپس آ جاؤں اور اپنے پرستاروں کو میں پرستاران خدا پر غالب کر دوں میرے بندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس سمجھیں اور مسلمانوں کے مقابلے میں جان کی بازی لگا دیں میری مدد پر بھروسہ کریں اور وہاں سے مسلمانوں کو نکال باہر کریں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد براہمن رکا دوبارہ وہ راجہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"اس کے علاوہ آپ یہ کام کریں کہ اپنی سلطنت کے بہترین اور قابل اعتبار سنگ تراشوں کو بلائیں اور ان میں سے اس سنگ تراش کو ان کا سربراہ بنائیں جس نے نگر کوٹ کے اس بت کو دیکھا ہو چنانچہ انہیں آپ حکم دیں کہ ایک ایسا بت بنائیں جو ہو بہو نگر کوٹ کے بت سے ملتا ہو چنانچہ جب وہ

بت بن جائے گا تو آپ اپنے لشکر کے ساتھ نگر کوٹ کا رخ کریں وہ بت ہمارے ساتھ ہوگا پھر جس رات ہم نگر کوٹ کے باہر قیام کریں اسی رات بڑی راز داری کے ساتھ بت کو ایک باغ میں رکھ دیا جائے گا ایسی جگہ نصب کیا جائے جہاں ہر آنے جانے والے کی نظر اس پر پڑتی رہے چنانچہ نگر کوٹ کے لوگ ہی نہیں وہ دوسرے لوگ جن کو یہ خبر ہوگی جب وہ نگر کوٹ پہنچیں گے اور باغ کے اندر اس بت کو دیکھیں گے تو وہ حیرت زدہ ہوں گے کہ بت کہاں سے آ گیا اس بنا پر ان کا یہ عقیدہ پختہ ہو جائے گا کہ آپ نے جو خواب دیکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے اور یہ کہ نگر کوٹ کا بت غزنی میں مسلمانوں کی تباہی کے لیے قیام کیے رہا اب چونکہ مسلمانوں کے اندر افراتفری اس نے برپا کر دی ہے لہذا بت واپس نگر کوٹ آ گیا ہے۔ یہ صورت حال جب لوگ جانیں گے تو یاد رکھیے گا آس پاس کے علاوہ دور دور سے لوگ آپ کے لشکر میں شامل ہوں گے اور نگر کوٹ کی فتح یقینی ہو جائے گی۔"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ براہمن خاموش ہوا دم لیا۔ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چونک اٹھا اس لیے کہ راج کماری پوار جواب تک بالکل خاموش تھی اور غصے میں برابر براہمن کو گھورے جا رہی تھی ایک دم بولی اور کہنے لگی۔

"آپ جیسے براہمن ہی ہیں جو دین دھرم کا ستیاناس کر کے رکھ دیتے ہیں آپ جو بت تراشنے کا مشورہ میرے پتا جی کو دے رہے ہیں تو اس بت کو جب نگر کوٹ میں رکھا جائے گا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا کر کے آپ دھرم کی خدمت کر رہے ہیں؟ ایک ایسا بت جسے آپ خود ہی تراشیں گے اور اس کی طرف لوگوں کو مائل کریں گے کہ وہ آئیں اور اس کی پوجا پاٹ کریں آپ جیسے براہمنوں ہی کی وجہ سے دوسرے مذاہب کے لوگ ہندومت سے نفرت کرتے ہیں اور اس کے اندر اتنے عیب نکالتے ہیں جس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد لمحہ بھر کے لیے راج کماری پوار جب رکی تو دہلی کا راجہ مسکراتے ہوئے اپنے براہمن مشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیچ میں بولنا نہیں، سنتے جاؤ میری راج کماری کیا کہتی ہے اس لیے کہ اس نے مسلمانوں کے مذہب کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے اور اب بھی یہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ جاری رکھے ہوئے ہے۔"

راجہ جب خاموش ہوا تب راج کماری پوار پھر بولی اور کہنے لگی۔

"ہم فخر سے کہتے ہیں کہ ہم آریہ ہیں جبکہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ آریوں کا اصل وطن کیا تھا۔ کچھ کہتے ہیں گنگا تھا، کچھ کہتے ہیں وسط ایشیا ان کا اصل وطن تھا، کچھ کہتے ہیں روس کا مشرقی حصہ تھا کچھ کہتے ہیں کہ وہ باہر سے نہیں آئے یہیں کے رہنے والے تھے، کچھ کہتے ہیں نہیں ایسا نہیں ہے وہ تبت اور کشمیر سے آئے اور پھر سارے ہندوستان میں پھیل گئے اور کچھ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے آریوں سے متعلق بڑی تحقیق کی ہے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کا زمانہ آمد یقین سے نہیں کہا جا سکتا غالباً ان کا سب سے پہلے جتھا سترہ سو قبل مسیح میں ہندوستان آیا اس کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے گروہ ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

ہم فخر سے کہتے ہیں کہ ہم ہندو ہیں ہندو کے معنی ہیں "چور اور غلام" گویا ہم خود اپنی زبان سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم چور اور غلام ہیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد راج کماری پوار رکی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"ہم میں سے کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا کہ جب ہم اپنے آپ کو آریہ سمجھتے ہیں تو یہ نہیں جانتے کہ آریوں کا مذہب کیا تھا؟ میں نے اب تک جو مطالعہ کیا ہے اس کے مطابق ہماری مذہبی کتابوں ویدوں کے ابتدائی زمانے میں آریہ قوم توحید پر قائم تھی۔ ایک ہی خدا کی عبادت کرتی تھی۔ مشہور مورخ البیرونی جو ہندوستان میں رہ کر گیا وہ اپنی کتابوں میں

لکھتا ہے خدا کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ واحد ہے غیر فانی ہے نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ کوئی انجام، وہ مختار مطلق ہے، قادر مطلق ہے، حکیم مطلق ہے۔ وہ بے عیب لاشریک ہے۔ اپنی ذات، حکمرانی اور سلطانی میں لاثانی ہے۔ وہ نہ کسی سے مشابہہ ہے نہ کوئی اس کے مشابہہ ہے۔ آریوں کی یہ بدبختی ہے کہ جب وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں پہلے سے بحر روم سے آنے والی قوم دراوڑ آباد تھی اور آریہ ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد اپنی بدترین بدقسمتی کا شکار ہوئے۔ وہ وحدانیت پر مبنی اپنے دھرم کو بھول گئے۔ دراوڑوں کی تہذیب اور ان کے خیالات میں ایسے گم ہوئے کہ اپنی اصلیت کو بھول گئے۔ آج ہم جو وشنو اور ایسے ہی دوسرے دیوتا کی عبادت کرتے ہیں تو یہ دیوی دیوتا ہمارے تو نہیں ہیں یہ تو دراوڑوں کے تھے۔ اس کے علاوہ دراوڑ درختوں اور جانوروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ اسی کو ہم نے بھی اپنا لیا ہے۔ وہ بیل، ہاتھی، چیتا اور سانپ وغیرہ کی بھی پرستش کرتے تھے اور ہم نے بھی ان کو اپنا کر ان کے مجسموں تک کی پرستش شروع کر دی۔ اس میں نہ دراوڑوں کا تصور ہے نہ قدیم آریوں کا اس میں تصور سارا موجودہ دور سے پہلے کے براہمنوں کا ہے جنہوں نے آریوں کے مذہب کو جو وحدانیت پر قائم تھا اپنے مقاصد اور اپنے حیوانی جذبوں کی تسکین کے لیے اس کے اندر تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں سب جانتے ہیں کہ جب آریہ قوم ہندوستان میں داخل ہوئی تو اس کو بت پرست قوم کی ثقافت سے پالا پڑا تو آہستہ آہستہ آریہ قوم میں بھی بت پرست اور مظاہر پرستی کا رواج عام ہو گیا۔ ہندوؤں میں بوتری مورتی کا تصور ہے یعنی برما، وشو، ایشو ان میں ایشو اور وشنو دراوڑوں کے دیوتا ہیں اور آہستہ آہستہ یہ دونوں دیوتا ہندو دھرم میں خاصی اہمیت حاصل کر گئے اس طرح اور بھی بے شمار غیر آریائی رسوم ہندوؤں کے دھرم کا جزو بن کر رہ گئیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد راج کماری پوار رکی پھر پہلے کی نسبت زیادہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"پہلے آریوں کا یہ خیال تھا کہ پرمیشور جسے مسلمان اللہ کہتے ہیں وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں وہ یکتا ہے آریہ بھی اس پر ایمان رکھتے تھے لیکن بعد میں آپ جیسے براہمنوں نے ایسی تبدیلی کی کہ دھرم کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ پرمیشور یعنی اللہ ہی ازلی ابدی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دو اور چیزیں بھی ازلی اور ابدی ہیں یعنی مادہ اور روح۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس نے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں ہندو دھرم کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ اگر آریوں کے اس عقیدے پر کھڑے ہو کر کہ خدا واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہندو دھرم کی موجودہ حالت کا جائزہ لیں تو اس کے اندر پانچ بڑے نقص دکھائی دیتے ہیں جن کا میں اب تک مطالعہ کر چکی ہوں۔

پہلا نقص یہ کہ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ مادہ اور روح بھی خدا کی طرح ازلی اور ابدی ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کا علم بھی ناقص ہے کیونکہ اگر اللہ جسے خدا اور پرمیشور بھی کہتے ہیں مادہ اور روح کے متعلق کامل علم رکھتا تو وہ ضرور ان کو بنا بھی سکتا اور ہم اس بات کا قیاس آسانی سے انسان کی حالت سے کر سکتے ہیں کہ جس چیز کا کامل علم انسان کو ہو جائے وہ چیز محدود ہو تو انسان بنا بھی سکتا ہے جو چیز انسان بنا نہیں سکتا تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا علم اس کے متعلق ناقص ہے بس مادہ اور روح کو غیر مخلوق ماننے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ مادہ اور روح کے متعلق اللہ کا علم ناقص ہے۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ اس عقیدہ کی روح سے پرمیشور یعنی اللہ مادہ اور روح کا حقیقی مالک نہیں کہلا سکتا کیونکہ حقیقی ملکیت تو یہی ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہوں۔

تیسرا نقص یہ اٹھتا ہے کہ خدا کی ایک صفت سب مذاہب میں صمدیت ہے یعنی وہ کسی کا محتاج

نہیں سب اسی کے محتاج ہیں لیکن اگر ہم ہندو دھرم کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیں تو اس عقیدے کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ روح اور مادہ کا محتاج ہے۔

چوتھا نقص یہ ہے کہ روح اور مادہ کو ازلی کر سکتا ابدی ماننے سے پرمیشور اور اللہ کی صفت خالقیت کو ایک عرصہ کے لیے بے کار معطل ماننا پڑتا ہے کیونکہ جب تک روح اور مادہ اپنی اصلی حالت میں ہیں اس وقت تک پرمیشور اور اللہ کی صفت خالقیت کا قطعاً ظہور نہیں ہو سکتا۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ روح اور مادہ کو ازلی اور ابدی ماننے سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں نقص آتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ عقیدہ باطل ہے۔

پانچواں نقص ہمارے دھرم میں یہ ہے کہ ہماری اپنی کتب میں دھرم کی کتابیں خصوصیت کے ساتھ یہ کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سرب اور شکتی مان ہے یعنی کہ قادر مطلق ہے بس اگر اللہ تعالیٰ ارواح اور مادہ کا خالق نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں خود ازلی اور ابدی ہیں تو پھر وہ ہمارے پرانے عقیدے یعنی سرب اور شکتی مان کے مطابق قادر مطلق بھی نہیں ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد راج کماری پوار جب خاموش ہوئی تو راجہ نے اسے ڈانٹ دیا اور اٹھ کر وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا۔ اس پر راج کماری پوار بل کھاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی راج محل کے اس کمرے سے نکل گئی تھی اس کے جانے کے بعد شرمندگی کے احساس میں راجہ اپنے براہمن مشیر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"آپ برا نہ مانیے گا دراصل راج کماری پوار میری اکلوتی بیٹی ہے۔ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور پھر بہت سے مذاہب کے متعلق اس کا علم بہت زیادہ ہے اس بنا پر میں اکثر و بیشتر اس کی اس طرح کی دھرم دین کے متعلق گفتگو کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں جو تجویز آپ نے پیش کی ہے اس پر عمل کیا جائے گا اور مجھے امید ہے اس تجویز پر عمل کر کے ہم نگر کوٹ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

☆☆☆

جس وقت علی بن ربیع اور عبدالرزاق اپنے لشکر کو لے کر لاہور کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے اور مجدود اور اس کا ساتھ دینے والے سالار علی خویشاوند، رام دیو، تو لک اور ناتھ اپنا لشکر لے کر تھانیسر سے لاہور کا رخ کر رہے تھے ان دونوں گروہوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ پہلے لاہور میں وارد ہو کر لاہور پر قبضہ کر لیں۔

اسی موقع پر دہلی کے راجہ نے اپنی کارروائی کی ابتدا کی اور اس کی اس کارروائی کو مورخین اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں، کہتے ہیں۔

"نگر کوٹ میں بت پرستی کے مروج ہونے کی تفصیل بھی عجیب و غریب ہے۔ دہلی کے راجہ نے دیکھا کہ غزنی سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں اور حکومت میں تنزلی اور پستی کے آثار نمودار ہو گئے ہیں تو اس نے ایک متعصب براہمن کے مشورے سے یہ چال چلی کہ ایک روز صبح کے وقت اپنے تمام امیروں وزیروں کو جمع کر کے ان سے کہا۔

کل خواب میں نگر کوٹ کے بت نے مجھے ایک ہدایت دی ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ میں تمہیں بتا دوں ہمارے معبود نے یہ فرمایا ہے کہ اب تک میں غزنی میں رہتا تھا وہاں رہنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو تباہ و برباد کروں اور غزنی سلطنت کو کمزور کر دوں میں اپنا مقصد پورا کر چکا ہوں اور اب میں چاہتا ہوں کہ اپنے مرکز میں واپس آ جاؤں اور اپنے پرستاروں کو پرستارانِ خدا پر غالب کر دوں۔ میرے بندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس سمجھیں اور مسلمانوں کے مقابلے میں جان کی بازی لگا دیں پھر میری مدد پر بھروسا کریں اور تمام علاقوں کو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لیں۔"

مورخین مزید کہتے ہیں کہ راجہ کی اس تقریر نے حاضرین کے دل میں بہت اثر کیا اور سب نے

مسلمانوں سے جنگ کرنے کا پکا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک عیش و طرب کا جشن بھی منعقد کیا اور ہندوؤں نے اس دن کو ایک بہت بڑے تہوار کی طرح ہنسی خوشی بسر کیا۔

راجہ دہلی نے اپنے مشیر کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس نے ایک نئی چال چلی۔ اس نے فوراً چند قابل اعتبار سنگ تراشوں کو بلایا اور انہیں ایک ایسا بت بنانے کی ہدایت کی جو ہو بہو نگرکوٹ کے بت سے ملتا ہو۔

سنگ تراشوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور جلد ہی ایک بت تیار کر لیا جو شکل و صورت کے لحاظ سے نگرکوٹ کے بت سے ملتا جلتا تھا۔

مورخین مزید کہتے ہیں کہ دہلی کا راجہ اس بت کو ساتھ لے کر دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ پہلے ہانسی اور تھانیسر کی فتح کے لیے نکلا۔

کیونکہ یہ دونوں علاقے خالی تھے۔ مجدود تھانیسر کو خالی کر کے جا چکا تھا لہٰذا دہلی کے راجہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی ہنسی پر بھی اپنی گرفت کر لی اس کے بعد نگرکوٹ پہنچا۔

چنانچہ نگرکوٹ پہنچ کر دہلی کا راجہ قلعے کے ایک طرف مقیم ہو گیا اسی دن رات کے وقت راجہ نے اپنے براہمن مشیر اور چالاک ساتھی کے حوالے وہ بت کیا اور اسے کہا کہ اسے باغ میں کسی مناسب جگہ نصب کر دو۔

اس براہمن نے راجہ کے حکم کی تعمیل کی اور اس نوتراشیدہ بت کو باغ میں ایک ایسی جگہ نصب کر دیا جہاں پر آنے والے کی نظر پڑتی تھی اور خود لوگوں کی نظریں بچا کر واپس آ گیا۔

صبح مالی جب اپنا کام کرنے باغ میں گئے تو انہوں نے بت کو دیکھا کیونکہ یہ مالی نگرکوٹ کے بت سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے وہ اسے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ بت واپس آ گیا ہے ان سب کو اس کی بے انتہا خوشی ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے سے گلے مل کر نعرے لگا کر اس خوشی کا اظہار کیا۔

مورخین اضافہ کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ مالیوں نے اس واقعے کی خبر راجہ کے لشکر تک پہنچائی جب لشکریوں کو اس خبر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور مورخین لکھتے ہیں کہ انہوں نے خوشی کے نعرے لگا لگا کر آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔

مورخین اضافہ کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ جب دہلی کے راجہ نے دیکھا کہ سیدھے سادھے لشکری اس کے دھوکے میں آ گئے ہیں تو ان کے اس یقین کو اور بھی مستحکم کرنے کے لیے وہ اپنے بیٹوں، رشتہ داروں اور معززین کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں بھی دہلی سے نگرکوٹ بلا لیا چنانچہ ان کی آمد سے پہلے ہی پہلے راجہ اپنے ان امرا اور سالاروں کے ساتھ جو لشکر میں موجود تھے، ننگے پاؤں باغ کی طرف دوڑتا ہوا گیا۔ باغ میں پہنچ کر راجہ نے بڑے والہانہ انداز میں اپنا سر بت کے پاؤں پر رکھ دیا اور اپنے عقیدے اور بسارا کے مطابق نذر چڑھا کر باغ سے باہر آیا۔

اس نے باہر آ کر اپنی رعایا سے کہا۔

”چونکہ ہمارا معبود غزنی سے ہندوستان کا سفر ایک ہی رات میں طے کر کے آیا ہے اس لیے سفر کی تھکان کی وجہ سے چور چور ہے لہٰذا آج تو وہ تمام دن آرام کرے گا اور کل اپنے تمام پرستاروں کو شرف یابی عطا کرے گا۔“

سارے لوگوں نے راجہ کی اس بات کا یقین کیا اور حسب استطاعت نذر چڑھا کر اور منتیں مان کر اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹے۔

دوسرے دن تمام ہندو لشکری اور عام لوگ اپنے معبود کی سرکار میں پہنچے اور انہوں نے اس بت پر اس قدر سونا چاندی اور جواہرات چڑھائے کہ غالباً سلطان محمود غزنوی کی روح بے چین ہو کر غزنی سے ہندوستان کی طرف آ گئی ہو گی۔

راجہ دہلی کا وہ چالاک براہمن بت کے پاس کھڑا رہا جو شخص بھی نذر چڑھانے کے لیے بت کے پاس آتا یہ براہمن اس کے کان میں کہتا۔

”تمہارے معبود کا یہ حکم ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے قلعے سے مسلمانوں کو باہر نکال دو کیونکہ یہ تمہارے دیوتا کی قیام گاہ ہے اور اسے دوبارہ اپنے معبود کی قیام گاہ بنا دو۔“

ہندوؤں میں سے ہر شخص نے اس حکم کو سن کر یہ اقرار کیا کہ وہ قلعے کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔

اور یہ بھی عہد کیا کہ مسلمانوں سے جی توڑ کر لڑیں گے۔ اس کے بعد تمام ہندو لشکریوں نے آپس میں مل مل کر پوری شدت کے ساتھ قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

اس موقع پر نگرکوٹ کے مسلمانوں نے اپنے تیز رفتار قاصد لاہور کی طرف بھجوائے۔ لاہور سے انہوں نے دہلی کے راجہ کے خلاف مدد طلب کی لیکن لاہور کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ مدد کو پہنچتے لاہور میں اس وقت امیر ایاز تھا لیکن وہ بے بس اور مجبور تھا اس لیے کہ ایک طرف سے علی بن ربیع اور عبدالرزاق اپنے لشکر کو لے کر بڑی تیزی اور برق رفتاری سے لاہور کا رخ کر رہے تھے تو دوسری طرف سے مجدود اپنے لشکر کے ساتھ تھانیسر سے لاہور کا رخ کیے ہوئے تھا لہٰذا وہ نگرکوٹ والوں کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

نگرکوٹ فتح ہو گیا اور لٹے پٹے مسلمان نگرکوٹ سے نکل کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی روانگی کے بعد دہلی کے راجہ نے سلطان محمود غزنوی کے ڈھائے ہوئے مندر کو مرمت کروایا اور اس بت کو اصل جگہ پر نصب کر کے بت پرستی کا بول بالا کیا۔ نگرکوٹ کی فتح کی خبر کے ساتھ بت کی واپسی کا من گھڑت قصہ بھی بہت مشہور ہوا اور آس پاس کے ہندو ریاستوں کے حکمران بڑے خوش ہوتے اور نگرکوٹ جا کر بت کی زیارت کرنے لگے۔

چنانچہ مورخین لکھتے ہیں کہ نگرکوٹ میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا اور اس نئے بت کی اتنی پوجا ہوئی کہ پہلے اصل بت کی بھی کبھی نہ ہوئی ہو گی۔ ہندوؤں کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی بڑا اور اہم کام شروع کرتے تو اس بت سے ضرور مشورہ لیتے اگر بت اجازت دیتا تو وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے ورنہ چپ ہو رہتے۔ اس زمانے میں نگرکوٹ کے قرب و جوار کے بعض جاہل مسلمان بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اس بت کو نذر میں چڑھاتے تھے اور یہ جھوٹے خدا پرست بھی اس بے حس، حرکت پتھر کے بت کو آرزوئیں اور مرادیں بر آنے کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔

امیر مجدود لاہور سے تھانیسر کی طرف اس لیے گیا تھا کہ ان سارے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کرے اور اس کے بعد دہلی کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرے تاکہ اس کی حکومت پائیدار اور مستقل ہو جائے چنانچہ اسے جب خبر ہوئی کہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق ایک لشکر لے کر لاہور کا رخ کر رہے ہیں تو وہ اپنے اس لشکر کے ساتھ حرکت میں آیا جو اس نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا چنانچہ لاہور کی طرف روانہ ہوا مجدود کی خوش قسمتی کہ وہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق سے پہلے لاہور پہنچ گیا اور قلعے پر اس نے قبضہ کر لیا۔ علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے پاس کوئی بڑا لشکر نہیں تھا جبکہ ان کے مقابلے میں مجدود کے پاس ایک جرار اور بہت بڑا لشکر تھا لیکن مورخین کہتے ہیں کہ دونوں لشکر آپس میں ٹکرا نہ سکے اس لیے کہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے حق میں قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ عیدالاضحیٰ کا موقع آ گیا اور عیدالاضحیٰ کے روز ہی صبح کے وقت امیر مجدود اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ مجدود کی اس ناگہانی موت کا کوئی ظاہری سبب معلوم نہ ہو سکا اور سوائے دست فنا کے کوئی دنیاوی ہاتھ اس فعل کا مرتکب نظر نہ آیا۔

مجدود کے انتقال کے تھوڑے دن بعد ایاز بھی فوت ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کے دونوں لشکریوں کے درمیان لڑائی ٹل گئی۔ لاہور کا نیا والی

مقرر کیا گیا جبکہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق نے اپنے لشکر کے ساتھ لاہور شہر سے باہر پڑاؤ کر لیا تھا۔

مجدود کا جو لشکر تھا اس نے چونکہ اطاعت قبول کر لی تھی لہٰذا لاہور میں امن ہو گیا اب علی بن ربیع نے اپنے آدمیوں کو تولک، ناتھ، رام دیو اور علی خویشاوند کی تلاش میں لگا دیا تھا۔

لاہور کے نواح میں قیام ہی کے دوران علی بن ربیع کو اس کے مخبروں نے یہ اطلاع دی کہ دہلی سے ایک بہت بڑا قافلہ جس میں دہلی کے راجہ کے عزیز و اقارب، اس کے رشتہ دار، اس کی بیوی، اس کے گھر والے ایک لشکر کے ساتھ دہلی سے نگر کوٹ کا رخ کر گئے ہیں۔ چنانچہ ناتھ، تولک، رام دیو اور علی خویشاوند اسی لشکر میں شامل ہو کر نگر کوٹ کا رخ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے ہیں۔

ایک روز علی بن ربیع اور عبدالرزاق ایک ہی خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ علی بن ربیع، عبدالرزاق کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''عبدالرزاق میرے بھائی! نگر کوٹ کا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانا ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے اور یہ سب کچھ مسلمانوں کی نااتفاقی اور آپس کی لڑائیوں کی وجہ سے ہوا ورنہ نگر کوٹ ایک طرح سے مسلمانوں کا مرکز بن چکا تھا۔ میرے بھائی! ناتھ، تولک، رام دیو اور علی خویشاوند چاروں سلطان مسعود کے قاتل ہیں۔ ان کو تلاش کر کے ان کے جرم کی سزا دینا ہم پر فرض بنتا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اپنے لشکر کو صرف ایک دن یہاں ستانے کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر تک میں اپنے کچھ مخبروں کو روانہ کر رہا ہوں جو دہلی سے روانہ ہونے والے دہلی کے راجہ کے اس لشکر کے محل وقوع سے ہمیں آگاہ کریں گے۔ جس میں راجہ کے اہل خانہ کے علاوہ دہلی کے امرا نگر کوٹ کا رخ کر رہے ہیں تاکہ نگر کوٹ کی فتح پر نگر کوٹ پہنچ کر وہاں کی خوشیوں میں شامل ہوں اور یہ چاروں قاتل بھی اسی لشکر میں شامل ہو کر نگر کوٹ کا رخ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں اس لشکر پر حملہ آور ہوں۔ جس میں شامل ہونے کے لیے یہ چاروں گئے ہیں اور انہیں پکڑ کر انہیں ان کے انجام بد تک پہنچایا جائے۔ عبدالرزاق نے علی بن ربیع کی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ علی بن ربیع کے ان الفاظ میں عبدالرزاق بولا اور کہنے لگا۔

''میرے بھائی! میں تمہاری اس تجویز سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ لشکریوں کو آج آرام کرنے دیں۔ کل ہم یہاں سے کوچ کریں گے۔ اس معاملے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ دہلی سے روانہ ہو کر نگر کوٹ جانے والا وہ لشکر ہماری گرفت سے باہر ہو جائے۔ مخبروں کو بھی میں چاہتا ہوں ابھی اسی وقت روانہ کیا جائے تاکہ دہلی سے نگر کوٹ جانے والے اس لشکر کے محل وقوع سے ہم آگاہ ہو سکیں۔

عبدالرزاق کے ان الفاظ کا جواب علی بن ربیع دینا ہی چاہتا تھا کہ عین اسی وقت دروازے پر کوئی کھنکارا۔ علی بن ربیع نے جب باہر دیکھا تو اس کے تین مخبر دروازے پر کھڑے تھے۔ علی بن ربیع نے انہیں اندر آنے کے لیے کہا وہ اداس افسردہ پریشان اور بکھرے بکھرے سے تھے۔

ان کی یہ حالت دیکھتے ہوئے علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں پریشان ہو گئے تھے۔ کچھ دیر تک علی بن ربیع ان کی طرف بڑے غور سے دیکھتا رہا، پھر خدشات بھری آواز میں اس نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

''میرے ساتھیو! تم تینوں کے چہرے بتاتے ہیں کہ تم تینوں ہمارے لیے کوئی اچھی نہیں بلکہ انتہائی بری خبر لے کر آئے ہو، دیکھو دیر نہ کرو خبر جیسی بھی ہے ہم اسے سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ بولو کیا معاملہ ہے۔'' اس پر ایک مخبر بولا اور کہنے لگا۔

''امیر! ہمارے ساتھ ایک بہت بڑا اور ہولناک واقعہ ہو گیا ہے۔ ابونصر اپنے جس قافلے کو لے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا تھا، جس میں آپ کے اور عبدالرزاق کے علاوہ لشکر کی دوسری عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان پر حملہ کیا گیا۔ ساری عورتوں، بچوں تک کو تہ تیغ کر دیا گیا اور ابونصر کو لے کر غزنی کی

طرف جانے میں کامیاب ہوا، یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر رکا، پر علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''امیر! آپ کی بیوی، آپ کی بیوی کا بھائی روبیل اس کی بیوی عبدالرزاق کی بیوی کے علاوہ باقی ساری عورتیں اس حملے میں ماری جا چکی ہیں۔ یہ ہولناک خبر سن کر کچھ دیر تک خیمے میں کاٹ کھانے والی خاموشی رہی، ایسا لگتا تھا جیسے راحیل، معارہ کی خبر نے علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں کی روح کی گہرائیوں کو ویران دل کے ساحلوں کو بے چین کر دیا گیا ہو، کچھ دیر تک دونوں سر جھکائے ویرانوں کے سناٹوں میں خون آلود ڈوبتے سورج اذیت بھرے سرابوں اور آتش گرفتہ لمحات کی طرح چپ، اداس اور افسردہ پڑے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ پھر غم میں ڈوبی آواز خیمے میں بلند ہوئی اور یہ آواز علی بن ربیع کی تھی۔ عبدالرزاق کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا

''عبدالرزاق میرے بھائی! ہم دونوں سمرقند سے اکیلے چلے تھے۔ غزنی آ کر ہمیں خوشیوں، طمانیت نے مالا مال کر دیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب ایک بار پھر ہم دونوں بگولوں کے ہمزاد سفر میں برے حالات عذاب بن کر ہم پر برس گئے ہیں۔ المناک سناٹوں کی شوریدگی لیے خیابانوں اور ویران گلستانوں نے ہم دونوں کا رخ کر لیا ہے۔''

یہاں تک کہتے کہتے علی بن ربیع خاموش ہو گیا۔ اس لیے کہ دروازے پر ایک چھوٹا سالار نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں سنبھل گئے۔ ہاتھ کے اشارے سے علی بن ربیع نے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ آگے بڑھا اور علی بن ربیع کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ علی بن ربیع نے اسے مخاطب کیا۔

''میرے عزیز! کیا بات ہے۔ کیا تم کوئی اور خبر لے کر آئے ہو؟''

اس پر آنے والا وہ چھوٹا سالار بولا اور علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''امیر! ہمارے مخبر کچھ خبریں لے کر آئے ہیں۔ آپ چونکہ پریشان، فکرمند تھے۔ لہٰذا ساری تفصیل انہوں نے مجھے بتا دی ہے۔ پہلی تفصیل یہ ہے کہ دہلی سے ایک لشکر جس میں دہلی کے امراء عورتیں، راجہ کے گھر والے اس کے عزیز و اقارب اور کچھ دوسرے معزز لوگ ہیں۔ وہ نگر کوٹ کا رخ کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ راجہ نے ایک گہری چال چلی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے جس وقت نگر کوٹ کو فتح کیا تھا تو نگر کوٹ کا بت وہ اٹھا کر لے گیا تھا۔ اسے پاش پاش کر دیا تھا۔ اب راجہ نے یہ مکر کیا ہے کہ اس نے پہلے اسی شکل و صورت کا ایک بت بنایا اور لوگوں پر یہ ظاہر کیا ہمارا نگر کوٹ کا بت غزنی میں اس لیے ٹھہرا ہوا تھا تاکہ وہ غزنی کی سلطنت کی تباہی کا باعث بنے۔ اب غزنی کی سلطنت انتشار کا شکار ہو گئی ہے۔ لہٰذا بت واپس آ گیا ہے اور ساتھ ہی اس نے اپنے سنگ تراشوں سے جو بت بنوایا تھا اسے نگر کوٹ میں رکھ دیا ہے۔ اب لوگ جوق در جوق اس بت کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں۔ دہلی سے بھی لوگ نگر کوٹ کا اسی وجہ سے رخ کر رہے ہیں۔

دوسرا پہلو اس خبر کا یہ ہے کہ کیونکہ نگر کوٹ کے مسلمانوں کو باہر سے کوئی مدد نہیں ملی۔ اس بنا پر وہ لٹے پٹے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک حصہ لاہور میں آباد ہو جانے کے لیے رخ کر رہا ہے اور دوسرا حصہ یہاں سے نکل کر غزنی کا رخ کرنا چاہتا ہے۔''

یہ خبر سن کر علی بن ربیع اچانک اپنی جگہ پر غصے کی حالت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے عبدالرزاق اور دوسرا سالار بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر علی بن ربیع آنے والے سالار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''لشکر کو حکم دو کہ پڑاؤ کو سمیٹ لیں۔ تھوڑی دیر تک ہم یہاں سے کوچ کریں گے اور ہمارے یہ جو

مخبر خبریں لے کر آئیں ہیں، ان پر واضح کردو کہ وہ دو حصوں میں بٹ جائیں گے۔ ان کا ایک حصہ میری رہنمائی دہلی سے آنے والے لشکر کی طرف کرے گا اور ان مخبروں کا دوسرا حصہ میرے بھائی عبدالرزاق کی رہنمائی دہلی کے راجہ کے اس لشکر کی طرف کرے گا جو نگر کوٹ سے نکلنے والے قافلوں کے درپے ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ سالار وہاں سے ہٹ کر نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد علی بن ربیع نے عبدالرزاق کو مخاطب کیا۔

''عبدالرزاق میرے بھائی! تھوڑی دیر تک ہم یہاں سے کوچ کریں گے۔ میں اس لشکر کو اپنا ہدف بناؤں گا۔ جو دہلی سے نگر کوٹ کا رخ کیے ہوئے ہے اور تم اس لشکر پر حملہ آور ہونا، جو نگر کوٹ سے نکلنے والے مسلمانوں کو لوٹنے کی خاطر ان کے تعاقب میں لگا ہے۔ دیکھ میرے بھائی! اپنے لشکریوں کو سختی کے ساتھ یہ ہدایت کر دینا کہ حملہ آور ہوتے ہوئے کسی بوڑھے، کسی عورت، کسی بچے کو زخمی کرنا تو بہت دور کی بات، ہاتھ تک نہیں لگانا، جس لشکر پر تم حملہ آور ہو گے میرے خیال میں اس میں نہ کوئی بوڑھا ہوگا، نہ کوئی بچہ، نہ کوئی عورت اور جو لشکر دہلی سے آرہا ہے جو میرا ہدف بنے گا، مجھے امید ہے کہ اس میں بوڑھے، عورتیں اور بچے سب ہی شامل ہوں گے۔ اب آؤ اپنی تیاری کو آخری شکل دیں، تاکہ فوراً یہاں سے کوچ کریں۔''

عبدالرزاق نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد علی بن ربیع اور عبدالرزاق نے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد وہاں سے کوچ کر لیا تھا۔

☆☆☆

علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں بگولوں کے ساتھ رقص کرتے قدیم سربستہ رازوں اور صحراؤں کی وسعتوں میں سمندر کی گہرائیوں سے اچانک اٹھ جانے والے آتش فشانی دھاروں کی کھولن کی طرح اپنے اپنے ہدف کی طرف بڑھے تھے۔

سب سے پہلے علی بن ربیع نے دہلی سے آنے والے لشکر کو جالیا اور پھر ان کے قریب جاتے ہی اس نے بڑے ہولناک انداز میں تکبیریں بلند کیں۔ پھر وہ دہلی سے آنے والے اس لشکر پر چار سو پیچ کھاتی آندھیوں میں لپکتی، جھپکتی، گونجتی برق آتشی کے خوفناک الاؤ برق کے برستے تازیانوں بقا کو فنا میں تبدیل کرتے تباہی اور بربادی کے بھپرے کالے سمندر اور دل کے ساحلوں کو بے چین کر دینے والے جبر مسلسل کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

دوسری طرف یہی کام عبدالرزاق نے بھی کیا۔ وہ بھی نگر کوٹ کے اس لشکر پر جو مسلمانوں کے تعاقب میں تھا۔ عمروں کے تسلسل کو فنا کرتی، عذاب بھری بے روک آندھیوں، وقت کی بیاض کے اوراق کو منتشر کر دینے والے نفرت آلود عذاب اور محرومیت طاری کرتے بنجر لمحوں کی یورش کی طرح ٹوٹ پڑا۔ لمحوں کے اندر اس نے نگر کوٹ کے لشکر کو بدترین شکست دی اور وہ شکست خوردہ لشکر نگر کوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ چنانچہ جو مسلمان نگر کوٹ سے نکلے تھے وہ ایک جگہ رک گئے۔ عبدالرزاق اور اس کے لشکریوں کا شکریہ ادا کیا اور عبدالرزاق کے کہنے پر انہوں نے وہیں پڑاؤ کر لیا تھا۔ اس لیے کہ عبدالرزاق یہ چاہتا تھا کہ علی بن ربیع بھی اپنے ہدف سے نبٹ کر ان کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے بعد اگلا قدم اٹھایا جائے۔

دوسری طرف علی بن ربیع نے دہلی سے آنے والے لشکر کو بدترین شکست دی۔ جس قدر مسلح جوان تھے، انہیں کاٹ کر رکھ دیا اور ان کے ساتھ جو بوڑھے، بچے اور عورتیں تھیں انہیں اپنی مرضی سے جانے کی اجازت دے دی۔

اس موقع پر ایک چھوٹا سالار بھاگا بھاگا وہاں آیا جہاں دہلی کے لشکر کو شکست دینے کے بعد علی بن ربیع اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ علی بن ربیع کے پاس آکر وہ سالار رکا۔ پھر علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''امیر دہلی سے آنے والے لشکر میں جو عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے وہ تو نگر کوٹ کی طرف روانہ ہو گئے ہیں، لیکن ان میں ایک ایسی لڑکی ہے جو اڑ گئی ہے اور اس نے نگر کوٹ جانے سے انکار کر دیا ہے۔ ساتھ ہی وہ اس بات پر بضد ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' یہاں تک کہنے کے بعد وہ سالار غور سے علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''امیر محترم! ایک اور بات بھی ہے۔ وہ یہ کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ دہلی کے راجہ کی بیٹی اور اس راج کماری کا نام پوار دیوی ہے۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ مجھے بے شک یہاں قتل کر دیا جائے۔ میری گردن کاٹ دی جائے، لیکن میں تمہارے سالار سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

اس موقع پر علی بن ربیع نے کچھ سوچا، پھر کہنے لگا۔

''اچھا اسے لے کر آؤ، میں دیکھتا ہوں وہ کیا کہتی ہے۔''

وہ سالار وہاں سے ہٹ گیا، تھوڑی دیر بعد وہ سالار اپنے ساتھ راج کماری پوار دیوی کو لے کر آیا۔ پوار دیوی، علی بن ربیع کے سامنے آکے کھڑی ہوئی۔ پھر علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں اس سے پہلے میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ کے لشکر میں کوئی عورت ہو تو وہ میری تلاشی لے لے تاکہ میرے متعلق آپ یہ وہم و گمان نہ کریں کہ میں کہیں اپنے لباس میں کوئی خنجر چھپائے ہوئے ہوں اور موقع پا کر آپ پر حملہ آور ہو جاؤں گی۔''

اس پر علی بن ربیع مسکرایا اور کہنے لگا۔

''دیکھ پوار دیوی ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو ہمارے لشکر میں کوئی عورت ہے ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس انداز میں تم گفتگو کر رہی ہو اس سے میں اندازہ لگاتا ہوں کہ تم چھپ کر حملہ آور ہونے کے لیے نہیں آئی ہو۔ بس یہ بتاؤ کہ تم کس مقصد کے تحت مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔'' علی بن ربیع کے اس سوال کے جواب میں کسی قدر خوشی اور طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے پوار دیوی کہنے لگی۔

''مسلمانوں کے امیر! میں نے دہلی میں قیام کے دوران بہت سے مذاہب کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ لیکن میں اب اس دھرم سے بے زار ہوں۔ میں نے مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، آتش پرستوں کے دھرم کا بھی مطالعہ کر رکھا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مجھے مسلمانوں کا دھرم سچائی اور حقیقت کے قریب لگا۔ اس بنا پر میں اس دھرم کا مزید مطالعہ اور مزید تحقیق کرنا چاہتی ہوں۔ اب آپ یہ سوچیں گے کہ ایسا کرنے کے لیے اتنی دور غزنی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دہلی کے بعد یہ کام لاہور جیسے بڑے شہر میں بھی ہو سکتا ہے لیکن امیر! میں آپ سے یہ کہوں کہ لاہور میں میں نہیں جانتی اس وقت کون حاکم ہے۔ وہاں نہ میرا کوئی جاننے والا ہے، نہ واقف کار، میں کہاں قیام کروں گی اور کس سے تحقیق کروں گی۔ آپ کیونکہ غزنی کے لشکر کے سالار اعلا ہیں۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ آپ غزنی میں میرے قیام کا ہی نہیں میری حفاظت کا بھی اہتمام کر سکتے ہیں۔ میں وہاں قیام کر کے اپنی تحقیق مکمل کروں گی اور پھر واپس ہندوستان کا رخ کر لوں گی۔ مجھے امید ہے کہ مسلمانوں کا سالار جس کا نام علی بن ربیع ہے اور جس نے بڑے بڑے سالاروں، بڑے بڑے لشکروں کو اپنے سامنے رگید کر رکھا۔ وہ میری اس التماس کو رد نہیں کریں گے۔''

راج کماری پوار دیوی کے ان الفاظ پر علی بن ربیع چونکا تھا، کہنے لگا۔

''تمہیں میرے نام کا کیسے پتا چلا، تمہیں کس نے بتایا کہ میں غزنی کے لشکر کا سالار اعلا ہوں۔'' اس پر پوار دیوی بولی اور کہنے لگی۔

''یہاں آپ کے لشکر میں آنے سے پہلے میں آپ کے نام اور آپ کی کارروائیوں سے واقف

ہوں۔ اس لیے کہ آپ کا نام اکثر ہمارے مخبر، میرے باپ کے سامنے لیا کرتے تھے۔ آپ کی بہادری، آپ کی شجاعت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں آپ اور آپ کے ایک ساتھی نام جس کا عبدالرزاق ہے، دونوں کا تعلق سمرقند سے ہے۔ امیر آپ مجھ پر اعتبار اور بھروسا کیجیے گا۔ میں کسی بھی قسم کے نقصان اور بدنامی کا باعث نہیں بنوں گی۔ میں آپ کے اہل خانہ پر بھی بوجھ نہیں بنوں گی۔ بس مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنے لشکر میں رہ کر غزنی کی طرف جانے کی اجازت دے دیں گے اور وہاں میرے قیام اور میری حفاظت کا بھی بندوبست کریں گے۔"

پوار دیوی جب خاموش ہوئی تو ایک بار پھر علی بن ربیع نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنے دھرم سے بے زاری کا اظہار کس وجہ سے کر رہی ہو اور کیوں اور کس بنا پر تم ہمارے دین دھرم سے متاثر ہوئی ہو اور اس پر مزید تحقیق کرنا چاہتی ہو۔"

جواب میں پوار دیوی بولی اور کہنے لگی۔

"امیر! یہ کوئی چند سطروں کی بات نہیں ہے۔ یہ لمبی داستان ہے۔ یہاں میں کھڑے کھڑے تو نہیں کہہ سکتی۔ آپ کے پاس کہیں مجھے بیٹھنے کا موقع ملا تو تفصیل کے ساتھ میں ساری تفصیل بتا سکتی ہوں۔"

اس پر علی بن ربیع نے اس سالار کی طرف دیکھا جو پوار دیوی کو لے کر آیا تھا اور کہنے لگا۔

"اسے اپنے لشکر میں رہنے دو، اس کی حفاظت کا انتظام کرو، اس کے گھوڑے کے ساتھ بندھا ہوا جو سامان ہے۔ اس کی بھی حفاظت کی جائے۔ ساتھ ہی اپنے کچھ آدمیوں کو مقرر کرو اس لیے کہ دہلی سے نگر کوٹ جانے والے اس لشکر میں ہمارے چار باغی سالار علی خویشاوند، ناتھ، تو لک اور رام دیو بھی آ کر ملے تھے۔ مرنے والوں کا جائزہ لو، پھر مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ان کی لاشیں مرنے والوں میں شامل ہیں۔"

پہلے کچھ لشکریوں کو اس نے پوار دیوی کی حفاظت پر مقرر کیا۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ ع بن ربیع بھی وہاں سے ہٹ کر پہلے کی طرح ا زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے لگا تھا۔

اسی روز شام سے کچھ پہلے علی بن ربیع وہاں سے کوچ کیا۔ دہلی سے آنے والے جس لشکر وہ حملہ آور ہوا تھا۔ اس سے مال و دولت کی صور میں بہت کچھ ملا تھا۔ لہٰذا ہر چیز کو سمیٹتا ہوا وہ اس جگ پہنچا جہاں عبدالرزاق نے اپنے حصے کے لشکر ساتھ قیام کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہاں پہنچتے ہی علی بن ر نے پورے لشکر کو وہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ جس وقت پڑاؤ قائم ہو رہا تھا تو جو لوگ نگر کوٹ سے نکل لاہور اور غزنی کا رخ کرنا چاہتے تھے علی بن ربیع ا عبدالرزاق دونوں ان کی طرف گئے۔ ان سے طو گفتگو کی۔ انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ بالکل بے فکری سے غزنی کے بجائے لاہور کا رخ کریں او لاہور میں ان کے قیام اور ان کی سکونت کا بہتر اہتمام کیا جائے گا۔

اس پر وہ لوگ مان گئے اور وہ لاہور کی طرف روانہ ہو گئے اور ان سے آگے آگے علی بن ربیع تیز رفتار قاصد لاہور کی طرف روانہ بھی کیے۔ لاہور جو نیا حاکم بنا تھا۔ اسے ان لوگوں کے آرام و قیام او ان کی دوسری ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے پیغا بھیج دیا تھا۔

یہ سارے انتظامات کرنے کے بعد عبدالرزا کے ساتھ علی بن ربیع اپنے خیمے میں داخل ہوا اور راج کماری پوار دیوی کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اس وہ تفصیل کے ساتھ عبدالرزاق سے کہہ دی تھی۔

عبدالرزاق کچھ دیر خاموش رہا، کہنے لگا۔

"اگر وہ راج کماری ہے اور اس نے میر بھائی تم سے یہ کہا کہ گفتگو کرنے سے پہلے اس تلاشی لے لی جائے، تا کہ اس نے کہیں خنجر یا دو ہتھیار اپنے لباس میں چھپا نہ رکھا ہو تو میں سمجھتا ہو وہ کسی بھی وقت کسی کے لیے خطرہ نہیں بن سکتی۔"

علی بن ربیع نے اس سے اتفاق کیا تھا، پھر

عبدالرزاق کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"دراصل اب میں اس سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیا اسباب، کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر وہ اپنے دھرم سے نالاں اور بے زار ہوئی اور اسلام کی طرف متوجہ ہو کر وہ ہمارے مذہب سے متعلق مزید معلومات کرنا چاہتی ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد علی بن ربیع رکا، پھر عبدالرزاق کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"شاید دو، تین دن یہاں قیام کرنے کے بعد ہم یہاں سے سیدھے غزنی کی طرف کوچ کر جائیں۔ کوچ کرنے سے پہلے میں راج کماری پوار سے پوری تفصیل حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں کسی کو بھیجتا ہوں۔ وہ اسے بلا کر یہاں لائے اور اس سے پھر میں تفصیل پوچھتا ہوں۔"

عبدالرزاق نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ لہٰذا علی بن ربیع نے اپنے ایک لشکری کو راج کماری پوار کو لانے کے لیے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد خیمے کے دروازے پر راج کماری پوار نمودار ہوئی۔ علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں اپنی جگہوں پر کھڑے ہوئے۔ پوار دیوی کو اندر آنے کے لیے کہا اور جس نشست کی طرف علی بن ربیع نے اشارہ کیا اس پر پوار دیوی بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے علی بن ربیع نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"پوار دیوی تمہاری گفتگو سے یہ تو اندازہ لگا چکا ہوں کہ تو کسی کے لیے خطرے کا باعث نہیں بننے والی، لیکن میں صرف وہ اسباب اور وہ علتیں جاننا چاہتا ہوں جن کی بنا پر تم اپنے دھرم سے بے زار ہو اور اسلام کی طرف مائل ہو کر اس سے متعلق مزید تحقیق کرنا چاہتی ہو۔ اب بولو تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو اور ہو سکتا ہے تمہاری گفتگو سے تمہارے دھرم سے متعلق ہمارے علم میں بھی اضافہ ہو۔"

راج کماری پوار دیوی کچھ سوچتی رہی۔ اس کے بعد اپنے خوب صورت سرخ ہونٹوں پر اس نے زبان پھیری، ایک گہری نگاہ باری باری اس نے علی بن ربیع اور عبدالرزاق پر ڈالی، پھر کہنے لگی۔

"میں آپ دونوں کو آگاہ کروں کہ ہمارے دھرم میں گیتا نام کی ایک کتاب ہے۔ جسے بڑا اہم اور مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ گیتا اس کائنات کے خالق سے متعلق وہی کہتی ہے جو مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ گیتا کہتی ہے کہ اس کا نہ کوئی شروع ہے، نہ آخر اور سب میں بسا ہوا ہے اور سب سے الگ ہے اور وہ سب کے دلوں میں ہے اور وہ خیال کی پہنچ سے بھی پرے ہے۔ نہ آدمی کا دماغ اس کا تصور کر سکتا ہے اور نہ اس کی زبان اسے بیان کر سکتی ہے۔

لیکن اس دھرم کی مقدس کتاب میں ایک ایسی خامی جسے زمینی اثرات اور زمینی ثبوت تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

پیدائش عالم کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند قدوس نے سب سے پہلے آدم کو پیدا کیا۔ آدم اور ان کی بیوی حوا سے ساری دنیا اور سارے انسان وجود میں آئے۔ لیکن پیدائش عالم کے بارے میں گیتا نے ایک خاص نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا کہنا ہے کہ دنیا بار بار پیدا ہوتی ہے۔ بار بار مٹتی ہے۔ دنیا میں پہلے نا معلوم کتنی دنیا پیدا ہو چکی ہیں۔ نہ معلوم کتنی اور پیدا ہوں گی۔ گیتا یہ بھی کہتی ہے کہ روح اور مادے کی ابدیت ہے۔ وہ دائمی ہے۔ لیکن مادہ آزاد نہیں، روح کے تابع ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد راج کماری پوار رکی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔

"اسی طرح ہندوؤں میں یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا کی پیدائش کا آغاز آدم خاکی سے ہوا اور اس طرح آدم خاکی کا وجود آئندہ بھی ظاہر ہوتا رہے گا اور یہ دنیا بھی ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ لیکن جو کچھ میں نے مطالعہ کیا ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ ذی عقل اور صاحب بصیرت حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کی پیدائش سے لے کر اس وقت تک اگر کوئی آدم پیدا ہو چکے ہیں تو وہ آدم خاکی نہیں ہوں گے۔ اس

میں کچھ اور لوگ یعنی ہوا سے بنے ہوئے بعض آتش کی پیدائش ہو سکتے ہیں۔ لیکن آدم خاکی جیسا کہ میرا مطالعہ کہتا ہے وہ ایک ہی ہے اور پھر ہندو دھرم والے طوفان نوح کے بھی منکر ہیں۔ جبکہ میرے مطالعے کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر حضرت آدم سے پہلے کوئی آدم خاکی پیدا نہیں ہوا۔ ان کے دور سے لے کر اس وقت تک کا جو زمانہ گزرا ہے اس میں آدم ایک ہی ہیں اور جو لوگ یعنی ہندو دھرم میں جو صاحبان طوفان نوح کے منکر ہیں تو خود ہندوستان کے زمینی حالات ان کے اس نظریے کی نفی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت نوح جو حضرت آدم کی اولاد سے تھے۔ ان کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ طوفان نوح کے بعد حضرت نوح نے اپنے تینوں بیٹوں یعنی سام یانت اور جام کو تاکید کے ساتھ کھیتی باڑی اور کاروبار کا حکم دے کر دنیا کے چاروں اطراف میں روانہ کیا۔ سام حضرت نوح کے بڑے بیٹے اور جانشین تھے۔ ان کے فرزندوں کی تعداد ننانوے تھی۔ جن میں ارفخشند، عاد اور قحطان زیادہ مشہور ہیں۔ عرب کے تمام قبیلے ان ہی کی نسل سے ہیں۔ مسلمان جن پیغمبروں کو مانتے ہیں ان میں سے حضرت ہود، حضرت صالح اور ابراہیم اپنا سلسلہ نصب سام کے بیٹے ارفخشند تک پہنچاتے ہیں۔ ارفخشند کا ایک بیٹا کیوحرث تھا۔ کیوحرث کے چھ بیٹے تھے۔ ایک کا نام سیامک، دوسرے کا نام عراق، تیسرے کا فارس، چوتھے کا شام، پانچویں کا تورا اور دمغان۔ بڑا بیٹا سیامک آپ کا جانشین ہوا اور باقی بیٹے جس جگہ گئے وہ انہیں کے نام سے موسوم ہو گئی اور وہاں انہی کی اولاد آباد ہو گئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت نوح کے ایک بیٹے کا نام عجم تھا اور عجم کے سب رہنے والے اسی کی اولاد میں سے ہیں۔ سیامک کے بڑے بیٹے کا نام ہوسنگ تھا۔ عجم کے تمام بادشاہ یزدگرد تک اسی کی اولاد سے ہیں۔

حضرت نوح کے دوسرے بیٹے یافت ا... والد محترم کے کہنے پر مشرق اور شمال کی طرف گئے ا... وہیں آباد ہو گئے۔ اس کے بہت سے بیٹے ... ہوئے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور بیٹا ترک نا... کا تھا۔ ترکمانستان کی تمام قومیں یعنی منگول، ازبک... ترکمانی اسی کی اولاد میں سے ہیں۔ یافت ... دوسرے مشہور بیٹے کا نام چین تھا۔ چین کا نام ا... کے نام پر ہے۔ تیسرے بیٹے کا نام اربلیس تھا۔ ا... کی اولاد شمالی ملکوں کی سرحد پر بحر ظلمات تک آ... ہوئی۔ اہل تاجک اور غور وغیرہ اسی کی نسل سے ہیں...

تیسرا بیٹا حام اپنے عالی قدر والد کے حکم ... دنیا کے جنوبی حصے کی طرف گیا اور اس کو آباد اور خوش... حال کیا حام کے چھ بیٹے تھے۔ جن کے نام ہند... سندھ، حبش، انرنج، ہرمز اور بویا تھے۔

ان سب بیٹوں کے نام پر ایک ایک شہر آ... ہوا۔ حام کے سب سے زیادہ مشہور بیٹے ہند ... ہندوستان کو اپنایا اور اسے خوب آباد کیا اور سرسبز ا... شاداب کیا۔ اس کے دوسرے بھائی سندھ نے ملک... سندھ میں قیام کیا اور ٹھٹھہ اور ملتان کو اپنے بیٹوں ک... نام سے آگاہ کیا۔

ہند کے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ ان کے نا... پورب، بنگ، دکن اور نہروال تھے۔ اور جو شہر آج کل... ان ناموں سے مشہور ہیں۔ وہ ان ہی کے آباد کیے... ہوئے ہیں۔ ہند کے بیٹے دکن کے ہاں تین بیٹے پید... ہوئے۔ ایک کا نام مرہٹ دوسرے کا نام کنہڑا او... تیسرے کا نام تلنگ تھا۔ دکن نے اپنے ملک کو اپ... تینوں بیٹوں میں برابر تقسیم کیا۔ آج کل دکن میں ج... ان تین ناموں کی مشہور قومیں ہیں وہ ان ہی تینوں ک... نسل سے ہیں۔ ہند کے بیٹے نہروال کے بھی تیر... بیٹے تھے۔ جن کے نام بروج، کنباج اور مال راج... تھے۔

ان تینوں کے نام پر بھی تین شہر آباد ہوئے او... ان شہروں میں ان کی اولادیں آج تک آباد ہیں۔

ہند کے تیسرے بیٹے بنگ کے گھر میں بہت سی ... اولاد ہوئی، جنہوں نے ملک بنگال کو آباد کیا اور یہ ...گال بنگ ہی کے نام سے ہوا۔ چوتھے بیٹے پورب ... ہاں جو ہند کا سب سے بڑا بیٹا تھا، بیالیس بیٹے ...ہوئے اور کچھ ہی عرصہ میں ان کی اولاد اس قدر ...ی کہ انہوں نے ملک کے انتظام کے لیے اپنے ...اندان میں ایک شخص کشن نامی کو اپنا سردار اور ...رماں روا بنایا۔ ہندوستان میں جس شخص نے سب ... پہلے اپنی حکومت قائم کی۔ وہ کشن ہی تھا (یاد ... کہ یہ کشن وہ مشہور شری کشن نہیں ہے جس کے ...علق ہندوستان والوں نے طرح طرح کے عجیب ... اور خلاف عقل روایات اور حکایات اپنی کتابوں ...یں بیان کر رکھے ہیں اور اسے خدا کے درجے تک ...ادیا ہے۔)

بلکہ یہ کشن سمجھ دار اور عقیل شخص تھا کہ جس کو ...ندوستان والوں نے اس کی بہادری اور مردانگی کے ... نظر اپنا فرماں روا منتخب کیا۔ یہ شخص بہت بھاری ...م کا تھا۔ اس کا وزن اس قدر تھا کہ گھوڑی اس کی ...اری کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ لہٰذا اس نے حکم دیا تھا ... جنگلی ہاتھیوں کو حسن تدبیر سے رام کیا جائے تاکہ ...ان پر سواری کیا کرے۔" یہاں تک کہنے کے بعد ...ن اور خوب صورت راج کماری پوار رکی، ایک گہری نگاہ باری باری اس نے علی بن ربیع اور ...بدالرزاق پر ڈالی اور کہنے لگی۔

"جو زمینی حالات میں نے آپ دونوں ...ات کے سامنے پیش کیے ہیں، ان سے یہ ثابت ... ہے کہ طوفان نوح ایک حقیقت تھی، جس کا ...سلمانوں کا مذہب ذکر کرتا ہے اور ہندوستان کے ...زمینی حالات اور شہروں کے نام بھی بتاتے ہیں کہ دنیا ...یں آدم خاکی ایک ہی تھا۔ جس کی اولاد میں حضرت ...نوح تھے اور انہیں حضرت نوح کی اولاد میں سے ...مختلف ادوار میں مختلف لوگ آباد ہوتے رہے، ان ہی ...کے ناموں سے شہر بستے رہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد راج کماری پھر رکی، ...دوبارہ بولنا چاہتی تھی کہ علی بن ربیع نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگا۔

"راج کماری تم نے جو کچھ کہا ہے یہ حقیقت ہے، جو کچھ تم نے کہہ دیا ہے میرے خیال میں یہی کافی ہے۔ اب تم تھک جاؤ گی جو انکشافات تم نے کیے ہیں ان سے ہم نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تمہارا مطالعہ واقعی گہرا ہے اور یہ کہ تم اسلام کی طرف مائل ہو اور ہندو دھرم سے اپنی بے زاری کے لیے جو کچھ تم نے کہا ہے اسے بھی ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم تمہیں اپنے لشکر میں قیام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ تمہارے لیے ایک بہترین اور عمدہ خیمے کا اہتمام کیا جائے گا۔ تمہاری حفاظت کا بھی بہترین اہتمام کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

علی بن ربیع کے ان الفاظ پر تشکر آمیز انداز میں پوار دیوی نے اس کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگی۔

"میرے پاس نقدی، جواہرات اور دوسری قیمتی اشیا کی صورت میں بہت کچھ ہے۔ اس لیے کہ

مضمون

ہوم ورک کے لیے "کار" کے عنوان پر دو سو الفاظ پر مشتمل مضمون لکھنے کو کہا گیا۔ ایک مضمون کچھ اس طرح لکھا گیا۔

"ڈیڈی نے ایک کار خریدی مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ کل گیارہ الفاظ بنتے ہیں۔ باقی ۱۸۹ الفاظ جو ڈیڈی نے کار کی شان میں کہے تھے، انہیں یہاں تحریر کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

ابال کر کھائیں

ہفتہ صحت منایا جا رہا تھا، ایک دیوار پر لکھا تھا۔ "ہر چیز ابال کر کھائیں یا پئیں۔"

ایک شرارتی بچے نے نیچے لکھ دیا۔ "حتیٰ کہ برف بھی۔"

میں دہلی کے راج محل سے، بہت کچھ سوچ سمجھ کر نکلی تھی اور وہ تھا کہ واپس دہلی نہیں آؤں گی۔ اسی بنا پر جو کچھ سرمایہ میں اکٹھا کرسکتی تھی وہ اپنے ساتھ لائی ہوں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ وہ سرمایہ آپ اپنے پاس میری امانت کے طور پر رکھیں۔"

اس موقع پر علی بن ربیع نے اپنے ہاتھ اپنے کانوں کو لگائے، پھر کہنے لگا۔

"خاتون! یہ امانت تم اپنے پاس ہی رکھو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے اس اموال اور تمہاری اس نقدی اور دوسری قیمتی اشیا کی وجہ سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔ تمہارے ساتھ تمہارے اثاثے کی بھی خوب حفاظت کی جائے گی۔ تم پریشان نہ ہو۔"

علی بن ربیع کے ان الفاظ سے راج کماری پوار خوش اور مطمئن ہوگئی تھی یہاں تک کہ عبدالرزاق نے علی بن ربیع کو مخاطب کیا اور کہنے لگا۔

"علی بن ربیع میرے بھائی! علی خویشاوند، ناتھ، تولک اور رام دیو سے بھی متعلق کچھ پتا چلا؟"

اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے علی بن ربیع کہنے لگا۔

"عبدالرزاق میرے بھائی! جو لشکر دہلی سے نگر کوٹ کی طرف روانہ ہوا تھا اور جس میں یہ راج کماری پوار بھی شامل تھی۔ یہ چاروں ہمارے باغی سالار جو ہمارے سلطان مسعود غزنوی کے قاتل بھی ہیں۔ دہلی والے لشکر میں شامل ہوگئے تھے۔ جب میں دہلی سے آنے والے اس لشکر پر حملہ آور ہوا تو ہم نے کسی عورت کسی بوڑھے، کسی بچے پر ہاتھ نہیں اٹھایا، سب کو معاف کردیا، ان پر قابو پانے کے بعد میں نے کچھ لشکری مقرر کیے اور ان چاروں کی لاشوں کو تلاش کرنے کے لیے کہا۔ اس پر انہوں نے ان چاروں کی لاشوں کو وہاں ڈھونڈ لیا۔ چنانچہ میں مطمئن ہوگیا کہ یہ چاروں قاتل اور باغی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔"

یہاں تک کہتے کہتے علی بن ربیع کو رک جانا پڑا۔ اس لیے کہ عین اسی لمحہ ایک سالار علی بن ر کے خیمے کے سامنے نمودار ہوا اور علی بن ربیع کو مخاط کر کے کہنے لگا۔

"امیر لاہور کی طرف سے ایک قاصد آیا ہے وہ بڑا پریشان اور فکر مند ہے۔ آپ سے کچھ کہنا چا ہے۔"

ان الفاظ پر علی بن ربیع اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھتے ہوئے عبدالرزاق اور را کماری پوار بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ اس موقع آنے والے اس سالار کی طرف دیکھتے ہوئے علی بن ربیع کہنے لگا۔

"میرے عزیز بھائی! تم راج کماری پوار اپنے ساتھ لے جاؤ، اس کے لیے بہترین عمدہ ا نئے قسم کے خیمے کا اہتمام کرو، اس کا خیمہ انتہائی محفو جگہ ہوگا۔ خیمے اور اس کی حفاظت کا بھی خوب اہتما کیا جائے گا۔ یہ ہمارے ساتھ خاص مقصد کے تحت غزنی کا رخ کرے گی۔"

جواب میں اس سالار نے جب گردن کو ج کر علی بن ربیع کی ہدایت پر عمل کرنے کی حامی بھری تب راج کماری پوار کی طرف دیکھتے ہوئے علی بن ربیع کہنے لگا۔

"راج کماری تم میرے اس سالار کے ساتھ جاؤ اپنے گھوڑے کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ گھوڑے اپنا سارا ضروری سامان اتارنے کے بعد گھوڑا سالار کے حوالے کردینا۔ یہ تمہارے لیے خیمے کا اہتمام کرے گا۔ خیمے میں تمہارے آرام، تمہارے قیام کی ہر شے موجود ہوگی۔ تمہارے گھوڑے دانے، چارے کا بندوبست وہاں ہوگا جہاں لشکر گھوڑے باندھے جاتے ہیں۔ تمہیں فکر کرنے ضرورت نہیں، بس تم میرے سالار کے ساتھ ہولو، سارا انتظام کردے گا۔

پوار دیوی خوش ہوگئی تھی لہٰذا وہ خیمے سے نکل اس سالار کے ساتھ ہولی تھی۔

(جاری ہے)

یادگار

مورٹیمر نے کیمبرج بوٹ کو اسٹروک کرتے ۱۹۰۷ء میں فتح دلائی اس نے ۱۹۰۸ء میں کارنامہ دوہرایا۔ لیکن ۱۹۰۹ء میں جبکہ ج کے پاس کشتی رانوں کی بہترین ٹیم تھی آکسفورڈ سے ہار گئی۔ یہ کیسے ہوا...؟ یہ بات ہی رہی۔

احمد صغیر صدیقی

برطانوی کہانی کار جیفری آرچر کے قلم سے

رابرٹ ہنری کیلفورڈ سوئم نے پہلی بار اپنی دوست لڑکی ہیلن کی زبانی ڈوگی مورٹیمر کے بازو کے بارے میں سنا تھا۔

رابرٹ کو کیمبرج چھوڑنے کا رنج تھا۔ اس نے ٹ جونز میں اپنے تین شان دار سال گزارے ۔ اس نے شکاگو یونیورسٹی سے اپنا انڈر گریجوشن کیا تھا وہاں اس نے پڑھائی میں اتنی محنت نہیں جتنی محنت اس نے کشتی رانی کی مشق میں کی تھی۔ کشتی رانی میں پہلے بھی کئی امریکی نام پیدا کر چکے تھے لیکن کیمبرج ایٹ کو مسلسل تین برسوں تک فاتح بنانے کا کام بلاشبہ ایک منفرد کارنامہ تھا جو اس نے انجام دیا تھا۔

رابرٹ ہنری دوم ہر بار ان ریسوں کو دیکھنے انگلینڈ آتا تھا جس میں اس کا بیٹا حصہ لیتا تھا جب تیسری بار بھی اس کے بیٹے نے کیمبرج کو جتوایا تو اس نے ہدایت کی تھی کہ امریکا واپس ہونے سے قبل وہ

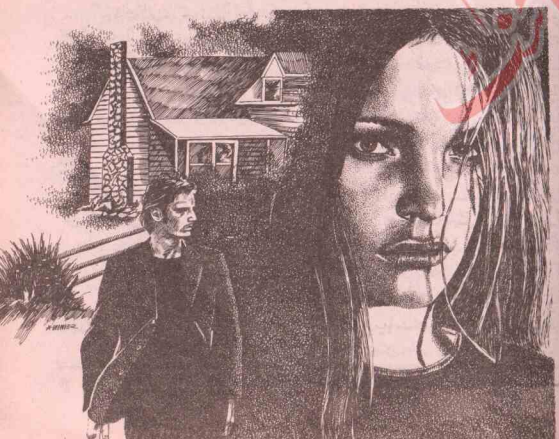

یونیورسٹی بوٹ کلب کو کوئی ایسا تحفہ ضرور دے جو ایک یادگار رہے۔

"دیکھو مسٹر ہنری!" دوم نے کہا۔ "یہ تحفہ نمائشی نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایسا ہونا چاہیے جس سے اندازہ ہو کہ تم نے کوئی تاریخی چیز پیش کی ہے۔ زور اس کے مہنگے ہونے پر نہیں بلکہ اس کی اندرونی قدر و قیمت پر ہونا چاہیے برطانوی لوگ ایسی ہی چیز پسند کرتے ہیں۔"

رابرٹ نے کافی وقت باپ کے الفاظ پر سوچتے گزارا مگر وہ کسی معقول آئیڈیے تک نہ پہنچ سکا۔ ویسے کیمبرج کلب کے پاس اتنے بہت سے سلور کپ تھے وہ ان کی نمائش تک نہیں کر پاتے تھے۔

یہ اتوار کا دن تھا جب ہیلن کے منہ سے اس نے پہلی بار ڈوگی مورٹیمز کا نام سنا۔

ہیلن نے صرف مذاق میں اس کے بازو کو ٹٹولا تھا جسے وہ ایک سرسری حرکت سمجھا تھا پھر اس کے طنزیہ جملے پر ہیلن نے کہا تھا۔ "میں تو دیکھ رہی تھی کیا تمہارا بازو بھی ڈوگی مورٹیمز کی مانند تنومند ہے۔"

"اچھا تو تم مردوں کے بازو تولتی رہتی ہو۔"، اس نے طنز کیا تھا۔

"یہ بات نہیں۔" میں نے تو ڈوگی کے بازو کو چھوا تک نہیں البتہ دور سے دیکھا ضرور ہے۔" ہیلن نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور یہ دید کہاں ہوئی تھی؟"

"یہ بازو میں نے اس بار میں جڑا دیکھا تھا جہاں میرے فادر اکثر جاتے تھے۔ ہل کے علاقے میں۔"

"خوب تو اس غریب کا بازو جڑا ہوا تھا اور اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔"

"اسے کیا تکلیف ہوتی۔" ہیلن نے کہا۔ "اسے تو مرے ہوئے بھی ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔"

"اور اس کا بازو وہاں لٹکا ہوا ہے اس میں سے کوئی بو وغیرہ نہیں اٹھی۔"

"ارے بھئی یہ دراصل اس کے بازو کا ایک کاسٹ ہے۔" ہیلن نے ہنس کر کہا۔ "تم بالکل بدھو ہو۔ یہ کانسی کا کاسٹ ہے۔ پرانے وقت میں وہ لوگ جو یونیورسٹی کی ٹیم میں مسلسل تین بار شرکت کرتے تھے ان کے دائیں بازو کی ایک برونز کاسٹ بنوا کر کلب ہاؤس میں آویزاں کرنے کا رواج تھا۔

"اچھا اور یہ ڈوگی کس طرف تھا۔" رابرٹ نے پوچھا۔

"کیمبرج کی طرف یا آکسفورڈ کی طرف؟"

"یہ نہیں معلوم۔"

"تم ذرا مجھے اس بار کا پتا بتاؤ۔"

"اسے کنگ ولیم کہا جاتا ہے۔" ہیلن نے کہا "یہ ہل کے علاقے میں ہے"

☆☆☆

ہیلن کے جانے کے بعد دوپہر میں رابرٹ نے اپنی الماری میں رکھی کتابوں میں سے ایک کتاب ڈھونڈنی شروع کی جس پر نیلا کور تھا۔ بالآخر وہ مل گئی۔ اس کا نام تھا۔۔۔ "ہسٹری آف دی بوٹ ریس" اس نے انڈیکس پر نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ ایک نہیں سات عدد مورٹیمر درج ہیں ان میں سے پانچ آکسفورڈ کے تھے اور دو کیمبرج کے۔ اس نے پورے نام دیکھے تو بالآخر ڈی جی ٹی مورٹیمر پر پلٹا جس کے آگے بریکٹ میں ہیر دا اینڈ سینٹ کیتھرائن کیٹب لکھا ہوا تھا۔ اسی کی نظر صفحہ ۱۲۹ پر تھی۔ اس نے وہ صفحہ کھولا یہاں پورا نام لکھا تھا۔ ڈگلس جان ٹاؤن سینڈ سینٹ کیتھرائن کیمبرج ۱۹۰۷ء۔ آٹھ، نو اسٹروکس۔ پھر اس نے مورٹیمر کی کشتی رانی کی مختصر تفصیل دیکھی۔

ڈوگی مورٹیمر نے کیمبرج بوٹ کو اسٹروک کرتے ہوئے ۱۹۰۷ء میں فتح دلائی اس نے ۱۹۰۸ء میں یہی کارنامہ دوہرایا۔ لیکن ۱۹۰۹ء میں جبکہ کیمبرج کے پاس کشتی رانوں کی بہترین ٹیم تھی وہ آکسفورڈ سے ہار گئی۔ یہ کیسے ہوا۔ اس پر اخباروں نے بہت لکھا تھا مگر یہ بات بہرحال معما ہی رہی۔ مورٹیمر کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

رابرٹ نے کتاب بند کر کے شیلف میں لگا دی اور اندازے سے سوچا کہ غالباً یہ عظیم چتوار بردار پہلی جنگ عظیم میں ہلاک ہو گیا ہوگا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اگر وہ مورٹیمر کا داہنا بازو کسی طرح حاصل کر کے کلب کے ہونے والے سالانہ بلیوز ڈنر کیمبرج پہنچا دے تو یقیناً ایک ایسا تحفہ ہوگا اس کے باپ نے جس کی خواہش کی تھی۔

اس نے جلدی سے کپڑے پہنے اور راہ داری میں لگے فون کی سمت لپکا۔ انکوائری سے اسے اپنے کام کے چار عدد نمبر ملے پھر وہ ابتدائی مشکل کو سلجھانے کے لیے وہیں جم گیا۔

دراصل اسے چار عدد نمبر ملے تھے۔ تین تو کنگ ولیم نامی جگہوں کے تھے اور یہ سارے شراب خانے اتفاق سے ہل کے علاقے میں تھے پہلی کال کر کے اس نے سوال کیا، "کیا تمہارے ہاں ڈوگی مورٹیمر کا دایاں بازو آویزاں ہے۔" اسے نفی میں جواب ملا۔ دوسری کال ایک لڑکی نے وصول کی۔

"تمہارا مطلب اسی کانسی کاسٹ سے ہے جو کاؤنٹر کے اوپر دیوار میں لگا ہوا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔"

"ہاں یہ ہی ہمارا باپ ہے۔"

رابرٹ کے اس پیب کا پتا معلوم کیا۔ پھر اس کے کھلنے کے اوقات معلوم کیے۔ تیسری کال پر بتایا گیا کہ پیٹر برو جانے والی ٹرین تین بج کر سترہ منٹ پر پکڑتی ہے۔ پیٹر برو پر اسے گاڑی بدلنی تھی اور ڈون کاسٹر والی گاڑی میں بیٹھنا ہوگا۔ اس کے بعد ایک گاڑی اور بدلنی تھی۔ پھر وہ ہل کے علاقے میں کوئی ۶۳۵ پر پہنچے گا۔"

"اور واپسی کے لیے آخری ٹرین کب ملے گی؟"

"آٹھ بج کر باون منٹ پر ڈلان کاسٹر اور پیٹر برو پر گاڑی بدلنی ہو گی کیمبرج تک تم کوئی آدھی رات کو پہنچو گے۔"

"شکریہ۔" رابرٹ نے کہا۔ "پھر وہ ٹہلتا ہوا ولیج کی طرف چل دیا وہاں اسے کھانا کھانا تھا۔ اسی سہ پہر کو اس نے پیٹر برو کی ٹرین پکڑی۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ وہ یہ کاسٹ اس کے مالک سے کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ پیٹر برو پر وہ اتر گیا دوسری ٹرین پر بیٹھتے ہوئے بھی وہ فکر میں تھا۔ معاملہ ایک تاریخی یادگار کا تھا۔ جب وہ ہل کے علاقے میں اترا تو اس کے پاس کوئی مناسب ترکیب نہیں تھی۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور اس سے کنگ ولیم بار میں چلنے کے لیے کہا۔

"کون سا بار۔۔۔ مارکیٹ پلس یا پری اسٹریٹ۔"

"اوہ۔۔۔ پری اسٹریٹ۔"

"لیکن وہ تو سات کے بعد کھلتا ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"میں رک کر انتظار کر لوں گا۔"

رابرٹ کو بیس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہ ٹہلتا ہوا

جنگل کا بادشاہ

جنگل میں شیر نے جست لگا کر بندر کو دبوچ لیا اور اس سے پوچھا۔ "بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے؟"

"حضور آپ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔" بندر کے جواب پر شیر نے اسے چھوڑ دیا۔

پھر ایک زیبرا نظر آیا۔ شیر نے جھپٹ کر اس کی گردن میں پنجے گاڑ دیئے اور وہی سوال کیا۔

زیبرے کا بھی وہی جوب تھا۔ شیر نے خوش ہو کر زیبرے کو بھی چھوڑ دیا۔ پھر شیر کی ملاقات ہاتھی سے ہوئی۔ ہاتھی سے بھی وہی سوال کیا۔ "بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے، تم یا میں؟"

ہاتھی نے کوئی جواب دیے بغیر شیر کو سونڈ میں لپیٹا اور ہوا میں اچھال دیا۔ شیر صاحب پچاس گز دور گرے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور یہ کہہ کر مخالف سمت میں چل پڑا۔

"جس بیوقوف کو جواب کا ہی پتا نہیں، اس سے الجھنا بے کار ہے۔"

بار کے عقب میں گیا جدھر ایک چوڑی سی گلی تھی جس میں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے انہوں نے دو مکانوں کے سامنے کی دیواروں کو "گول" کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ان کی شاٹیں اتنی ماہرانہ ہیں کہ دیوار کے سوا کھڑکی سے نہیں ٹکراتیں۔ وہ انہیں دیکھنے میں غرق ہوا تو وقت کا پتا ہی نہ چلا جب وہ لوٹا تو سات سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ تقریباً خالی بار میں ٹہلتا ہوا داخل ہوا۔ اسے امید تھی کہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔ مگر وہ کوئی ایسی چیز نہ تھا۔ چھ فٹ قد اور چہرہ پر ڈیل برسٹ کا نیلا ربن، بھوری پتلون، نیلی قمیص اور کالج ٹائی۔۔۔ بار کے عقب میں موجود تینوں افراد نے اسے گھورا۔ اس نے رک کر بار پر نگاہ ڈالی تبھی ایک نوجوان بار میڈ نظر آئی۔ اس نے پوچھا اس کے لیے کیا لائے۔

"آدھی بوتل تلخی۔" رابرٹ نے بے تکلفی کی تھی، بنانے کے لیے کہا۔ انگریز ایسے ہی جملے بولتے تھے۔ لینڈ لارڈ نے اسے شبہ سے دیکھا اور گلاس بنا دیا۔ رابرٹ نے گلاس لے لیا اور گوشے میں پڑی ایک گول میز پر جا بیٹھا۔ جس وقت دو اور گاہک اندر آئے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم اب لینڈ لارڈ کی ساری توجہ اس کی طرف نہیں پہنچنے والی تھی۔

رابرٹ نے گلاس میں بھرے ہوئے سیال کو گھونٹ بھرا اور بڑی مشکل سے کھانسی روکی۔ آنسو بھری آنکھوں سے اس نے دیوار کو دیکھا وہاں ایک بازو کا بھاری بھرکم برونز کاسٹ ایک وارنش کی ہوئی لکڑی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اسے اپنے اندر ہیجان کا احساس ہوا۔ اسے یہ کاسٹ دہشت خیز لگ رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں اس کے نیچے لکھی تحریر پر جا پہنچی جو سنہری تھی

ڈی جے ٹی مورٹیمر

۰۹-۰۸-۱۹۰۷ء

سینٹ کیتھرائن۔ اسٹروک۔

رابرٹ نے اپنی نظریں لینڈ لارڈ پر ہی رکھیں۔ بار آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ اس نے نوٹ کیا کہ سروس کا زیادہ تر کام عورت کر رہی تھی جسے سب نور کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

یہ لینڈ لارڈ کی بیوی تھی۔

اپنا گلاس خالی کر کے رابرٹ اس عورت کی طرف بڑھا جو اس وقت بار کے دوسرے سرے پر تھی۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں لڑکے!" اس نے پوچھا۔

"وہ ایک گلاس اور۔۔۔"

گلاس بھرتے ہوئے عورت نے پوچھا۔ "امریکی۔"

اس میں نے گلاس دیتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ "ادھر کیسے آئے؟"

"تمہاری وجہ سے۔" رابرٹ نے جواباً کہا۔

کورا کے چہرے پر شبہ ابھرا یہ لڑکا خاصہ کم عمر تھا اس کے بیٹے کی عمر کا۔

رابرٹ مسکرایا۔ "یا یوں کہو ڈوگی مورٹیمر کی وجہ سے۔"

"اچھا۔۔۔ میں سمجھی۔۔۔" کورا نے کہا۔ "تم نے ہی آج صبح فون کیا تھا کیوں۔ میری کرسٹی نے مجھے بتایا تھا۔"

رابرٹ نے سر ہلایا۔ "یہ بازو ہل کے علاقے میں کیسے آیا۔" اس نے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" کورا نے کہا۔ "یہ میرے دادا کا کام تھا انہیں مچھلیاں پکڑنے کا شوق تھا اور وہ کیم جایا کرتے تھے جس سال انہیں یہ بازو ملا ان کا کہنا تھا کہ ان کے جال میں اس سال یہی مچھلی ہاتھ آئی تھی۔ مرنے سے کچھ پہلے دادا اسے کباڑی کو فروخت کرنے والے تھے مگر میں نے بچا لیا تھا اور یہ تب سے یہاں لٹکا ہوا۔ صفائی اور پالش سے یہ خاصا نکھر گیا تھا۔ حد ہو گئی صرف اسے دیکھنے اتنا بڑا سفر کر کے آئے ہو۔"

رابرٹ نے بازو کی سمت دیکھا اور تحسینی آواز میں بولا۔

"ہاں میں اسے دیکھنے آیا ہوں۔" کہتے ہوئے اس نے عورت کو دیکھا اور بولا۔ "میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔"

"اے کورا کیا کر رہی ہے وہاں؟" لینڈ لارڈ کی پکار سنائی دی۔

"لوگ سروس کے منتظر ہیں۔"

کورا عجلت سے گھومی اور زور سے بولی۔ "شور مچانے کی ضرورت نہیں یہ لڑکا دور سے آیا ہے صرف مورٹیمر کا بازو دیکھنے۔ یہ اسے خریدنا چاہتا ہے۔" کورا کی باتوں نے فضا میں مزاح بکھیر دیا کچھ لوگ ہنس پڑے۔

"پھر تو یہ بلاوجہ آیا۔" لینڈ لارڈ نے کہا۔ "یہ بیچنے کے لیے نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا نہیں ہے۔" کورا نے گھر کا۔ "تم تو چپ ہی رہو۔" پھر وہ رابرٹ کی طرف گھومی۔ "یہ اکاؤ نہیں۔ میں اسے سو پونڈ سے کم میں نہیں بیچوں گی۔"

ان کی باتوں میں لوگوں نے دلچسپی لینی شروع کر دی۔

"اور اگر میں اس کے لیے دو سو پاؤنڈ دوں تو۔۔۔" رابرٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

کورا ہنسی۔ "کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟"

"بالکل۔" رابرٹ نے کہا۔ "میں اسے کیمبرج پہنچانا چاہتا ہوں جو اس کی اصل جگہ ہے۔ میں اس کے عوض تمہیں دو سو پاؤنڈ دوں گا۔" لینڈ لارڈ نے بیوی کی سمت دیکھا۔ پھر بولی۔ "اس سے تو ہم ایک سیکنڈ ہینڈ کار لے سکتے ہیں۔"

"نہیں، میں ایک سمر کوٹ چاہتی ہوں۔" کورا نے کہا۔ اس کی نظریں رابرٹ پر تھیں کہ کہیں یہ لڑکا مکر نہ جائے۔

"تو پھر کیا میں سمجھوں کہ سودا طے ہو گیا۔" رابرٹ نے پوچھا۔

اس نے اسی وقت ایک چیک کاٹا اور کورا کو دیا تو کورا نے کہا۔ "جب تک چیک کیش نہیں ہوتا تمہیں کاسٹ نہیں ملے گا۔"

وہ رات رابرٹ کو وہیں ایک ہوٹل میں گزارنی پڑی۔ دوسرے دن جب مقامی بینک کے منیجر نے چیک کنفرم کر دیا۔ تو اسے مورٹیمر کا بازو مل گیا۔

رابرٹ اس خزانے کو لے کر دوسری صبح کیمبرج کے لیے چلا۔ پھر اسے گھر لا کر اس نے بستر تلے چھپا دیا۔ دوسرے روز اس نے ایک مقامی فرنیچر ساز کے حوالے کر دیا تا کہ وہ اسے چمکا دمکا کر سابقہ حالات میں لے آئے۔ آخر اسے بلیوز ڈنر کی رات میں پیش کیا جانا تھا

☆☆☆

کچھ دنوں بعد جب فرنیچر ساز نے اسے دکھایا تو خود اس نے اپنی کوشش پر اپنی پیٹھ ٹھونکی۔ وہ واقعی کیمبرج کو بطور تحفہ دیے جانے کے لائق ہو گیا تھا۔ اسے بہرحال راز رکھا گیا۔ اس نے ہیلن کو بھی نہیں بتایا۔ اسے اب بلیوز ڈنر کی رات کا انتظار تھا۔ البتہ اس نے کلب کے صدر کو اشارہ دیا تھا کہ وہ کلب کو کوئی یادگار تحفہ دینے والا ہے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے لیے دو ہک درکار ہوں گے آٹھ انچ کے فاصلوں والے اور انہیں فرش سے کوئی آٹھ فٹ اوپر دیوار پر نصب کیا جانا ہوگا۔

یونیورسٹی بلیوز ڈنر ایک سالانہ تقریب تھی جو اس بوٹ ہاؤس میں منعقد ہوتی ہے جو کیم دریا کے کنارے بنا ہوا ہے۔ اس کشتی رانی میں حصہ لینے والا کوئی بھی بلیو حصہ لینے کا اہل ہوتا ہے۔ اس رات جب رابرٹ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں بہت سے مہمان موجود ہیں۔ اس نے براؤن پیپر میں اچھی طرح لپٹے ہوئے اپنے تحفے کو گدی تلے رکھ دیا پھر اس نے اپنا کیمرا نکالا اور اسے سامنے میز پر رکھ دیا۔

چونکہ یہ اس کا آخری بلیو ڈنر تھا اس کے بعد اسے امریکا پلٹ جانا تھا۔ اسے سب سے اونچی میز پر بٹھایا گیا تھا۔ اعزازی سکریٹری اور موجودہ صدر کے درمیان۔ ٹام آدم جو اعزازی سکریٹری تھا آج سے

بیس سال قبل بلیوز میں ہوا کرتا تھا۔ وہ کلب کا ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھا اس قدر معلومات اسے کشتی رانی کے بارے میں تھیں کہ بس۔ اس وقت وہ کمرے میں موجود تقریباً ہر بلیو کو شناخت کر سکتا تھا۔ یہی نہیں اسے تمام سابقہ عظیم چپوار کاروں کے نام معلوم تھے۔

ٹام نے کمرے میں موجود تمام افراد کو رابرٹ سے روشناس کرایا۔ اس میں تین ایسے افراد بھی تھے جو اولمپک کے تمغہ یافتہ تھے۔ ان میں سب سے پرانا آدمی صدر کے دائیں جانب موجود ہے، اس نے رابرٹ کو بتایا۔ اس کا نام فارسٹر چارلس ہے۔ کلب کے لیے یہ ۱۹۰۸ء میں اور ۱۹۰۹ء میں چپوار برادری میں تیسرے نمبر پر تھا۔ میرا خیال ہے اسی وقت اس کی عمر اسی سال سے اوپر ہے۔

"اچھا، رابرٹ نے پوچھا اور کلب کی دیوار پر لگی اس تصویر کو یاد کرنے لگا جو فارسٹر کی جوانی کی تھی۔ کتنا بڑا فرق تھا دونوں میں۔"

"کیوں نہیں حضرت۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔ "گھبراؤ نہیں ایک دن تم بھی اسی کی طرح ہو جاؤ گے۔"

"اور وہ کون ہے۔" اس نے پوچھا۔ "وہ جو میز کی آخری کونے پر بیٹھا ہے۔ وہ تو اس سے بھی بڑی عمر کا لگتا ہے۔"

"وہ۔۔۔؟" سیکریٹری نے کہا۔ "وہ فرینک ہے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۵ء تک ہی کلب کا پاسبان رہا تھا۔ یہ اپنے چچا کی جگہ آیا تھا۔"

"پھر تو اسے ڈوگی مورٹیمر کے بارے میں ضرور معلوم ہوگا۔"

سیکریٹری نے کہا۔ "اس بار تم نے ماضی کا ایک عظیم نام لیا ہے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۰۹ء سینٹ کیتھرائن، اسٹروک، فسک یقیناً مورٹیمر کو جانتا ہوگا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ یہ چارلس فاسٹر بھی اسی کشتی میں تھا جس میں مورٹیمر اسٹروک ہوا کرتا تھا۔"

کھانے کے درمیان بھی گاہے بگاہے رابرٹ سیکریٹری سے مورٹیمر کے بارے میں پوچھتا رہا۔ لیکن سیکریٹری بھی ان معلومات میں اضافہ نہ کر سکا جو اسے کتاب سے ملی تھیں۔ سیکریٹری نے ۱۹۰۹ء میں کیمبرج کی شکست کو ایک حیرت ناک اور پراسرار واقعہ قرار دیا کیونکہ اس وقت کیمبرج کی ٹیم میں اس وقت کے بہترین کھیوے تھے ان کا ہار جانے بے حد حیرت ناک تھا۔

کھانے کے بعد کلب کے صدر نے تقریر شروع کی۔ اس دوران تالیاں بجتی رہیں۔ پھر جب بھی آکسفورڈ کا نام آیا انہوں نے اپنی برتری کا نعرہ لگایا۔ آخر میں صدر نے اعلان کیا کہ اس سال یونیورسٹی سے رخصت ہونے والے ایک امریکی طالب علم مسٹر رابرٹ ہنری کلفورڈ نے اعلان کیا ہے کہ وہ کلب کو ایک یادگار تحفہ دیں گے۔

اس موقع پر نئے لڑکوں نے اپنے ہیرو کو شور مچا کر تحسین پیش کی۔

پھر رابرٹ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے تقریر شروع کی تو شور تھم گیا۔ اس نے تقریر میں بتایا کہ اسے کس طرح ٹیم کے ایک سابقہ ہیرو کے دائیں بازو کی کاسٹ کا علم ہوا اور اسے اس نے کس طرح حاصل کیا بے شک اس نے نیچے سے کئی باتیں حذف کر دی تھیں یہی کہ اس نے اسے کہاں سے اور کتنی قیمت میں حاصل کیا تھا۔

پھر اس نے ڈرامائی انداز میں میز تلے سے وہ کاسٹ نکالی تھی اور اسے حاضرین کے لیے لہرایا تھا۔ اس موقع پر تمام حاضرین کرسی سے اٹھ گئے۔ لیکن یہاں کا بہت پرانا ممبر فاسٹر چارلس اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ شاید اسے یہ تحسینی شور اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر رابرٹ نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اور شخص بھی اسی کی طرح اپنی نشست پر بیٹھا ہوا ہے اور یہ کلب کا بوڑھا پاسبان سڈنی فسک تھا۔ وہ اپنے بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

رابرٹ کے ذہن سے یہ دونوں اس وقت نکل گئے جب کلب کے صدر نے ٹام آدم کی مدد سے کانسی

کی ایک کاسٹ کو خود دیوار پر لگے ہک کے ساتھ آویزاں کیا۔ رابرٹ نے اس کے فوٹو عجلت سے اتارے تاکہ وہ انہیں اپنے باپ کو دکھا سکے۔

اس کے لیے تالیوں کی گونج میں اسے زبردست مبارک باد دی گئی۔ رابرٹ کو احساس ہوا کہ اس کی محنت رائگاں نہیں گئی ہے۔

اس رات کلب سے جانے والوں میں رابرٹ آخری آدمی تھا کیونکہ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اسے گھیر لیا تھا اندر سے الوداع کہہ رہے تھے۔

وہ رخصت ہو کر جب کلب سے گنگناتا ہوا نکلا تو اسے ایک دم سے خیال آیا کہ وہ اپنا کیمرا تو کلب کی میز پر ہی رکھ کر بھول آیا ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ صبح کو آ کر لے لے گا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اب کلب بند ہو گیا ہو گا۔ اس نے پلٹ کر نگاہ ڈالی تو اسے کلب کی عمارت میں روشنی نظر آئی۔ وہ دوبارہ پلٹ پڑا۔

وہ کیمرا لینے کے لیے کانفرنس روم کی طرف چلا جس وقت وہ اس کی کھڑکی کے پاس پہنچا تو اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اسے روم میں دو افراد نظر آئے۔ اسے تعجب ہوا کہ یہ دونوں سابقہ بلیوز چارلس فاسٹر اور سابقہ پاسبان فسک تھے۔ دونوں بوڑھے اس وقت میز کو دیوار کے ساتھ لگانے کے لیے اسے کھسکا رہے تھے۔ وہ شاید اندر جا کر ان کی مدد کرتا مگر اسی وقت فسک نے ہاتھ کے اشارے سے دیوار پر لگے ڈوگی مورٹیمر کے ہاتھ کی کاسٹ کے بارے میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور رابرٹ اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ انہوں نے اب میز دیوار کے ساتھ لگا دی تھی۔

پھر فارسٹر میز پر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے مورٹیمر کے بازو کے ہکوں کو دیوار سے الگ کیا اور اس کاسٹ کو آہستگی سے اتار لیا۔ اس نے جھک کر اسے نیچے کھڑے فسک کو تھمایا۔ پھر وہ خود نیچے اتر آیا۔

رابرٹ وہیں رکا اس عجیب منظر کو دیکھتا رہا۔ ان دونوں نے کانسی کے کاسٹ کو اٹھایا، بوٹ ہاؤس کے کمرے سے باہر چل دیے۔ یکا یک فارسٹر مڑا اس نے کمرے کی آخری بتی بھی بجھا دی باہر آ کر اس نے کلب کے مین گیٹ کو بند کر کے مقفل کر دیا۔

باہر نکل کر دونوں بوڑھوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں پھر وہ کاسٹ کو تھامے اس راستے پر چلے جو دریا کی طرف جاتا تھا۔ یہ ٹرافی وزنی تھی لہٰذا وہ دونوں باری باری لے کر چل رہے تھے۔ رابرٹ ان کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ راستے سے اِدھر اُدھر لگے پودوں کی اوٹ میں چل رہا تھا۔ پھر یہ دونوں دریا تک پہنچ گئے۔

وہاں ایک چھوٹی سی کشتی بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کاسٹ کو اسی میں رکھ دیا۔

پھر ان بوڑھے کشتی رانوں نے رسی کھولی۔ اسے مل کر پانی میں دھکیلا جب وہ کمر کمر پانی میں پہنچ گئے انہیں اس سے پروا نہ تھی کہ ان کا لباس بھیگ گیا ہے۔ اس کے بعد پرانا بلیو فارسٹر تو اچھل کر کشتی میں بیٹھ گیا البتہ بوٹ مین فسک ذرا دشواری سے اس میں پہنچ سکا۔

فارسٹر نے چپوار سنبھال لی جبکہ بوٹ مین ڈوگی مورٹیمر کے بازو کی کاسٹ کو دبائے ہوئے تھا۔

فارسٹر نے چپوؤں کو حرکت دی اور دریا کے وسطی حصے کی طرف چلا اس کے کھیلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اپنے کام سے بخوبی آشنا ہے۔ جب ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ وہ دریا کے گہرے حصے میں پہنچ گئے ہیں تو فاسٹر نے چپو روک دیے۔ پھر وہ اور فسک دونوں نے مل کر کانسی کی اس کاسٹ کو تھاما اور بلا کسی لمبی تمہید کے اسے کشتی سے باہر گہرے پانی میں پھینک دیا۔ دریا میں ایک چھپاکا ہوا۔ اس بار فسک نے چپو سنبھالے اور کشتی دوبارہ کنارے کی طرف چلا دی۔ کنارے پر پہنچ کر وہ کسی طرح کشتی سے اترے اور اسے کھینچ کھانچ کے ساحل کے ساتھ باندھ دیا۔

بھیگے اور تھکے ہوئے ان دونوں افراد نے ٹھہر کر رات کی کھلی ہوا میں کچھ دیر لمبے لمبے سانس لیے۔ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوئے تھے اس کے

بعدانہوں نے ہاتھ ملائے۔ان کا انداز ایسا تھا جیسے دو بزنس مین کسی ڈیل کے بعد ہاتھ ملاتے ہیں۔ پھر وہ رات کے اندھیرے میں کھو گئے۔

☆☆☆

ٹام آدم، نجی کلب کے سکریٹری نے دوسری صبح کو رابرٹ کو فون کیا اور بتایا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ رابرٹ نے توجہ سے سنا وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ بے حد حیرت کی بات ہے انہوں نے صرف تمہارا دیا ہوا بازو چرایا ہے اور بس۔ حالانکہ کلب میں خاصا قیمتی سامان بھی تھا۔''

''اچھا۔۔۔''

''مقامی پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں جس نے وہ کاسٹ چرایا ہے کہیں دور نکل چکا ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ پھر بولا۔ ''میں تم سے کلب کی تاریخ کے بارے میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو۔''

''کیا یہ بتا سکتے ہو کہ اس وقت آکسفورڈ سائیڈ کے کشتی رانوں میں سب سے معمر ترین فرد کون ہے۔'' دوسری طرف خاموشی رہی تو رابرٹ نے عجلت سے پوچھا۔

''مسٹر آدم آپ سن رہے ہیں نا؟''

''ہاں، ہاں میں ذرا یاد کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے ہیرالڈ ڈیرنگ ابھی زندہ ہے۔''

''ڈیرنگ۔''

''ہاں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک۔۔۔ آکسفورڈ کے کشتی رانوں میں اس وقت معمر ترین آدمی ہے۔ بعد میں وہ بشپ بن گیا تھا۔ آگے کا مجھے پتا نہیں، وہ کیبن میں تھا۔''

''شکریہ۔''

اس نے اسی روز کیبن کالج فون کیا اور پوچھا کہ ان کے پاس ایک مشہور پرانے طالب علم ڈیرنگ کا کوئی ریکارڈ ہے۔

''ڈیرنگ۔'' اسے آواز سنائی دی۔ ''ذرا ٹھہرو۔'' کچھ دیر بعد فون سے آواز آئی۔ ''کالج ہینڈ بک کے ڈیرنگ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک بی اے ۱۹۱۱ء میں ایم اے ۱۹۱۶ء میں ٹورور میں بشپ کے عہدے پر فائز ہوا۔''

رابرٹ نے موجودہ پتے کے بارے میں پوچھا۔ تو اسے اس کا پتا فوراً مل گیا۔ ''ریٹائرڈ روی رنڈ ہیرالڈ ڈیرنگ مل روڈ پر اسٹون ہاؤس نامی مکان میں قیام پذیر تھا۔ یہ علاقہ گلوسٹر شائر کا تھا۔ سہ پہر کو رابرٹ نے اس کے نام ایک خط لکھا۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ سابق بلیو اس سے ملاقات پر تیار ہو جائے۔ اسے بہت خوشی ہوئی جب تیسرے ہی روز اسے فون ملا۔ یہ کسی مسز ایلیٹ کی طرف سے تھا جو ہیرالڈ ڈیرنگ کی بیٹی تھی ڈیرنگ اسی کے ساتھ رہ رہا تھا۔

''والد کی نگاہ بہت کمزور ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں نے تمہارا خط انہیں سنایا تھا وہ تم سے ملنے پر راضی ہیں۔ اتوار کو دن ساڑھے گیارہ بجے آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

''والد لنچ کے بعد سونے کے عادی ہیں۔'' عورت نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اتوار کی صبح کو رابرٹ نے ایک کار کرائے پر لی۔ وہ بشپ کے علاقے میں گیارہ کے بعد پہنچا۔ مسز ایلٹ کی ہدایت عمدہ تھی۔ اسے گھر مل گیا۔

دروازہ ایک عورت نے کھولا اور بولی۔ ''شاید تم مسٹر رابرٹ ہو۔ میں سوین ایلیٹ ہوں۔''

رابرٹ نے اسے تعظیم دی وہ اسے ساتھ لے کر اندر چلی اس نے چلتے ہوئے کہا۔ ''والد کی سماعت بھی کمزور ہے ذرا بلند آواز سے بولنا۔''

''مجھے افسوس ہے مسز ایلیٹ میں آپ کے لیے زحمت کا باعث بن رہا ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' عورت نے کہا۔

''جب سے والد نے سنا ہے کہ کیمبرج کا ایک مشہور بلیو ان سے ملنے آ رہا ہے۔ وہ بہت خوش ہیں۔ وہ سوچ رہے ہیں آخر تم کیوں آ رہے ہو۔''

ڈرائنگ روم میں ڈیرنگ موجود تھا۔ وہ ایک گرم گاؤن میں تھا۔ لیدر چیئر پر اس کے پیروں پر کمبل پڑا تھا۔

اس کمزور سے شخص کو دیکھ کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کبھی ایک اولمپک اورس مین (Olympic Oarsman) رہا ہوگا.

''اچھا تو تم ہو رابرٹ ہنری کلفورڈ۔'' رابرٹ نے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا. ڈیرنگ کی انگلیاں ہڈیاں بن چکی تھیں.

''لڑکے تم آئے۔ میں شکر گزار ہوں۔'' بوڑھے اورس مین نے کہا.

''شکر گزار تو میں ہوں کہ آپ نے ملنے کی اجازت دی۔'' رابرٹ نے کہا.

مسز ایلٹ نے اسے بٹھایا اور پوچھا۔ ''چائے لاؤں۔''

''نہیں شکریہ۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''دیکھو لڑکے! میں پہلے ہی بتا دوں کہ میں زیادہ ارتکاز نہیں کر پاتا۔ مجھے سیدھے انداز میں بتا دو کہ تم کیوں آئے ہو۔''

رابرٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں کیمبرج کے ایک پرانے بلیو پر ریسرچ کر رہا ہوں جس نے آپ کے زمانے میں کشتی رانی کے مقابلوں میں شرکت کی تھی۔''

''کون ہے وہ۔''

''مورٹیمر۔۔۔ ڈوگی مورٹیمر۔''

''اچھا جے ڈی مورٹیمر۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اسے میں جانتا ہوں۔ کیمبرج میں اس جیسا اسٹروں کم ہی پیدا ہوا ہوگا۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''کیا تم جرنلسٹ ہو؟''

''نہیں میں امریکا واپس جا رہا ہوں اور مورٹیمر کے بارے میں چند باتیں جاننا چاہتا ہوں۔''

''مثلاً۔۔۔؟'' بوڑھے نے سوال کیا۔

''کچھ معلوم ہے اس کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟''

بوڑھے نے سوچا اور کہا۔ ''اس نے خودکشی کر لی تھی حالانکہ اس کا جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک حماقت تھی۔''

''اچھا تو اس نے کوئی جرم بھی کیا تھا۔''

''کہا نہیں جا سکتا۔'' معمر آدمی نے کہا۔ جواب خاصا گول مول سا تھا۔''

''اور کیا یہ ۱۹۰۹ء کی ریس کی کوئی خاص بات تھی جس سے کیمبرج کو شکست ہوگئی تھی حالانکہ ان کی ٹیم بہت مضبوط تھی۔''

''بہت ممکن ہے کہ اس کا تعلق اس ریس سے رہا ہو۔'' ڈیرنگ نے کہا۔

''میں نے اس ریس میں خود بھی حصہ لیا تھا۔'' رک کر اس نے چند سانس بھرے۔ ''سبھی یہی کہہ رہے تھے کہ یہ ریس صرف کیمبرج ہی جیتے گی۔ مگر نتائج دوسرے نکلے تھے۔ وضاحت کسی کے پاس نہ تھی۔ افواہیں ضرور پھیلی تھیں۔ مگر ثبوت کسی کو نہیں ملا تھا۔''

''کس چیز کا ثبوت۔'' رابرٹ نے پوچھا۔

معمر کشتی راں پھر سوچ میں چلا گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''کلفورڈ پہلے تم ایک بات کا جواب دو۔''

''جی۔''

''میری بیٹی نے مجھے بتایا ہے کہ تم پچھلے تین سال سے مسلسل جیتنے والے کیمبرج بوٹ کے اسٹروک رہے ہو۔''

''جی یہ ٹھیک ہے۔'' رابرٹ نے حیرانی سے کہا

''مبارک باد میرے بچے! مگر ذرا مجھے یہ بتاؤ۔ فرض کرو تم چاہتے ہو کہ تمہاری ٹیم ہار جائے تو کیا تم اس سلسلے میں کوئی ایسی حرکت کر سکتے ہو جس سے تمہارا مقصد بھی حل ہو جائے اور کسی کو کچھ پتا بھی نہ چلے۔''

اب رابرٹ کی باری تھی کہ سوچے۔ اس نے غور کیا اس کے سامنے موجود نحیف سا آدمی بلاشبہ عمدہ ذہن کا آدمی لگتا تھا۔

بالآخر اس نے کہا۔ ''ایسا ممکن ہے سر۔۔۔! کسی کے علم میں آئے بغیر اسٹروک ریٹ کو بدلا جا سکتا ہے۔ دریا میں ویسے بھی متعدد اشیا کی موجودگی سے اسٹروک کی رفتار میں فرق پڑتا رہتا ہے۔''

رابرٹ نے غور سے معمر آدمی کو دیکھا۔ ''لیکن میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا سر۔۔۔! ایسی حرکت کوئی جان بوجھ کر ہرگز نہیں کرسکتا۔''

''میرا خیال بھی یہی تھا۔'' ڈیرنگ نے کہا۔ ''اگر میری بات ان کے cox (صدر ملاح) سے نہ ہوئی ہوتی۔''

''میں سمجھا نہیں سر!''

''میں بتاتا ہوں۔'' معمر کشتی راں نے کہا۔ ''1909ء کیمبرج بوٹ کے Cox کے نام برنی پارٹ رج تھا۔ بعد میں وہ پادری بن گیا تھا۔ جب میں ٹورہ ورکا بشپ بنا تو برنی نے مجھے مدعو کیا تھا۔ کافی تکلیف دہ سفر تھا مگر میں اس کے علاقے میں گیا تھا۔ دراصل میں خود بھی 1909ء کی ریس کے اسرار کی تہہ تک پہنچنے کا خواہش مند تھا اور اس سلسلے میں برنی سے بات کرنا چاہتا تھا۔

رابرٹ خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ معمر ڈیرنگ کے خیالات کا سلسلہ بکھرے۔

''برنی ایک کنوارا آدمی تھا۔ کنوارے لوگ بات نہیں کرتے ہیں کیونکہ وہ اکیلے رہتے ہیں میں اس کے ساتھ رات بھر کے لیے رکا تھا۔ اس کا ذکر چلا تو اس نے بتایا کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مورٹیمر پر بہت سا قرض لد گیا تھا۔ اس نے کئی افراد سے قرض لیا تھا۔ اس میں واپس کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کی شہرت کے تحت اس کے قرض خواہ اس کا قرض معاف کردیں گے مگر۔۔۔ مورٹیمر کے ایک قرض خواہ نے جسے کشتی رانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ وہ کسی کو ہیرو وغیرہ سمجھتا تھا۔ اس پر مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دی تھی کہ وہ 1909ء کی ریس سے قبل اس کی رقم واپس کردے۔ ریس میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ بعد میں کیمبرج کی ٹیم کو اس ریس میں شکست ہوگئی تھی۔ ادھر یہ دیکھا گیا کہ مورٹیمر جو قرضوں میں دھنسا ہوا تھا اچانک قرضوں سے آزاد ہوگیا تھا۔ یہ کس طرح ہوا۔ اس کی کوئی معقول وضاحت سامنے نہ تھی۔ پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی تھی۔''

ایک بار پھر بوڑھا ڈیرنگ سانس لینے کے لیے رکا۔

''ہاں ایک بات اور یاد آئی کہ سٹے باز کے کئی افراد نے اس ریس سے بہت سا مال بنایا تھا۔''

ڈیرنگ نے کہا۔ ''خود میں نے اپنے ایک عزیز سے یہی بات کہی تھی کہ جیت کیمبرج ہی کی ہوگی اور انہیں بعد میں سٹے کی وجہ سے اچھا خاصا نقصان ہوا تھا۔ وہ کیمبرج کی شکست پر بہت برہم تھے۔ وہ کوئی سو پونڈ ہار گئے تھے اور آخر تک مجھے غلط مشورہ دینے کا الزام لگاتے رہے تھے۔''

رابرٹ حیرانی سے بوڑھے کی باتیں سن رہا تھا۔

''سر آپ نے جو کچھ بتایا میں اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''آپ اطمینان رکھیں آپ کی تمام باتیں مجھ تک محدود رہیں گی۔''

''شکریہ۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''کچھ اور۔۔۔''

''نہیں سر!'' رابرٹ نے کہا پھر وہ کرسی سے اٹھ گیا اس نے مسز ایلیٹ کا بھی شکریہ ادا کیا اور تبھی اسے پہلی بار ایک بازو کا برونز کاسٹ اس کی نگاہوں میں آیا جو سامنے کی دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے نیچے سنہرے حروف میں لکھا تھا۔

ایچ آر ڈیرنگ
1911ء-1910ء-1909ء
کیبل۔بو

''سر۔۔۔!'' اس نے معمر آدمی کو مخاطب کیا۔

''آپ ٹھیک اپنے زمانے کے بہترین کشتی ران رہے ہوں گے۔''

بوڑھے نے انکساری سے کہا۔ ''ارے نہیں میاں! البتہ میں ان خوش نصیبوں میں ضرور ہوں جو اس ٹیم میں تھے جس نے مسلسل تین برسوں تک فاتح رہنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ مگر یہ بات شاید تمہارے جیسے ''کیمبرج بلیو'' کو اچھی بہت لگے گی۔''

رابرٹ آہستہ سے ہنسا۔

''جانے سے قبل ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ضرور۔۔۔''

''کیا ڈوگی مورٹیمر کے بازو کا بھی کوئی کاسٹ بنوایا گیا تھا؟''

''ہاں۔۔۔ بالکل بنوایا گیا تھا۔'' معمر آدمی نے کہا۔ ''مگر سن 1911ء میں تمہارے بوٹ ہاؤس سے یہ کاسٹ پراسرار طور پر غائب ہوگیا تھا۔ پھر چند ہفتے بعد کلب کے بوٹ مین کو بغیر کوئی وجہ بتائے نوکری سے فارغ کردیا گیا تھا۔''

''کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''ہاں۔۔۔ مگر یہ بات پھیلی نہ تھی۔'' معمر کشتی راں نے کہا۔ ''مجھے برنی ہی سے معلوم ہوا تھا کہ ایک روز شراب کے نشے میں بوٹ مین نے اقرار کرلیا تھا کہ اس نے مورٹیمر کے بازو کی کاسٹ کو دیوار سے اتار کر دریائے کیم کے وسط میں پھینک دیا ہے۔''

رک کر بشپ مسکرایا۔ اور بولا۔ ''کیوں کلفورڈ تم بتاؤ اس جیسے بازو کے لیے کیا اس سے بھی زیادہ کوئی معقول جگہ ہوسکتی تھی؟''

رابرٹ نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد میرے باپ کا ردعمل کیا ہوتا۔ اس کے بعد اس نے خود بھی گمبھیر لہجے میں کہا۔

''بے شک جناب! آپ نے درست کہا۔ یہی جگہ بہترین تھی اس کے لیے۔''

پالتو بلی

زبیر (ندیم سے): ''ندیم یہ تم کیا کررہے ہو۔''

ندیم: ''میرا پالتو طوطا مرگیا ہے، اسے دفنا رہا ہوں۔''

زبیر: ''مگر یہ تو میری پالتو بلی ہے جسے تم گڑھے میں دبا رہے ہو۔''

زبیر (اطمینان سے): ''تم ٹھیک سمجھے ہو اس کے پیٹ میں میرا طوطا ہے۔''

☆☆☆

بال جادو کے

پہلا بچہ: ''میری امی کے بال لمبے اور کالے ہیں۔''

دوسرا بچہ: ''میری امی کے بال سنہرے ہیں۔''

تیسرا بچہ: ''میری امی کے بال بہت اچھے سیٹ کیے ہوئے ہیں۔''

چوتھا بچہ: ''میری امی کے بال جادو کے ہیں، دل چاہے تو سر پر سجالیتی ہیں اور اگر دل کرے تو ڈریسنگ ٹیبل پر۔''

☆☆☆

بال جادو کے

ماں اور بچہ بس میں سوار ہوئے۔ ماں نے اپنا ٹکٹ تو لے لیا۔

کنڈیکٹر نے بچے کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ ''بچے کا ٹکٹ بھی لیجیے محترمہ۔''

''مگر اس کی تو عمر تین سال ہے۔'' عورت نے کہا۔

''مجھے تو یہ پانچ سال کا نظر آرہا ہے۔''

ماں کو بڑا طیش آیا اور بولی۔ ''بچہ میرا ہے، تم خوامخواہ ماں بننے کی کوشش نہ کرو۔''

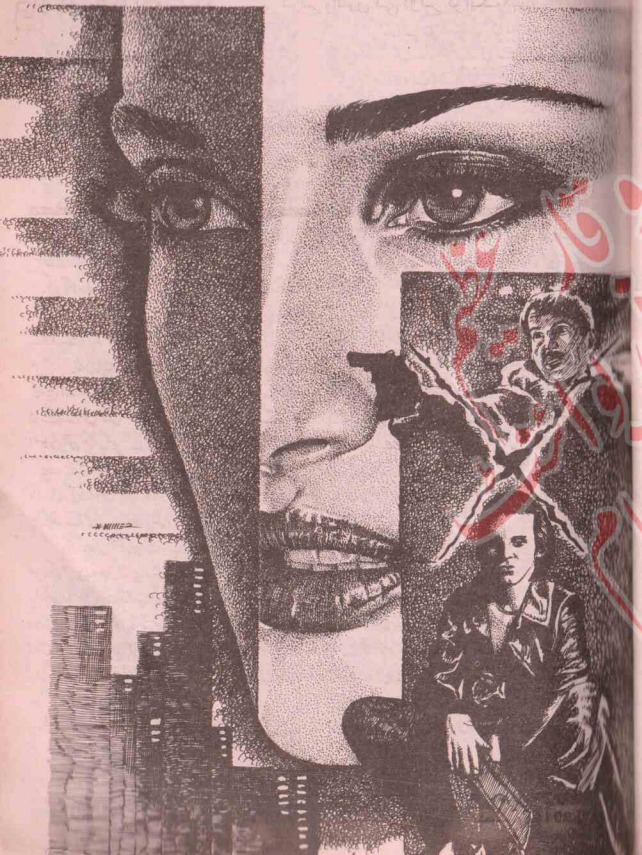

تاوان کلینک

خودکشی کرنے والوں کی آڑ لے کر ایک ذہین شخص نے قیمتی جواہرات اڑانے کا منصوبہ بنایا۔۔ لیکن قانون کا آہنی پنجہ بالآخر اس کی گردن کے گرد سخت ہوگیا

ایم الیاس

عمران ڈائجسٹ کا پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

سولہ اگست کا دن میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

جس وقت میں گھر جانے کے لیے اٹھا، رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ آج میں نے شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک کوئی چالیس کے لگ بھگ مریضوں کو دیکھا۔ میں نے ان تمام مریضوں کو بڑی عجلت اور رسمی انداز سے نمٹایا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو رات کے ہی نہیں بلکہ میرے بھی بارہ بج جاتے۔ اصولی طور پر یہ میرے پیشہ ورانہ طور پر غلط تھا کیوں کہ وہ میری منہ مانگی فیس دیتے تھے۔ لیکن اب اس ملک میں کون سا اصول اور قانون تھا۔ یہاں سب چلتا تھا اور چل رہا تھا اور چلتا رہے گا۔

مجھ سے مشورہ لینے کے لیے آنے والے مریضوں کی تعداد میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کا سبب ایک تو میری مقبولیت تھی تو دوسری طرف لوگوں میں غذا کی طرف سے بے احتیاطی، بدپرہیزی اور مرغن کھانوں کی رغبت بڑھتی جا رہی تھی۔ کٹا کٹ۔۔۔ فرائی نہاری۔۔۔ پیزا اور مرغن کھانے اور فاسٹ فوڈ بھی تھا۔۔۔ ورزش اور پیدل نا چلنا بھی تھا۔ بہرحال میں نے بہت جلد اپنی قابلیت اور صلاحیت کا لوہا منوالیا تھا۔ نہ صرف میری آمدنی بلکہ بینک بیلنس میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ ستارہ بام عروج پر تھا اور پھر مجھے بعض کیسز کی وجہ اور اس کے علاوہ ٹی وی کے پروگراموں سے بھی شہرت مل رہی تھی۔

اس کے علاوہ میں پروفیسر بھی تھا۔ ایک سرکاری اسپتال میں ہفتے میں تین دن ایک ایک گھنٹہ مقرر تھے۔ جہاں مجھے اعزازی خدمات انجام دینا پڑتی تھیں لیکن میں ان مریضوں کو جو مالی طور پر مستحکم ہوتے تھے ان سے کہتا تھا کہ انہیں جلدی اور بہتر علاج کروانا ہے تو میرے کلینک پر آنا ہوگا۔۔۔ گو کہ یہ ایک طرح سے بددیانتی تھی۔ لیکن میں اس بہانے اپنی آمدنی میں اضافہ کرتا تھا۔

اس کے علاوہ میرا ایک اپنا بہت بڑا کلینک تھا۔ یہ ہر طرح سے مکمل تھا۔ جس میں چار سو مریضوں کے لیے گنجائش تھی۔ زچہ خانہ بھی تھا۔ ہر طرح کے مریضوں کو علاج معالجے کی سہولتیں تھیں۔ اس کے علاوہ لیبارٹری میں جدید ترین ساز و سامان اور ایکسرے کا بھی انتظام تھا۔ میرے کلینک میں علاج کے لیے داخل ہونے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ میں نے اپنے مشورے کی فیس ایک سال کے اندر پانچ سو سے بڑھا کر آٹھ سو کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میں جو آپریشن کرتا تھا اس میں بھی دس ہزار سے پندرہ ہزار روپے بڑھا دیے۔ پھر بھی مجھ سے مشورہ

لینے علاج اور آپریشن کروانے والے مریضوں میں کوئی کمی نہیں ہو رہی تھی۔ اور پھر سات کمپنیاں جو پینل پر تھیں اب اٹھارہ کمپنیاں ہوگئی تھیں۔ گویا میری پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔

میرے بڑے بھائی معین شریف ماہر امراض قلب تھے اور شام کے وقت میرے کلینک میں پریکٹس کرتے تھے ان کی فیس بھی آٹھ سو سے بارہ سو روپے ہوگئی تھی۔ اتنی زیادہ فیس ہونے کے باوجود ان کی بھی چاندنی ہو رہی تھی۔ ان سے مشورہ لینے اور معائنہ کروانے والے مریضوں کی تعداد بھی تیس اور چالیس کے درمیان ہوتی تھی۔ اس بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کراچی کے شہریوں کے پاس پیسے کی فراوانی ہے یہ شہر کراچی کے شہریوں کے لیے سونے کی کان تھا اور پھر ڈاکٹروں کو بھی منہ مانگی فیس وصول کرنے کی چھوٹ تھی۔ لوگ ہمیں ڈاکو اور لٹیرا کہتے تھے۔ اس کی پروا نہیں تھی۔ کیوں کہ اوپر سے نیچے تک آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔

میری بیوی ڈاکٹر نسرین ملک تھوڑی دیر پہلے ہی ایک ڈلیوری کیس کے میجر آپریشن سے فارغ ہوئی تھی۔ اس نے آج صبح سے رات دس بجے کے درمیان میجر آپریشن کے چار کیسز کیے تھے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف اس کا پرس بلکہ طبیعت بھی بھاری ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اپنے کمرے میں بیٹھی منہ پھلائے میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”جان! کیا بات ہے۔۔۔“ میں نے اس کے قریب جا کر پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ”آج تمہارا موڈ بہت خراب لگ رہا ہے۔“

”وہ کیشیئر کمینہ سرفراز ہے نا۔۔۔“ نسرین نے جواب دیا یہ اس کی وجہ سے پانچ ہزار کا نقصان ہو گیا۔ ”میں نے اس کی ایسی خبر لی ہے کہ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔۔۔“

”پانچ ہزار روپے کا نقصان۔۔۔“ میں نے حیرت اور غصے سے کہا ”وہ کیسے۔۔۔؟“

آج شام جو میں نے تیسرا میجر آپریشن کیا تھا اس مریضہ کا شوہر آپریشن فیس سن کر مشتعل ہو گیا اور اس نے سارا کلینک سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ کسی صورت سے پندرہ ہزار روپے آپریشن دینے تیار نہ تھا۔ بڑی مشکل سے وہ دس ہزار روپے دینے تیار پر ہوا۔“

”تمہیں تو پانچ روپے کی بھی رعایت نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے بگڑ کر برہمی سے کہا اور پھر اس شخص پر غصہ اتارتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ایس ایچ او کو فون کر دیا ہوتا یا گارڈ کو بلا کر اس کا دماغ درست کر دیتیں یہ کلینک ہے سبزی منڈی نہیں۔“

”میں نے ایک مجبوری کی وجہ سے بات نہیں بڑھائی۔“ نسرین کہنے لگی۔ ”کیشیئر نے پندرہ ہزار کی رقم ایڈوانس لینے کے بجائے دس ہزار روپے لے کر جمع کر لیے۔۔۔ دوسرا یہ کہ وہ انکم ٹیکس انسپکٹر ہے۔ اس لیے میں نے اس سے الجھنا پسند نہیں کیا۔۔۔ کیوں کہ ہم انکم ٹیکس آٹے میں نمک کے برابر دیتے ہیں۔۔۔ ہمیں لینے کے دینے پڑتے۔۔۔ وہ کسی نہ کسی طرح اگلا پچھلا برابر کر دیتا۔“

”جب ہم نے انکم ٹیکس آفس میں بھتہ باندھ رکھا ہے تو تمہیں گھبرانے، ڈرنے اور فکر کرنے کی کیا بات ہے، ان کے پاس کون سی حلال آمدنی ہوتی ہے۔۔۔ اگر اس کی جائز آمدنی ہوتی تو وہ ہمارے ہاں بیوی کی زچگی اور آپریشن تھوڑی کرواتا۔۔۔ کسی خیراتی یا سرکاری اسپتال میں جاتا۔۔۔ اور ہاں پانچ ہزار کی رقم اس کی تنخواہ سے ہر ماہ پانچ سو روپے کاٹ کر وصول کر لینا۔۔۔ پانچ روپے بھی نہیں چھوڑتا۔۔۔ اور آئندہ پوری جب تک پیشگی جمع نہ ہو آپریشن نہیں کرنا۔“

”میں نے کیشیئر سے کہہ دیا ہے کہ اس کا بل بنائے تو دوسرے اخراجات میں پانچ ہزار کی رقم کا اضافہ کر دینا تاکہ نقصان پورا ہو جائے۔۔۔ ورنہ تمہاری شامت آجائے گی۔ میں ہر ماہ تمہاری تنخواہ سے ہزار روپے کاٹ لوں گی۔“

”ویری گڈ۔۔۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم اب پکی بزنس مین ہوگئی ہو۔ چلو اس خوشی میں کسی

چائنیز ریسٹورنٹ چل کر ڈنر کرتے ہیں۔۔۔ یار! بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔“

”یہ مریض لوگ اپنے آپ کو بڑے چالاک اور تیس مار خان سمجھتے ہیں۔“ نسرین جواباً مسکرائی۔ ”جب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا ہے تو ٹیڑھی انگلی سے نکالنا پڑتا ہے۔۔۔ کیوں ڈیئر۔۔۔!“ نسرین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا جس میں صرف میری ذاتی آمدنی تھی۔ یعنی مشوروں کی۔۔۔ اور آپریشن کی بھی۔۔۔ یہ رقم گھر لے جاتا تھا۔ بینک میں جمع نہیں کراتا تھا۔ اسے اور مد میں کام میں لاتا تھا۔ روزانہ صبح جس وقت میں گھر سے نکلتا تھا تو ان مریضوں کو دیکھتا ہوا سرکاری اسپتال یا کلینک پہنچتا تھا۔ میں ان مریضوں کو ان کے گھر جا کر دیکھتا تھا۔ مجھے فی مریض ہزار سے دو ہزار روپے فیس کے ملتے تھے۔ اس طرح نسرین کے پاس بھی ایسے مریض تھے۔ رات کے وقت میں اور نسرین ایک ساتھ گھر واپس ہوتے تھے۔ اس کی گاڑی شوفر ہمارے گھر چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ ہمارے شوفروں کی ڈیوٹی شام سات بجے تک ہوتی تھی۔ میرے اور نسرین کے پاس مرسڈیز بینز اور ہنڈا سوک تھیں۔۔۔ مرسڈیز میں نے چار ماہ پیشتر ایک قومی اسمبلی کی خوب صورت ترین خاتون سے خریدی تھی جب وہ دبئی گئی تھیں تو انہیں ان کے کویتی دوست نے تحفے میں دی تھی۔ چھتیس لاکھ میں میں نے ان سے خریدی تھی۔

میں نے اس گاڑی کا رخ کلفٹن کے علاقے کی طرف کر لیا تھا۔ وہاں ایک چائنیز ریسٹورنٹ تھا جہاں ہم اکثر کھانے کے لیے جاتے تھے۔ میری مرسڈیز کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سبک خرامی سے جا رہی تھی۔ نسرین آج کے آپریشن کیسز کی روداد سنا رہی تھی۔ ہم کلفٹن کے علاقے میں داخل ہو کر ایک سڑک سے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک پجارو جیپ نے سامنے سے آ کر مجھے گاڑی سڑک کے کنارے رکنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں اس کے اندر چار آدمیوں کو دیکھا۔ دو اگلی نشست پر براجمان تھے دو پیچھے بیٹھے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ دو آدمی اتر کے تیزی سے ہماری گاڑی کی طرف بڑھے۔ ایک تو میری طرف آیا اور دوسرا لپک کر نسرین کی۔ گاڑی کا شیشہ اترا ہوا تھا۔ چوں کہ سارا دن کلینک میں اے سی میں ہوتے تھے۔ اس لیے تازہ ہوا کے لیے گاڑی کی کھڑکی کے شیشے دونوں طرف کھلے ہوئے تھے۔ میری طرف جو آدمی آیا وہ کوئی تیس برس کا ہوگا۔ صحت مند، مضبوط بدن کا اور دراز قد بھی تھا۔ چہرے مہرے، وضع قطع سے پڑھا لکھا اور مہذب دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر دونوں ہاتھ رکھے اور جھکا تو اس کے اور میرے درمیان انچوں کا فاصلہ تھا۔ اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بڑے شائستہ انداز میں کہا۔

”آپ دونوں سے گزارش کی جاتی ہے کہ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں۔ پلیز۔۔۔“

”کہاں۔۔۔؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

میں اپنی دانست میں یہ سمجھا کہ وہ اپنے کسی مریض کو دکھانے کے لیے لے جانا چاہتا ہے۔ دو ایک مرتبہ میرے ساتھ ایسا اتفاق پیش آچکا تھا۔

”میں اس وقت کہیں نہیں جاتا ہوں اور نہ آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔“ میں نے تیز لہجے میں صاف انکار کر دیا۔

”ہمارے ہاں۔۔۔“ اس نے سابقہ لہجے میں جواب دیا۔ ”گھر چل کر آپ مجھے پہچان لیں گے۔۔۔ ڈاکٹر پلیز! آپ انکار نہ کریں۔ آپ ابھی اور اس وقت ہمارے ساتھ چلیں۔“

”میں اس وقت کسی قیمت پر نہیں جاتا ہوں۔“ میں نے تند لہجے میں کہا۔ ”آپ کل شام مریض کو ساتھ لے کر میرے کلینک پر آجائیں۔“

”ڈاکٹر۔۔۔!“ اس کے چہرے کے تاثرات

اچانک بدل گئے۔ وہ پرسکون اور پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”ڈاکٹر اصل بات یہ ہے کہ ہم آپ دونوں میاں بیوی کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہمارے ساتھ خاموشی سے چلے چلیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ میں اچھل پڑا۔ میرے سارے جسم پر ایک سرد لہر سنسنی بن کر دوڑ گئی۔ ”آپ ہمیں اغوا کر کے کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔۔۔۔ کس لیے۔۔۔ ہم نے۔۔۔“ الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

”اس لیے کہ آپ دونوں میاں بیوی کو یرغمال بنانا چاہتے ہیں۔“ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ ”کیوں، کس لیے، اس کے متعلق وہیں چل کر معلوم ہوگا۔“

میں نے گردن گھما کر نسرین اور دوسری کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں دوسرا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی نہتا تھا۔ یہ دونوں ہی غیر مسلح تھے۔ نسرین کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ میں نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہم تمہارے ساتھ چلنے سے انکار کر دیں تو۔۔۔“ میں آپ سے تم کے تخاطب پر آ گیا۔

”پھر ہم آپ دونوں کو جبر سے اور زبردستی لے جائیں گے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ باتوں میں وقت ضائع کرنے کی کوشش نہ کریں اور نہ اس بات کی کوئی امید رکھیں کہ یہاں سے گشتی پولیس کی گاڑی گزرے گی۔ ہم نے اس کا انتظام پہلے ہی کر دیا ہے کہ وہ اس طرف آنے نہ پائے۔ یوں بھی وہ لوگ رات کے وقت شریف لوگوں کو کسی نہ کسی بہانے روک کر ان کی تلاشی لینے کے بہانے ان کی رقموں پر ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔۔۔ اگر آپ تھوڑا سا معاملہ فہمی کا ثبوت دیں اور جذبات کے بجائے عقل سے کام لیں تو یہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم آپ کو ہر قیمت پر لے جا کر رہیں گے۔ آپ نے مزاحمت یا شور مچانے کی کوشش کی تو ہماری ذات سے آپ کو خطرہ لاحق ہوگا اور پریشانیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم آپ دونوں کو زندہ یا مردہ۔۔۔ دونوں صورتوں میں یہاں سے لے جائیں گے۔“

وہ نپے تلے اور متاثر کن لہجے میں ایک ہی سانس میں بول گیا۔

نسرین نے میرے اور قریب ہو کر میرا بازو تھام لیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا تھا۔ دہشت سے اس کا بدن لرزنے لگا۔ ان بدمعاشوں سے یہ سامنا اتنا اچانک اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ بدحواس ہو گئی تھی اور میں بھی، میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔

”سنو مسٹر۔۔۔!“ میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم ہمیں اغوا کرنا چاہتے ہو۔۔۔“

”میں نے آپ سے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ وہیں چل کر ہی معلوم ہوگا۔ جلدی سے آپ دونوں گاڑی سے اتریں۔“

اس نے اپنی بات ختم کر کے سیدھے کھڑے ہو کر اپنا ایک ہاتھ جیب میں ڈالا تو میں بری طرح چونک پڑا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ دوسرے لمحے اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک خطرناک قسم کا ریوالور چمک رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر دوسری کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اس بدمعاش کے ہاتھ میں ایک ٹی ٹی پستول تھا جس سے اس نے نسرین کو نشانے کی زد میں لیا ہوا تھا۔ اس کا سفاک چہرہ بہت خوف ناک ہو گیا تھا اور اس کے تیور بھی۔

”کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی خوب صورت کھوپڑی میں سوراخ کر دوں۔“ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر بڑی بے رحمی سے کہا۔ ”میں دس تک کی گنتی گنوں گا۔۔۔ اگر آپ دونوں باہر نہیں آئے تو بلا جھجک گولی مار دوں گا۔ میرے خیال میں

ابھی آپ مرنا پسند نہیں کریں گے۔“ میں نے نسرین کی طرف دیکھا۔ اسے جیسے غش آ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”نسرین! جلدی سے اترو۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ وہ میرے بازوؤں سے چمٹ گئی۔ ”یہ بدمعاش جان سے مار دیں گے۔۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”نہیں۔۔۔ یہ ہمیں نہیں ماریں گے۔“ میں نے اس کا بازو تھپ تھپاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ”انہیں مارنا ہوتا تو وہ اب تک ختم کر چکے ہوتے اور ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہتے۔۔۔ بہتری اسی میں ہے کہ ان کا کہا مان لیں۔“

میں نے نسرین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ میں اپنی گاڑی سے ساتھ لے کر نکل آیا۔ اس کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ تیز اور خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ اس لیے کہ سمندر قریب تھا۔ اس کے باوجود اس کے منہ پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ وہ لرزے کی مریضہ لگ رہی تھی اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ اگر اس نے میرا سہارا نہ لیا ہوتا تو وہ اب تک زمین پر گر پڑی ہوتی۔

میں نے اس کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر کہا۔ ”نسرین حوصلہ نہیں ہارو۔۔۔ ہمت سے کام لو۔ خدا نے چاہا تو ہمارا بال بیکا نہیں ہوگا۔“

”تم۔۔۔!“ نسرین نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان سرگوشی میں آہستگی سے مجھ سے کہا۔ ”ہمارے پاس جو رقم ہے وہ دے کر جان کیوں نہیں چھڑا لیتے۔۔۔“

میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ میرے پاس ایک لاکھ پچاس ہزار کی رقم تھی۔ اس طرح نسرین کے پاس ایک لاکھ ستر ہزار کی۔۔۔ وہ ہمیں دولت کے حصول کے لیے ہی تو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ ہمیں یرغمال بنا کر رقم وصول کرنا چاہتے تھے میں نے ریوالور والے بدمعاش سے کہا۔

”ہمارے پاس جو رقم ہے وہ لے لو۔۔۔ اور ہمیں جانے دو۔“ میں نے بڑی لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

”آپ تو بہت سستے میں چھوٹ جانا چاہتے ہیں۔“ ریوالور والے بدمعاش کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

”ہمارے پاس تین لاکھ کے لگ بھگ رقم ہے۔“ میں نے اس کے سامنے جیسے چارہ ڈالا۔ ”یہ رقم تو بہت بڑی ہوتی ہے۔“

”ہوتی ہوگی۔۔۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دو تین لاکھ سے کیا ہوگا۔۔۔“ یہ تو نہایت معمولی سی رقم ہے۔“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں سفاکی گھل گئی۔ ”اس وقت آپ بیس لاکھ روپے بھی دے دیں تو آپ کو نجات نہیں ملے گی ڈاکٹر۔۔۔! ہم آپ دونوں کو ساتھ لے جا کر رہیں گے۔۔۔ ہر قیمت پر۔۔۔ آپ دونوں جلدی سے جیپ میں بیٹھ جائیں۔ میں نے آپ کو گفتگو کے لیے بہت سارا وقت دے دیا ہے۔“ میں اور نسرین جیپ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سڑک کی طرف دیکھا۔ جس پر اکا دکا گاڑیاں برق رفتاری سے گزرتی جا رہی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ہماری طرف دیکھا بھی تھا۔ ان میں سے کسی کو خیال نہیں آیا۔ احساس نہیں ہوا یا پتا نہ چلا تھا کہ ہمیں اغوا کیا جا رہا ہے۔۔۔ بڑے مہذب اور شائستہ طریقے سے ایک بے حد قیمتی گاڑی کو بچاروں جیپ کا راستہ اس انداز سے روک لینا کسی کو بھی اور انہیں مشکوک نہیں بنا سکتا تھا اور نہ بنا سکا۔ مجھے ان لوگوں کی بے حسی پر سخت غصہ آ رہا تھا جو اندھوں کی طرح گزر رہے تھے۔

دوسرے بدمعاش نے جس کے ہاتھ میں ٹی ٹی پستول تھا میرے پاس آ کر میرا بریف کیس میری طرف بڑھایا۔ ”اپنا بریف کیس سنبھالیں۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ان بدمعاشوں نے

میرے بریف کیس کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد میرے حوالے کر دیا۔ نسرین کا تھیلا نما پرس جس میں وہ اپنی یومیہ آمدنی رکھتی تھی، کندھے پر جھول رہا تھا اس کی طرف انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

بدمعاش کچھ شریف قسم کے واقع ہوئے تھے اور پھر ہمیں انوکھے انداز سے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے میں جیپ میں داخل ہوا۔ نسرین میرے پیچھے پیچھے آئی۔ جیپ میں جو دو بدمعاش موجود تھے وہ کلاشنکوف سے مسلح تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ریوالور والے بدمعاش نے اپنی جیب سے دو سیاہ رنگ کی دو پٹیاں نکال کر ہماری آنکھوں پر باندھ دیں۔ پھر اس نے ہمیں برقعے پہنائے۔ جب جیپ چل پڑی تو اس نے کہا۔ ”جس طرح آپ دونوں نے یہ تعاون کیا ہے یہ سفر ختم ہونے تک جاری رہنا چاہیے۔ اس میں آپ کی سلامتی ہے۔“

”آخر تم لوگ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہو۔“ نسرین نے چند لمحوں کے بعد لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بیس پچیس منٹ کی بات ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ صبر کریں۔ یہ اطمینان رکھیں ہم آپ کو تختہ دار کی طرف نہیں لے جا رہے ہیں۔“

جیپ میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ جیپ بڑی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ریوالور والے کی آواز نے گہرے سکوت کو توڑا۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہوا تھا۔

”یار حمید۔۔۔! کتنی عجیب اور کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جو مریضوں کو موت کے منہ سے نکالتے ہیں وہ آج خود موت کے اندیشے سے کس قدر خائف، پریشان اور ہراساں ہو رہے ہیں۔“

”جی جاوید بھائی۔۔۔!“ اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ یہ پستول والے کی آواز تھی۔ ”ان کا ایمان صرف پیسہ ہے جو انسانی جان سے کہیں عزیز ہے۔“ اس کا الزام میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے میں لوٹے بغیر نہ رہ سکا۔

”یہ سراسر بہتان ہے۔۔۔ اس پیشے کے تقدس اور وقار پر۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔ ہم انسان کی جان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔۔۔ ہر لمحہ انسانیت کی بقا کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دولت کے مقابلے میں انسانی جان زیادہ عزیز ہے۔“

”اچھا۔۔۔ آپ نے کیا لطیفہ سنایا۔ جی خوش ہو گیا۔“ جاوید ہنسنے لگا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”آپ لوگوں کا یہ پیشہ مقدس اور پروقار کہاں رہا ڈاکٹر۔۔۔! یہ تو ایک کاروبار بن گیا ہے۔۔۔ آج اس سے زیادہ منفعت بخش کاروبار کوئی اور نہیں ہے۔۔۔ آپ نے اس مقدس پیشے کی دھجیاں جس طرح اڑائی اور اڑا رہے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔۔۔ آپ لوگوں نے نہ صرف ڈاکٹر کو پیچھے چھوڑ دیا ہے بلکہ خون آشام بھیڑیوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔۔۔ آپ لوگوں نے اسے انسانیت سوز کاروبار بنا لیا ہے۔ آپ لوگوں کے دلوں میں انسانیت کے لیے ہمدردی کی ایک رمق بھی نہیں رہی۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ اگر میں ان کا اسیر نہ ہوتا اور میرے کلینک میں کوئی ایسی بات کہتا۔۔۔ بکواس کرتا تو میں اس کا منہ توڑ کے رکھ دیتا۔ اس کی زہریلی باتوں نے میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگا دی۔ میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ ”آپ ہمیں الزام دے رہے ہیں۔“ مجبوری تھی۔ اس لیے اس بدمعاش کو آپ سے مخاطب کرنا پڑا۔ ”ہم جس طرح شب و روز بیماریوں کے خلاف ایک طویل اور زبردست جنگ لڑ رہے ہیں انسانیت کی خدمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ ہم اٹھارہ بیس گھنٹے روزانہ مریضوں کو دیتے ہیں۔ شاید ہی ایسی کوئی رات ہو جو ہم نے سو کر گزاری ہو۔“

”یہ آپ انسانیت کے لیے نہیں صرف پیسے کے لیے کرتے ہیں۔ اس پیسے کے لیے جو اپنے ساتھ اپنی قبر میں نہیں لے جا سکتے۔“ اس نے چوٹ کی۔

”معلوم نہیں کیوں آپ لوگ اس انداز سے ہمارے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہمارے جذبوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک انسانی جان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز قیمتی نہیں ہے۔“ میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تیزی تندی آ گئی۔

”بہت خوب ڈاکٹر۔۔۔!“ وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی زہریلی تھی۔ ”آپ لوگوں سے بڑا جھوٹا، دغاباز اور کاروباری کوئی نہیں ہے۔ آپ جتنے بڑے ڈاکٹر ہیں اس سے کہیں زیادہ جھوٹے بھی ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک مثال آپ کی انسانیت دوستی اور جذبے کی مثال پیش کرتا اور آپ کو آئینہ دکھاتا ہوں جس میں آپ کو اپنا مکروہ اور گھناؤنا چہرہ صاف نظر آئے گا۔ آج سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔۔۔ آپ کی کلینک کے سامنے والی سڑک پر ایک بوڑھے راہ گیر کو ایک امیر کبیر آدمی کی نئی گاڑی نے بڑی زور کی ٹکر ماری۔ گاڑی والا جائے وقوع سے کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس زخمی کو آپ کی کلینک میں لایا گیا تو پانچ ہزار روپے کاؤنٹر پر جمع کرانے کے لیے کہا گیا۔ ان لوگوں نے جن میں۔۔۔ میں بھی شامل تھا اور اس بوڑھے زخمی راہ گیر کو لوگ انسانی جذبے کے تحت لائے تھے۔ آپ سے درخواست کی گئی تھی کہ اس شخص کو فوراً طبی امداد دی جائے۔ رقم جمع کرانے سے معذوری ظاہر کی تو آپ کے یہ الفاظ تھے کہ یہ کوئی سرکاری یا خیراتی اسپتال نہیں ہے۔ یہاں مفت علاج نہیں ہوتا ہے۔ ہم نے جب آپ کو اس مقدس پیشے اور انسانیت کا واسطہ دیا تو آپ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ اپنے اسٹاف اور ہسپتال کے گارڈ کی مدد سے ہم سب کو باہر نکال دیا۔ پولیس کو بھی فون کرنے کی دھمکی دی۔ جب ہم اس زخمی مریض کو دوسرے اسپتال پہنچے تو اس نے تھوڑی دیر کے بعد دم توڑ دیا۔۔۔ اس اسپتال کے ڈاکٹروں نے کہا اس بدنصیب زخمی کو بروقت طبی امداد دی جاتی وہ بچ جاتا۔۔۔ یہ تو ایک مسلمان ڈاکٹر کا قصہ ہے جو ایک مسلمان کے ساتھ اس کا سلوک تھا۔۔۔ اب ایک کافر انگریز کا قصہ سنیے۔ میں لندن میں ایک پیٹرول پمپ اسٹیشن پر جاب کر رہا تھا۔ یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ جانے مجھے ایک روز اچانک کیا ہوا کہ میں چکرایا اور بے ہوش ہو گیا۔ میرا ایک دوست مجھے اسپتال لے گیا۔ مجھے فوراً داخل کر لیا گیا۔ میں بارہ دن زیر علاج رہا۔ جب مجھے داخل کیا گیا اور جب ڈسچارج کیا گیا مجھ سے ایک پینی یعنی ایک روپیا بھی نہیں لیا گیا۔۔۔ ایک انگریز کا ایک مسلمان کے ساتھ نہیں بلکہ یہ رویہ مریض کے ساتھ تھا۔ یہ ہے آپ کے جذبۂ انسانیت کی کہانی جس کا دعوا آپ کر رہے ہیں۔۔۔ اب آپ ہی بتائیے ڈاکٹر۔۔۔ آپ کے نزدیک جان زیادہ قیمتی ہے۔۔۔ یا دولت۔۔۔؟“

مجھے ایسا لگا کہ اس نے صرف میرے منہ پر نہیں بلکہ اس شہر کے تمام ڈاکٹروں کے منہ پر تھوکا ہے۔۔۔ جوتا دے مارا ہو۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا۔ اکثر و بیشتر ایسے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

”اگر ہم ایسے کیس لیتے رہے تو پھر کلینک کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟“

”تو پھر آپ یہ دعوا کیوں کرتے ہیں کہ ہم انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔۔۔ ہمارے نزدیک انسانی جان دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔۔۔“ اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ ”امریکا اور یورپ کے اسپتال جو مہینوں مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں کیا وہ کنگال ہو جاتے ہیں۔۔۔“

میں لاجواب ہو کر رہ گیا اس شخص سے بحث کرنا فضول تھا۔ کہنے کو تو میرے پاس بہت کچھ تھا۔ مگر میں اسے غصہ دلانا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ ہم میاں بیوی ان بدمعاشوں کے رحم و کرم پر تھے۔

اس بدمعاش نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شخص نے

میرے سامنے گستاخی کی تھی اور میرے ہم پیشہ افراد کو ہلاکو اور درندوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان باتوں میں کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ گاڑی کہاں کہاں سے گزری ہے۔ اتنا ضرور پتا چل گیا کہ گاڑی ویران اور سناٹے کے راستے سے گزر رہی ہے۔ سڑک بھی کچی تھی۔ ٹریفک بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک جگہ رکی۔ جیسے ہی وہ رکی ۔۔۔ تین چار آدمیوں کی چاپ سنائی دی جو گاڑی کے پاس آ کر معدوم ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے بڑے شستہ لہجے میں کہا۔

''مبارک ہو جاوید بھائی! آپ کا مشن کامیاب رہا۔''

''خدا نے بڑا فضل کیا کہ شکار ہاتھ لگ گیا۔ آخر تینوں کی محنت رنگ لائی۔'' جاوید نے سرشاری کے لہجے میں جواب دیا۔

''کسی قسم کی مشکل اور دشواری تو پیش نہیں آئی۔'' ایک آواز نے دریافت کیا۔

''نہیں ۔۔۔'' یہ جاوید کی آواز تھی۔ ''خلاف توقع شکار بہت ہی آسان ثابت ہوا۔ انہیں شکار کرنے میں مزا نہیں آیا۔ ہمیں دیکھتے ہی جیسے ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ لیکن ویسے لیڈی ڈاکٹر زیادہ خوف زدہ ہے۔ ان کی حالت کسی دل کی مریضہ جیسی ہو رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر دل کا دورہ پڑ جائے۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔'' یہ حمید نے کہا۔ ''آج انہیں دل کا دورہ پڑ جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ انہیں بھی تو پتا چلے کہ دل کا دورہ کیا ہوتا ہے۔ ان کے کتنے ہی مریضوں پر دل کے دورے نہیں پڑے ہوں گے ان کے بل دیکھ کر ۔۔۔''

حمید کی بات سن کر وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد جاوید نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے نیچے اترنے کے لیے کہا اور اس نے مجھے سہارا دے کر اترنے میں مدد کی، نسرین کو کس نے سہارا دے کر اتارا مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ پھر میرا برقع اتارا گیا۔ نسرین کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔ جب وہ ہمیں لے کر بڑھے تو جاوید نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا جو کسی نے چلنے سے پہلے پکڑا دیا تھا۔ انہوں نے ہماری آنکھوں سے پٹی نہیں اتاری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دو ایک کمروں سے گزار کر ایک کمرے میں لے کر پہنچے ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہمارے ساتھ دو آدمی ہیں۔ جیپ کے پاس جو آدمی تھے وہ شاید تین تھے۔

آنکھوں پر سے پٹی اتاری گئی تو میں نے دیکھا کہ یہ ایک درمیانہ کمرا ہے۔ ایک طرف بڑی سی میز تھی۔ جس پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جو تیس برس کی ہو گی۔ وہ سانولے رنگ کی پرکشش عورت تھی۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا اس سے کسی اچھے گھرانے اور متوسط طبقے کی لگ رہی تھی۔ وہ پرنٹڈ ساڑھی اور سفید بلاؤس میں ملبوس تھی۔ اس نے دل کش مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی میز کے گرد پانچ چھ کرسیاں تھیں۔ اس کے سامنے میز پر ایک پیڈ رکھا تھا۔ ہاتھ میں بال پین تھا۔ اس کمرے میں حمید، جاوید اور اس عورت کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ اس نے ہم دونوں کو بیٹھنے کے لیے کہا تو حمید کمرے سے نکل گیا۔ جاوید میرے برابر والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ راستے میں ہمارے موبائل لے کر یقیناً آف کر دیے گئے تھے۔

اس عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر اور آپ کی بیگم صاحبہ بیس بیس ہزار روپے جمع کرا دیں۔''

''بیس ہزار روپے ۔۔۔'' میں نے حیرت سے پہلے عورت کی طرف دیکھا۔ پھر جاوید کی طرف۔ ''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ یہاں کا دستور ہے جس طرح آپ کے کلینک کا ہے۔'' عورت مسکرائی۔ ''آپ کے ہاں جب کوئی مریض علاج معالجے کے لیے داخل ہونے آتا ہے تو سب سے پہلے آپ لوگوں کو پیسوں کی فکر ہوتی ہے۔ پہلے پیسے وصول کیے جاتے ہیں چاہے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ انسانی جان دولت سے کہیں قیمتی ہے۔ بھلے اس کی سانس کیوں نہ اکھڑ رہی ہو۔ اسے فوراً طبی امداد دی جائے ۔۔۔ جب پیسہ جمع ہو کر اس کی رسید ڈاکٹر کے منہ پر ماری جاتی ہے تب اس مریض کو دیکھا جاتا ہے۔ کیوں ڈاکٹر! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں؟''

''وہ کلینک میں اس لیے ایسا کیا جاتا ہے ۔۔۔'' نسرین نے جواب دیا۔ ''یہ دستور صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہے ۔۔۔ اس شہر کے ہر کلینک اور اسپتال میں بھی ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ان کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ پھر وہ بارگین کرنے پر اتر آتے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مریض نے مول تول کیا یا رقم جمع کرنے میں دیر کی تو ۔۔۔ فاقوں کی نوبت آ جائے گی یا کلینک بند کرنا پڑے گی۔'' اس عورت کا جواب نہیں تھا ایک جوتا تھا جو اس نے نسرین اور ہم پیشہ کے منہ پر مارا تھا۔ ''عورت نفرت اور حقارت بھرے لہجے میں بولی۔ ''یہ بھی تو ایک کلینک ہے۔'' عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''اپنی نوعیت کا واحد کلینک ۔۔۔''

''کلینک ۔۔۔؟'' اس کی بات سن کر ہم دونوں چونکے اور حیرت سے عورت کی شکل دیکھی۔ ایک ان جانے خیال سے میرے جسم پر سنسنی سی دوڑ گئی۔ دوسرے لمحے میں نے پوچھا۔ ''کیسا کلینک ۔۔۔؟''

''تاوان کلینک ۔۔۔'' اس نے بتایا۔ ''جن لوگوں کو یرغمال بنانے کے لیے اغوا کیا جاتا ہے انہیں یہاں اس وقت تک رکھا جاتا ہے جب تک وہ تاوان ادا نہیں کر دیتے ہیں ۔۔۔ انہیں یہاں ہر قسم کی سہولتیں بھی دی جاتی ہیں مگر ان کی قیمت بھی وصول کی جاتی ہے۔ اس لیے ہم بیس ہزار کی رقم بطور جرمانہ لے رہے ہیں۔''

وہ چاہتے تو ہم سے بھی زبردستی ساری رقم چھین سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے ایک بات جو شروع سے محسوس کی وہ یہ کہ ان کا رویہ انتہائی شریفانہ تھا۔ جب کہ میں نے اخباروں میں مغوی لوگوں کی کہانیاں پڑھی تھیں کہ یہ بدمعاش اغوا کی واردات کرتے وقت انسانیت سوز سلوک کرتے ہیں۔ کپڑوں کے علاوہ ہر چیز اتروا لیتے ہیں۔ میں نے اور نسرین نے بریف کیس اور پرس سے بیس بیس ہزار کی رقم نکال کر میز پر رکھ دی تو عورت نے انہیں گنے بغیر میز کی دراز میں رکھ لیا۔ پھر اس نے سادے کاغذ پر کچی رسیدیں بنا کر دے دیں اور شکریہ ادا کیا۔ میں نے جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ ''آپ لوگ ہماری رہائی کے عوض کیا چاہتے ہیں؟''

''اس موضوع پر ایک دن بعد بات ہو گی۔'' جاوید نے جواب دیا۔ ''ہم آپ کو اتنی جلدی رخصت کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔''

''کس لیے ۔۔۔؟'' اس کا جواب سن کر تعجب ہوا۔

''اس لیے کہ آپ کو دنیا کے نشیب و فراز کا پتا چل سکے۔ یہاں جو یرغمال ہوتے ہیں ان کی مثال ایک مریض کی سی ہوتی ہے۔'' میرے دل کے کونے میں ایک شک کی لہر اٹھی تو میں نے دور کرنے کے خیال سے پوچھا۔ ''کہیں آپ ہم پر تشدد تو نہیں کریں گے؟''

''تشدد ۔۔۔!'' جاوید کہہ کر سوچنے لگا۔ ادھر نسرین کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ میرا کلیجہ بھی لرزنے لگا۔ تاوان کی زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کے لیے وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔ تشدد کے طریقے زیادہ کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی بعید نہیں تھی۔

''جی نہیں ۔۔۔ آپ اسے تشدد کا نام نہیں دے سکتے۔ اگر ہم نے تشدد کیا تو آپ میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا۔'' جاوید بولا۔

''ہم ڈاکٹر ہیں بدمعاش نہیں ۔۔۔ جو مریضوں پر تشدد کریں۔'' میرے منہ سے غصے سے نکل گیا۔ اس کی بات نے میرے بدن پر جیسے انگارہ

رکھ دیا تھا۔

''آپ لوگ جس انداز سے مریضوں اور لواحقین کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ وہ ایک مہربانہ تشدد ہے۔۔۔ بلکہ اسے طبی تشدد کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔۔۔ رعونت۔۔۔ یہ ٹیسٹ۔۔۔ وہ ٹیسٹ۔۔۔ ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ کروانے کے لیے تحکمانہ لہجہ۔۔۔ خون بھی یہیں سے لیا جائے۔ ادویات بھی صرف اسی کلینک سے خریدی جائے۔۔۔ صرف اس لیے کہ کھال ادھیڑی جائے۔۔۔ میں ایک مثال دوں۔ ایک مریضہ کو دن میں سات دن تک دو انجکشن دینے تھے۔ اتفاق سے دوسرے دن وہ انجکشن دینے تھے۔ فوری ضرورت تھی۔ میڈیکل اسٹور کے ملازم نے مریضہ کے شوہر سے کہا کہ یہ انجکشن بازار سے لے آئیں۔ آپ کے میڈیکل اسٹور میں وہ انجکشن بارہ سو روپے کا۔۔۔ سب سے بڑے اسپتال میں پانچ سو روپے کا۔۔۔ سات سو روپے منافع۔۔۔ جس اسپتال نے پانچ سو روپے میں دیا آخر اس نے بھی تو منافع لیا ہوگا۔۔۔ جب مریضہ کے شوہر نے آپ کی اہلیہ ڈاکٹر سے اس بدمعاشی اور لوٹ مار پر لتاڑا تو اُس غریب ملازم کو کھڑے کھڑے ملازمت سے نکال دیا گیا اور مریضہ کو ڈسچارج کر دیا اس لیے کہ مریضہ کے شوہر آپ کی خوب خبر لی تھی۔۔۔ آپ میاں بیوی کی ہدایت پر یہ ڈکیتی بھی کی جاتی ہے۔۔۔ نرسوں، سسٹروں کو بھی سختی سے تاکید ہے، کسی مریض کے دس انجکشن تجویز کیے جائیں تو صرف چھ لگیں۔ باقی آپ کے کھاتے میں۔۔۔ یہ کیا تشدد اور ایذائیں دینا نہیں ہوا۔ اتنی ذلیل، قبیح اور گھناؤنی حرکت۔۔۔ آپ کو زیب دیتی ہے۔۔۔ آپ وزیرِ صحت بھی تو رہے ہیں۔ آپ کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ رب تو دیکھ رہا ہوگا۔ یہ مریضوں کی جیبوں پر ڈاکا مارنے کا سلسلہ کیا آج بھی جاری نہیں ہے؟''

اس کی بات اس قدر زہریلی تھیں کہ میرے سینے میں کسی خنجر کی تیز دھار کی طرح اتر گئی تھی۔ میرے اندر نفرت اور غصے کی ایک شدید لہر اٹھی جس نے میرے وجود کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ نس نس میں لہو ابلنے لگا۔ کنپٹیاں گرم ہونے لگیں۔ اگر اس وقت میرے پاس پستول ہوتا تو میں اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ اس کی ساری گولیاں ایک ایک کر کے سینے پر داغ دیتا۔۔۔ یہ بے رحم، سنگ دل اور ذلیل شخص میری اور میرے مقدس پیشے کی اہانت پر اتر آیا تھا۔ یہ تذلیل میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے جو کچھ انکشاف کیا تھا اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں تھا۔ لیکن یہ ہر نجی اسپتال اور کلینک میں ہوتا تھا۔ سرکاری اسپتالوں میں بھی غبن اور ادویات کی چوری میں بڑے ڈاکٹر، سرجن اور لیڈی ڈاکٹر جن کی پریکٹس بڑے بڑے چیمبرز اور اسپتالوں میں تھی، شامل ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ اپنے ان بدمعاشوں سے یہ توقع رکھنا کہ میرے اور نسرین کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئیں گے بے کار تھا۔

یہ بے ضمیر لوگ تھے اس وقت میرے دماغ میں بہت سارے خیالات ہل چل مچا رہے تھے اور میرے اعصاب میں ایک تناؤ سا آ گیا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس بدمعاش کے منہ پر ایک ایسا زوردار تھپڑ رسید کروں کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں لیکن وہ وہ سلوک اور میرا وہ حشر نشر کیا جاتا کہ میں اپنے کلینک ہڈی وارڈ میں دو ماہ تک زیرِ علاج رہتا۔

نسرین سے رہا نہ گیا۔ وہ برافروختہ ہو کر بولی۔

''آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہمیں اس طرح ذلیل کریں۔ ہمیں ڈاکوؤں کی صف میں کھڑا کر دیں۔ آپ یہ مت بھولیں کہ میں اور میرے شوہر صرف کراچی کے نہیں بلکہ ملک کے بڑے اور نامور ڈاکٹر ہیں۔ میرے شوہر تو دو ایک برس میرے رب کے فضل سے وزیرِ صحت بھی رہے ہیں۔''

''سچی بات کتنی کڑوی اور زہریلی ہوتی ہے۔'' جاوید سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ''محترمہ۔۔۔! اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ آج ایک ڈاکو اور ایک ڈاکٹر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے ڈاکٹر ہی لٹیرے ہوتے ہیں۔ بہت سارے نیک اور شریف اور مخلص ڈاکٹر بھی ہیں جنہوں نے اس مقدس پیشے کی شمع روشن کر رکھی ہے۔ میں تو ان ڈاکٹروں کے بارے میں عرض کر رہا ہوں جو خود غرض، ننگ انسانیت اور لٹیرے قسم کے ہوتے ہیں۔۔۔ آپ جذباتی بن کر نہ سوچیں۔۔۔ جذبات کی رو میں نہ بہیں۔۔۔ ذرا ٹھنڈے دل سے۔۔۔ حقیقت پسندی سے اپنا اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کا محاسبہ کریں۔ آپ لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ ایک ڈاکٹر کے مقابلے میں ایک ڈاکو اس لیے زیادہ بہتر ہے کہ وہ ایک آدمی کو صرف ایک بار لوٹتا ہے۔ جب کہ آپ لوگ مریض کو بار بار لوٹتے ہیں۔ کسی قصائی کی طرح اس کی کھال تک اتار لیتے ہیں۔''

''آپ یہ بات کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔'' نسرین کا پارہ چڑھ گیا۔ ''ایک ڈاکو اور ڈاکٹر میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین اور آسمان میں۔''

''اس بنا پر جب کوئی مریض علاج کی غرض سے آپ کے کلینک میں داخل ہوتا ہے تو اسے ایک شکار سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ وحشیانہ طبی تشدد کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اسے مجبور کیا جاتا ہے وہ مختلف ٹیسٹ کے مراحل سے گزرے، چاہے نزلہ، زکام اور معمولی سی کھانسی ہی کیوں نہ ہو۔ پیٹ میں گیس یا معمولی درد ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس کی جیب پر ڈاکٹر اس طرح ڈاکا مارتا ہے کہ یہ سلسلہ روزانہ دراز ہوتا جاتا ہے۔ ٹیسٹ کیے جاتے رہتے ہیں۔۔۔ کیوں کہ سب سے زیادہ کمائی ٹیسٹ میں ہوتی ہے۔ پھر جونیئر اور سینئر ڈاکٹرز دو تین مرتبہ بلاوجہ راؤنڈ کر کے اپنی فیس پکی کرتے ہیں۔''

وہ یہ بات پہلے بھی کہہ چکا اور پھر دوہرائی تھی۔ پھر میری زبان سے بلا ارادہ نکل گیا۔

''اگر ہم ایسا نہ کریں تو کلینک کے دسوں اخراجات ہیں وہ کیسے اور کہاں سے نکلیں گے؟''

''بات اخراجات کی نہیں بلکہ دولت کی ہے۔'' اس نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''آپ زیادہ سے زیادہ مختلف حیلے بہانوں سے دولت بٹورنا چاہتے ہیں آپ کی یومیہ آمدنی ایک محتاط اندازے کے مطابق پندرہ سولہ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اپنے اسٹاف کو طبی سہولتیں بھی نہیں دیتے ہیں نہ دی ہوتی ہیں۔۔۔ اور ان کی تنخواہیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔۔۔ آپ اب تک سات پرانے ملازمین کو نوکری سے نکال چکے ہیں کہ انہیں دل کا عارضہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ ملازم رہتے تو آپ کو ان کا مفت علاج کرنا پڑتا اور ادویات بھی فراہم کرنی پڑتی۔''

میں اس کی معلومات پر دل میں بڑا حیران ہوا۔ اس کی ایک بات بھی غلط نہ تھی۔ نسرین نے حیرت سے میری طرف دیکھا کہ یہ بات اس بدمعاش کے علم میں کیسے آ گئی۔ اس سے پہلے کہ اس بدمعاش سے اس بات کی کوئی وضاحت کرتا۔ حمید ایک ٹرے میں ایک پلیٹ میں سینڈوچز اور پانچ کپ کافی لے آیا تھا۔ اس وقت کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ ہم بھوکے بھی تھے۔ ہم نے سینڈوچز کے ساتھ کافی حلق سے اتاری۔

جب ہم کافی پی چکے تو جاوید نے عورت سے کہا۔ ''سلطانہ! انہیں ساتھ لے جا کر کمرے دکھا دیں۔ جو کمرا پسند کریں دکھا دیں۔''

پھر جاوید نے ہم سے کہا۔ ''ہم نے آپ کے ہاں اور اسپتال فون کر کے انہیں بتا دیا کہ وزیرِ اعلا ہاؤس میں ایک امریکی میڈیکل ڈاکٹروں کی ٹیم آ کر ٹھہری ہوئی ہے۔۔۔ چوں کہ ان کے لیکچرز ہیں اس لیے آپ لوگ رہائش اور اسپتال سے کچھ دن غیر حاضر رہیں گے۔۔۔ رابطہ قائم نہ ہو سکے گا اور موبائل بند رہیں گے۔''

وہ عورت کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چلیے۔۔۔'' پھر اس نے جاوید سے کہا۔ ''انہیں آپ کمرے کے بارے میں بتا دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میری بات نہ مانیں۔''

''ڈاکٹر۔۔۔!'' جاوید نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم یرغمالیوں کو چاہے وہ میاں بیوی۔۔۔ ماں بیٹی بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک ساتھ ایک کمرے میں ٹھہرنے نہیں دیتے ہیں۔۔۔ لہٰذا آپ دونوں کو الگ الگ کمروں میں ٹھہرنا ہوگا۔''

''بھلا یہ کیا بات ہوئی۔'' میں اس کی زبان سے یہ بات سن کر دل میں ششدر رہ گیا۔ ''یہ کوئی جیل خانہ نہیں ہے۔''

''ہمارا یہ اصول ہے اور ہم اس پر سختی سے کاربند ہیں۔۔۔ اگر آپ نے یہ بات نہیں مانی تو ہم مجبور ہوں گے کہ آپ کے سختی کریں اور کال کوٹھری میں لے جا کر بند کر دیں۔''

سلطانہ ہمیں ساتھ لے کر اس حصے کی طرف آئی جہاں پانچ چھ کمرے آمنے سامنے تھے۔ ابھی تک یہ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ یہ جگہ شہر سے کتنی دور ہے دراز ہے۔ سنسان اور ویران مقام پر واقع ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی قسم کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں طرف ایک گہرا سناٹا آسیب کی طرح مسلط تھا۔ ایسا لگتا تھا کسی گھنے جنگل میں یہ گھر بنا ہوا ہے۔

ہمیں یہاں آئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے کسی گاڑی کو گزرتے ہوئے محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی اور قدیم طرز کی تھی۔ گھنے اور بوڑھے درختوں سے گھری ہوئی تھی مگر صاف ستھری تھی۔ سلطانہ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ ہم سے قیام اور طعام کے اخراجات بھی لیے جائیں گے۔ جو کھانا پسند کریں گے وہ فراہم کیا جائے گا۔ پہلے اس نے ایک ڈربا نما کمرا دکھایا جس میں ہوا کے گزر کے لیے روشن دان تک نہ تھا۔ اس کا یومیہ کرایہ چار سو تھا۔ نسرین نے اعتراض کیا تو سلطانہ نے کہا کہ۔۔۔ آپ کے کلینک میں ایسے سات کمرے ہیں جن کا کرایہ چار سو وصول کیا جاتا ہے۔ دوسرے کمرے ہزار اور تین ہزار تک کے تھے۔ ہم نے تین ہزار روپے والا کمرا منتخب کیا اس لیے کہ اس میں اے سی تھا لیکن ہمیں تین سو روپے کرائے کے کمرے میں مقفل کر دیا گیا۔ جب کہ ہم تین ہزار کیا دس ہزار روپے تک دینے کو تیار تھے۔

اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مریض ایسے کمروں میں کس طرح رات دن گزارتے ہوں گے۔۔۔ حبس، گرمی اور گھٹن۔۔۔ پنکھے کی ہوا سے بھی نہ نیند آ رہی تھی نہ چین آ رہا تھا اور نہ ہی گرمی دور ہو رہی تھی۔ میں نے بہت کہا کہ دس نہیں بیس ہزار روپے لے لو لیکن ایک نہ سنی گئی۔ اس لیے کہ وہ ہمیں احساس دلانے چاہتے تھے کہ مریضوں پر کیا گزرتی ہے۔

اس سے ملحق غسل خانہ بھی صاف ستھرا نہ تھا اور نہ پینے کا پانی تھا۔ یہ میری کلینک جیسے کمرے تھے۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ سخت پیاس بھی لگ رہی تھی۔ منرل واٹر کی بوتل دو سو روپے کی ملی۔ میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لیا۔ ان لوگوں نے ہمیں تاوان کے لیے اغوا کیا تھا۔ میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہمیں بھی اتنی آسانی سے اغوا کر کے یرغمال بنا لیا جائے گا۔ آج کل اغوا کر کے یرغمال بنانا اور بھاری تاوان وصول کرنا کاروبار بن گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں کوئی کاروبار اس قدر منافع بخش نہ رہا تھا۔ پولیس اور انتظامیہ بھی ان وارداتوں پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ بڑے بڑے تاجر، صنعت کار اور سرمایہ دار نشانہ بن رہے تھے۔ مغوی لوگ جب تاوان ادا کر کے رہا ہو کر گھروں کو آتے تھے اپنی زبان بند رکھتے تھے۔ پولیس سے اس لیے بھی تعاون نہیں کر رہے ہوتے اور کرتے تھے ایک طرف انہیں اپنی جان کا خطرہ ہوتا تھا دوسری طرف وہ پولیس سے اس لیے نالاں تھے کہ وہ مجرموں کا سراغ لگانے کے بجائے دوستوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے تفتیش کے بہانے نہ صرف تنگ، پریشان اور ہراساں کرتے تھے بلکہ مال بھی بٹورتی تھی۔ وہ پولیس کو نہیں بتاتے تھے کہ کس قدر تاوان ادا کر کے رہا ہوئے۔ مجھے وہ

مغوی بھی یاد آئے جنہوں نے تاوان ادا کرنے سے انکار کیا۔ انہیں موت کا منہ دیکھنا پڑا۔ جاوید نے گھر اور اسپتال فون کر کے ہمارے متعلق جو بتایا اس پر کسی نے اعتبار نہیں کیا ہوگا۔ اس لیے ہماری گمشدگی پراسرار اور معمہ بن گئی ہوگی۔

رات ہم دونوں نے جاگ کر بڑی اذیت سے گزاری تھی۔ صبح نسرین نے ان سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے جو بھی تاوان ہو وہ لے کر ہمیں گھر جانے دیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پولیس کو کچھ نہیں بتائیں گے۔''

''صرف ایک رات میں خدا یاد آ گیا۔'' جاوید نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''پندرہ کروڑ۔۔۔ تاوان ادا کرنے کی صورت میں۔۔۔''

''پندرہ کروڑ۔۔۔'' نسرین کو چند لمحوں کے لیے غش آ گیا۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں۔۔۔''

''ایک ڈاکو ڈاکٹر کے پاس اتنی رقم نہیں۔۔۔؟'' جاوید نے کہا۔ ''پھر آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہر سال آپ، آپ کی بیگم اور آپ کے بیٹا بیٹی نئے ماڈل کی گاڑیاں خریدتے ہیں۔ آپ کے اس شہر اور اسلام آباد میں رہائشی اور کمرشل دس پلاٹ ہیں۔۔۔ آپ دو ہزار گز کے رقبے پر ایک نیا اور جدید ترین میڈیکل کمپلیکس کی تعمیر آئندہ سال شروع کرنے والے ہیں۔ جس پر ڈیڑھ ارب کی لاگت آئے گی۔ آپ کا بینک بیلنس اور آپ کی اہلیہ کا بھی کروڑوں کا ہے۔ اس کے علاوہ کلینک کا بینک بیلنس دو بینکوں میں ایک ارب سے زیادہ ہے۔ آپ کے لیے پندرہ کروڑ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔''

پھر اس نے میز کی دراز سے ایک فائل نکال کر میرے سامنے ڈال دی۔ ''اس میں تمام اعداد و شمار اور بینک ڈپازٹ کے ثبوت ہیں۔ اگر آپ اسے جھٹلا سکتے ہیں تو جھٹلا دیں۔''

میں نے فائل اٹھا کر ورق گردانی کی تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ٹھوس شواہد تھے۔

''آپ لوگوں نے مہذب اور اعلا تعلیم یافتہ ہو کر تاوان کے پیشے کو اپنا لیا ہے۔'' میں کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''قانون کو ہاتھ میں لیے غلط راہ پر چل رہے ہیں۔ ایک بات یاد رکھیں۔ قانون کے ہاتھ سے آپ کبھی محفوظ نہیں رہیں گے۔''

''ایک نیک کام کے لیے کبھی غلط کام بھی کرنا پڑتا ہے۔'' جاوید کہنے لگا۔ ''یہ پندرہ کروڑ ہم اپنے لیے وصول نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان متاثرین کے لیے جو آپ کے ہاں ملازم تھے۔۔۔ ان مریضوں کی مالی مدد کے لیے جو آپ کے غلط انجکشن اور علاج سے مر گئے۔ ان کے احتجاج کے باوجود آپ کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔۔۔ اور پھر ڈاکٹر نسرین نے تین برسوں میں میجر آپریشن سے سات جانیں ضایع کیں۔ قانون ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کے لیے کوئی قانون نہیں۔۔۔ امریکا اور یوروپ ہوتا تو وہاں ایکشن لیا جاتا۔۔۔ اس کے علاوہ مزید ثبوت ہیں۔۔۔ آپ ہر سال گاڑیاں بدلتے ہیں لیکن اسٹاف کو کیا دیتے ہیں۔ یہ متاثرین کی فائل بھی ہے جو آج کل کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔''

پندرہ کروڑ کا تاوان ادا کرنے کے بعد جان چھوٹی۔ پولیس کو ہم نے یہ کہانی سنائی کہ ان بدمعاشوں نے رحم کھا کر ہمیں رہا کر دیا۔ ہم نے کوئی تاوان ادا نہیں کیا۔ اس لیے بھی کہ جو مغوی تاوان ادا کرتا تھا اسے پولیس کو دس فیصد کمیشن دینا پڑتا تھا۔

ہمارے کلینک میں جاوید کے بڑے بھائی چھ ماہ پہلے تک اکاؤنٹ افسر اور کیشیئر تھے۔ اس لیے جاوید کو صحیح صحیح معلومات ان سے حاصل ہوئی تھیں۔

چوتھی قسط

چمگادڑ

ایم اے راحت

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کا شکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔
زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی۔

عمران ڈائجسٹ کا پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

یہ سارا مسئلہ تقریباً حل ہو گیا تو بھاٹیہ نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

''اور تو مجھے بتا تو کون ہے، میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

میں دکھے دل کا مالک تھا، اب تک جو کچھ ہو چکا تھا، بس پتا نہیں اس میں حالات کی گردش تھی یا وقت کی کہانی، سب کچھ برداشت ہی کرتا رہا تھا، سوائے اس کے کہ اس کہانی میں موہنی شامل ہو گئی تھی اور میں بے بس ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت دل میں ایک آگ سی لگی اور دل چاہا کہ سب کچھ بھاٹیہ کے سامنے اگل دوں، پھر ایک بے خودی سی ذہن پر طاری ہو گئی اور میری زبان چل پڑی، میں نے ملکہ ہانس میں اپنے بھائیوں کے کردار سے لے کر لاہور آنے اور لاہور کے بعد باقی اب تک جو حالات پیش آئے تھے ان کی تفصیل بھاٹیہ کو سنا دی، بھاٹیہ کی آنکھوں میں ہمدردی کے آثار تھے۔ اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''اور کچھ۔۔۔؟''

''اور کچھ بھی نہیں بھاٹیہ صاحب، بس یہ ہے میری زندگی کی کہانی، آپ بہت اچھے انسان ہیں جو آپ نے مجھے سہارا دیا اور حقیقت کو منکشف کر دیا۔''

بھاٹیہ کے چہرے پر ایک دکھ بھری کیفیت نظر آنے لگی، تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا وہ کون لوگ ہیں جو تیرے پیچھے لگے ہیں، میں تیرے لیے بندوبست کیے دیتا ہوں، جہاں میں تجھے بھیج رہا ہوں وہاں تُو آرام سے رہ اور میں وہیں تجھ سے ملاقات کروں گا۔

جس جگہ بھاٹیہ نے مجھے بھیجا وہ بھاٹیہ کے گھر سے دور نہیں تھی، اس کا ایک بہت ہی خوب صورت باغ تھا، باغ میں ایک چھوٹا سا گھر بنا ہوا تھا، لیکن اس گھر کے نیچے ایک تہہ خانہ تھا جہاں میرے لیے بندوبست کیا گیا تھا، میں حیران تھا کہ بھاٹیہ کی شخصیت کیا ہے، بظاہر وہ ایک چھوٹے سے علاقے کا نمبردار تھا، لیکن یہ سب کچھ بڑا حیرت ناک تھا، چوبیس گھنٹے گزر گئے، میرے لیے کھانے پینے کا معقول بندوبست کر دیا گیا تھا جو پھلوں وغیرہ پر مشتمل تھا، اس کے بعد بھاٹیہ نے مجھ سے ملاقات کی، آیا اور بولا۔

''سن میرے لعل! میں تیرے لیے بہت سے فیصلے کر چکا ہوں جو تیرے حق میں بہتر ہوں گے اور سن، یہ مت سوچنا کہ مجھے تجھ سے کوئی لالچ ہو گا، اصل میں میری کہانی بھی تیری کہانی سے کچھ ملتی جلتی ہے، میں بھی اپنوں ہی کے ظلم کا شکار ہوا ہوں اور انہوں نے مجھے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، ایک طویل

عرصے تک میں نے ایک گروہ بنا کر زندگی گزاری ہے، جو اسمگلنگ کا کاروبار کرتا تھا اور اس کے بعد میں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور یہاں رہنے لگا، اب میں سکون سے ہوں۔ میری بات سن، جس لڑکی نے تُو نے کہانی سنائی اس نے اپنا نام تجھے موہنی بتایا تھا نا۔''

''ہاں۔''

''کیا اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کا باپ ہندوستانی تھا اور ماں بدھسٹ۔''

''ہاں۔۔۔ شاید یہ بات میں نے آپ کو بتائی تھی۔''

''نہیں بتائی، یہ میری معلومات ہیں میرے بچے! وہ بھی اسمگلنگ کے ایک گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ اسی قسم کے مافوق الفطرت کام کرتے ہیں اور کام کے انسان کو اپنے جال میں پھانس لیتے ہیں۔ یقینی طور پر وہ تجھ سے کوئی ایسا عمل چاہتی ہو گی جس کے تحت وہ کسی خزانے تک پہنچ جائے اور اسی خزانے کے بارے میں وہ گروہ جس نے تجھے مسٹر ایکس کا نام دیا تیرے پیچھے لگا ہے، کیونکہ اسے علم ہے کہ وہ لڑکی موہنی تجھے پھانس رہی ہے۔''

''تت۔۔۔ تو۔۔۔ تت۔۔۔ تو کیا مسٹر بھاٹیہ۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ یہ کئی گروہ کا کام ہے جو اپنے اپنے طریقے سے اپنے کام سرانجام دیتے ہیں، تجھے

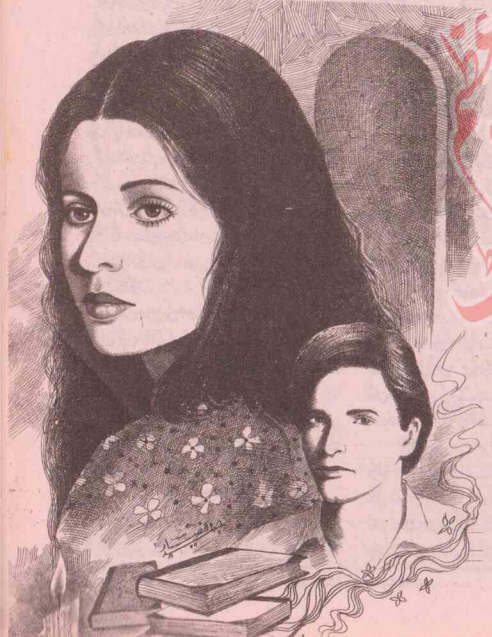

میرے پاس ایک لمبا عرصہ گزارنا ہوگا۔ میں تجھے بہت سی چیزوں سے آگاہ کروں گا، تیرے دل میں اپنے دیس واپس جانے کی آرزو تو نہیں ہے؟"

"نہیں، وہاں میرا ہے کون جس کے پاس جاؤں گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ دنیا دیکھ، میں تجھے دنیا دکھاؤں گا۔"

"مگر ایک بات بتائیے مسٹر بھاٹیہ! آپ نے موہنی کے بارے میں اتنا صحیح صحیح الفاظ کیسے ادا کیے جو بالکل حقیقت ہیں۔"

"بیٹے! میں نے کہا نا میں خود بھی ایک بڑا گینگسٹر رہ چکا ہوں اور میں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ان لوگوں کا کچا چٹھہ مجھے معلوم ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ کیا ہیں، چل چھوڑ ان باتوں کو تُو یہ سمجھ لے کہ تیرے ساتھ مسلسل فراڈ ہوا ہے پہلے تیرے بھائیوں نے کیا اور اس کے بعد اس لڑکی نے جو پتا نہیں تمہارے دیش میں کیا کر رہی تھی اور اس ٹوٹے کھنڈر تک کیسے پہنچی تھی۔ نہ تو پدم سدھارتھ ہے نہ کوئی اور، یہ پورا فراڈ کا کھیل تھا، مسئلہ وہی مقدس عہد یعنی اس لوح کا ہے جس میں کسی خزانے کا نقشہ موجود ہے مگر ایسی لوح کا آسانی سے مل جانا مناسب نہیں ہے ہاں اگر تو ذرا بھی کچا پڑا تو ان گروہوں کے چکر میں پڑ کر اپنی جان کھو بیٹھے گا۔"

میں بھاٹیہ کی صورت دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ میں نے آپ کو اپنی کہانی کیوں سنا دی مسٹر بھاٹیہ! بس دل چاہا تھا کہ آپ کے سامنے دل کھول دوں۔"

"اچھا کیا تو نے، گھائل کی گت گھائل جانے، میں بھی گھائل ہوں، تو بھی گھائل، اس لیے میرے من میں تیرے لیے پریم جاگ اٹھا ہے۔"

"تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میں تیرا تھوڑا سا سمے لوں گا، تجھے وہ سکھاؤں گا جو تیرے لیے ضروری ہو اور جہاں تک موہنی کی بات رہی اس کا پریم من سے نکال دے بیٹا! عورت کبھی قابل اعتبار نہیں ہوتی، وہ جھوٹ ہوتی ہے سر سے پاؤں تک جھوٹ۔"

"تو موہنی کوئی بھٹکی ہوئی آتما نہیں تھی۔"

جواب میں بھاٹیہ ہنسنے لگا، پھر بولا نہیں بالکل نہیں۔ وہ ایک جیتا جاگتا وجود ہے، مگر خبردار! کبھی مت سوچنا کہ وہ تجھ سے پریم کرے گی۔"

"مگر ایک بات بتائیے مسٹر بھاٹیہ!"

"ہاں بول۔"

"ایک دن وہ ہوٹل کی کھڑکی میں تھی اور جب وہ لوگ مجھ تک پہنچے تو وہ کھڑکی سے نکل کر فضا میں پرواز کر گئی۔ میں نے ایک چمگادڑ کو اڑتے ہوئے دیکھا تھا۔"

جواب میں بھاٹیہ خوب ہنسا پھر بولا۔ "یہ لوگ بڑے سائنٹفک انداز میں کام کرتے ہیں۔ وہ وہیں کہیں دیوار سے چپکی ہوگی اور تُو نے اس پر کسی چمگادڑ کا شبہ کر لیا۔ نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ سب اسمگلروں کا گروہ ہے۔"

بھاٹیہ کے اس تہہ خانے میں نہ جانے کب تک میں نے اس کے بارے میں سوچا اور پھر میری آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا، بھائیوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا یہ سب اس کا نتیجہ بھگت رہا تھا، مجھے ابھی دنیا میں اپنا مقام تلاش کرنا چاہیے، اپنی جگہ بنانی چاہیے اور اس کے بعد بھاٹیہ میرے لیے فرشتہ بن گیا۔ اس نے سب سے پہلے میرے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرائی اور ایک ایسی شکل مجھے دے دی جو میری پہلی شکل سے تھوڑی سی مختلف تھی لیکن ایسی کہ میں اپنے آپ کو ایک بدلے ہوئے انسان کی حیثیت سے روشناس کرا سکتا تھا۔

"یہ تیری پہلی ضرورت ہے تاکہ وہ لوگ تیرا پیچھا چھوڑ دیں اور اب میں تجھے کچھ نئے لوگوں سے بھی روشناس کراؤں گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میں چاہتا ہوں کہ تو جسمانی طور پر بھی بہت کچھ بن جائے۔" اور بھاٹیہ نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا، مجھے مارشل آرٹس کی تربیت دی گئی اور اس طرح ایک آدھ مہینے کے بجائے مجھے چھ سات مہینے لگ گئے، ان چھ سات مہینوں میں میری ملاقات مختلف لوگوں سے کرائی گئی اور آخر میں سب کچھ ہونے کے بعد بھاٹیہ نے کہا۔

"اور اب میں تجھے ایک ایسی مہم پر روانہ کر رہا ہوں جہاں تجھے عجیب و غریب کردار ادا کرنا پڑے گا۔ بھٹکی ہوئی ذہنیت کا مریض یعنی کھوئی ہوئی یادداشت والا۔"

"وجہ۔۔۔؟"

"میں نے کہا نا اس کی ایک وجہ ہے، تُو ان لوگوں کے کام سے واقف ہو چکا ہے، وہ تجھے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے، بہت سے کردار تیرے سامنے آئیں گے اور تجھے رجھائیں گے، لیکن تجھے بالکل ہی ایک الگ کردار اختیار کرنا ہے کیا سمجھا؟"

میں نے ہنس کر گردن ہلا دی تھی، کیا تھا کیا بن گیا تھا۔ اتنا بھروسا ہو گیا تھا مجھے اللہ کی ذات پر کہ اگر میں چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا، شہزاد کے روپ میں واپس جا کر اپنے بھائیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا تھا لیکن یہ میں کبھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار وہ میرے بھائی تھے۔ پھر بھاٹیہ نے مجھے باہر کی دنیا میں بھیج دیا اور میں اپنے طور پر بہت سے کام سرانجام دینے لگا، ان میں بڑی بڑی مہمات ہوا کرتی تھیں، بہت سے کردار میرے قریب آئے تھے اور ان سے شناسائی بھی ہوئی تھی، وہ لوگ مجھے ٹائیگر کے نام سے جاننے لگے تھے۔ یعنی مسٹر ایکس کے بعد یہ میرا دوسرا نام تھا اور ٹائیگر کی حیثیت سے میں نے جو کارنامے سرانجام دیے ان پر بھاٹیہ نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا اس نے کہا تھا۔

"دیکھو ٹائیگر! دنیا میں دولت بہت بڑی ضرورت ہے اور خاص طور سے تم جیسے لوگوں کے لیے اب تم اپنے دیس واپس جاؤ گے تو ایک ایسی حیثیت لے کر جانا جس میں تمہارے لیے بہت بڑا مقام ہو، اور پھر اپنے بھائیوں کو اپنے پاس بلا کر ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا کیونکہ بڑا آدمی ہمیشہ بڑے کام کرتا ہے۔"

بھاٹیہ میرا استاد تھا، وہ واقعی برائیوں کا ہر دور چھوڑ چکا تھا لیکن اس نے اتنے لوگوں سے میرا تعارف کرا دیا تھا کہ اب میں ان کے لیے ایک بہت ہی اہم شخصیت بن گیا تھا، بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتا تھا، کئی ملکوں کا سفر کر چکا تھا اور ان دنوں میں لیبیا میں تھا جب مجھے ایک حادثہ پیش آیا میں ایک مہم پر روانہ ہوا تھا کہ بم دھماکا کا شکار ہو کر ایک تیز رفتار ندی میں جا گرا۔

ندی کا یہ سفر نہ جانے کتنا طویل رہا، لیکن اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک عجیب و غریب جگہ تھا جسے میں کوئی معنی نہیں پہنا سکا تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے، لیکن وہ مجھے خاصی عجیب اور پُراسرار سی لگی تھی۔ میں نے حیرت سے اپنے سے کوئی پانچ یا چھ فٹ بلند ایک سفید چھت کو دیکھا جو پہلے تو دیر تک میری سمجھ میں نہ آسکی لیکن پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سفید رنگ کا ایک خیمہ ہے اور میں اس خیمے میں فرش پر پڑا ہوا ہوں، میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور جسم کے دوسرے حصوں میں ہلکی ہلکی سوزش ہو رہی ہے۔ مجھے ایک دم یاد آیا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ کچھ اور کردار بھی میرے ساتھ تھے جن کا اب مجھے کوئی پتا نہیں تھا، بہت دیر تک میں اسی طرح لیٹا ہوا سوچتا رہا، بدن کو نقاہت کا احساس ہو رہا تھا اور اس نقاہت کی وجہ سر سے بہہ جانے والا خون نہیں تھا بلکہ شاید بھوک پیاس تھی۔ حلق بھی پیاس کی شدت کا شکار تھا اور اسی طرح پیٹ کا بھی احساس ہوتا تھا، چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کراہتا ہوا خیمے سے باہر نکل آیا، پھر یہی لگا جیسے عالم بالا کا سفر کر رہا ہوں منظر اور ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔

جیسے ہی میں باہر نکلا میں نے دو افراد کو دیکھا جو بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اچھل پڑے اور اجنبی زبان میں نہ جانے

کیا کیا کہنے لگے۔ پھر انہوں نے چیخ چیخ کر دوسروں کو آوازیں دیں اور پانچ چھ افراد میرے سامنے جمع ہوگئے ان کے لباس اور حلیے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ عربی النسل ہیں لیکن مسئلہ کیا ہے۔ میں نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا تو وہ میرے قریب آ گیا۔

''کیا تم انگریزی میں بات کر سکتے ہو؟''

''تھوڑی تھوڑی۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے جانتے ہو۔''

''ہاں کیوں نہیں۔''

''کون ہوں میں؟''

''زخمی۔''

''مطلب۔''

''زخمی کا مطلب ہوتا ہے۔۔ مگر تم کب ہوش میں آئے؟''

''جب بھی آیا اب تو تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہوں مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔''

''آقا شکار پر گیا ہوا ہے۔ ہمیں اس کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''کون آقا؟''

''اس کا نام ادب سے لو وہ تمہارا محسن ہے۔'' اسی شخص نے جواب دیا۔

''میں اپنے محسن کا نام تو جان سکتا ہوں نا۔''

''تم آقا نوشیرواں کے مہمان ہو۔''

''آقا نوشیرواں۔''

''ہاں۔''

''یہ کون سا علاقہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ صرف یہ شخص جو مجھ سے باتیں کر رہا ہے تھوڑی بہت انگریزی سے واقف ہے اور دوسرے لوگ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو نہ سمجھنے والے انداز میں سن رہے تھے۔ وہ چند لمحات کے بعد بولا۔

''کیا تمہیں اس کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔''

''نہیں میرے دوست میں نہیں جانتا۔''

''یہ الشمامہ کا ساحلی علاقہ ہے۔ الشمامہ کے بارے میں تو جانتے ہو۔'' میں ذہن پر زور دینے لگا لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ کچھ عجیب عجیب سے احساسات ذہن میں پیدا ہوگئے۔ مجھے دل ہی دل میں اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی اور میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلائی۔ اب اس سے زیادہ اس سے اور کیا پوچھتا۔ لیکن پھر وہ سب ہی مستعد ہوگئے۔ میں نے سامنے سے ایک نوجوان لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ عربی لباس میں ملبوس تھی۔ آدھے چہرے پر باریک نقاب پڑا ہوا تھا۔ لیکن سیاہ رنگ کا یہ خوبصورت نقاب اس کی روپوشی میں ناکام تھا اور بالوں کے جو گچھے پیشانی پر لٹک آئے تھے ان کا رنگ بھی گہرا سیاہ تھا۔ حسین آنکھیں اس کے بے مثال حسن کی نمائندگی کرتی تھیں۔ چلنے کے انداز میں ایک عجیب سی پھرتی تھی۔ بہرحال کائنات میں عورت کی موجودگی ماحول کے حسن کا اشارہ ہے اور میں اسے اس وقت دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ یہاں موجود پہرے دار جو اِن خیموں کے درمیان پہرہ دے رہے تھے گردن جھکا کر پیچھے ہٹ گئے اور آنے والی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب پہنچ گئی۔ اس کے حسین ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

''میں نے تمہیں دور سے دیکھ لیا تھا۔ تم کئی دن کے بعد ہوش میں آئے ہو۔ کیا تم اپنے حواس میں ہو؟''

میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''میرا نام اشواریہ ہے۔ یہاں کے لوگ مجھے بیگم اشواریہ کہتے ہیں اور میں آقا نوشیرواں کی بھتیجی ہوں۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں خاتون اشواریہ اور لاتعداد سوالات میرے ذہن میں بکھرے ہوئے ہیں، جانتا ہوں کہ کمال مہربانی سے کام لے کر آپ

نے مجھے یہاں جگہ دی ہے اور یہ بات بھی میرے لیے تعجب خیز ہے کہ میں کئی دن بے ہوش رہا ہوں ہر انسان کو اپنے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے اور آپ کی ان مہربانیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو کہاں سے دستیاب ہوا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہارے حواس قائم ہوئے۔ دیوانگی کے عالم میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تمہارے بارے میں بتاتی ہوں۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ کاش! یہ دیوانگی مجھ پر ہمیشہ کے لیے مسلط ہوجاتی۔ ذہن ہزاروں سوچوں سے آزاد ہوجاتا۔ کم از کم دل میں وہ احساسات تو نا ابھرتے جو لاکھ اپنے آپ کو سمجھانے کے باوجود میری ذات پر مسلط ہوجاتے تھے۔ اچھے خاصے خیمے لگے ہوئے تھے۔ خیموں کا باقاعدہ شہر سا آباد تھا۔ لیکن آقا نوشیرواں اور خاتون اشواریہ اور پھر یہ سب۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس بڑے خیمے میں داخل ہوگیا۔ جس کے بارے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ شان دار ہوگا۔ جنگل میں منگل منایا جاسکتا ہے۔ دولت مندوں کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں چلتے پھرتے عظیم الشان گھر جنہیں ٹرالر کہا جاتا ہے۔ اپنی اپنی جگہوں پر فروکش زندگی کو کتنے انوکھے انوکھے رنگ دیے گئے ہیں۔ ایک طرف پشت پر وزنی بوجھ جو کبھی نہیں اترتا اور چند پیسوں کے لیے انسان کو جانوروں کی طرح مصروف رہنا پڑتا تھا۔ دوسری طرف زندگی کے یہ عیش و عشرت جنہیں دیکھ کر رشک آئے۔ خاتون اشواریہ نے یہاں بھی محل سرا بنالیا تھا۔ اس عظیم الشان خیمے کی سجاوٹ دیکھنے کے قابل تھی۔

بہرحال مجھے کمال مہربانی سے بیٹھنے کی پیشکش کی گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی؟''

''جی خاتون اشواریہ!''

تھوڑے فاصلے پر دو اور خوبصورت لڑکیاں مستعد کھڑی ہوئی تھیں۔ الف لیلیٰ کا ماحول محسوس ہو رہا تھا۔ خاتون اشواریہ نے کہا۔

''مہمان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لائی جائیں۔'' تعمیل مکمل ہوئی دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں تو خاتون اشواریہ نے کہا۔

''میں تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اور میرے بھائی یہاں بہت عرصے سے فروکش ہیں۔ آقا نوشیرواں گھوڑوں کے تاجر ہیں اور ان علاقوں میں گھوڑوں کی اچھی نسلیں پائی جاتی ہیں۔ یہاں ان کی باقاعدہ افزائش ہوتی ہے۔ پھر آقا یہ گھوڑے پکڑ کر ان کی تربیت کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ الشمامہ کے اطراف کے ممالک میں ایکسپورٹ کردیئے جاتے ہیں۔ میں ان کی بھتیجی ہوں اور یوں سمجھ لو کہ ان کے لیے اولاد کی مانند کیونکہ آقا نوشیرواں نے شادی نہیں کی۔ ہم لوگ یہاں فروکش تھے کہ ہم نے تمہیں دیکھا پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ حکیم الفضل نے کہا کہ یہ شخص دیوانہ ہے لیکن کسی حادثے نے اسے دیوانہ کردیا ہے۔ حکیم الفضل تمہیں مصنوعی خوراک دیتے رہے ہیں اور ان کا کہنا تھا کہ ایک دن تم اپنے پورے حواس میں آ کر ہمیں اپنے بارے میں بتاؤ گے۔''

میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ حیرت کا جتنا بھی غلبہ مجھ پر نہ ہوتا کم تھا۔ کیا پر لطف زندگی ہے انوکھی انوکھی کیفیتوں سے دوچار لیکن اس وقت میں اپنے اندر کسی قسم کی دیوانگی یا کمی نہیں پا رہا تھا۔ ہوش و حواس قائم تھے۔ سوچ سمجھ سکتا تھا۔ آہ کیا مشکل زندگی ہے۔ سوچوں سے لاکھ پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن پیچھا نہیں چھوٹتا، لمحوں میں فیصلہ بھی کرنا تھا۔ یہ آقا نوشیرواں بے ضرر آدمی معلوم ہوتا تھا کم از کم میرے لیے۔ میں اپنے خلاف کسی قسم کی سازش کا تعین نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اگر اپنے آپ کو گم ہی

رہنے دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اب کس کس کو اپنی بے تکی داستان سناتا رہتا۔ لمحوں میں یہ فیصلہ کرلیا کہ دنیا کی نگاہوں میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں اور کچھ یاد نہیں ہے۔ سب کچھ بے کار تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد کھانے پینے کی اشیا آ گئیں جنہیں احترام سے میرے سامنے رکھ دیا گیا اور خاتون اشوار یہ نے کہا۔

''تکلف کرو گے تو مجھے پسند نہیں آئے گا شکم سیر ہو جاؤ حکیم الفضل نے بھی یہ ہی کہا تھا۔'' حکیم الفضل غالباً میرے معالج کا نام تھا بہر حال ایک دلکش ماحول نگاہوں کے سامنے تھا اور میں جو ہمیشہ ہی کھلونوں کی طرح مختلف ہاتھوں میں جاتا رہا تھا۔ یہاں بھی ذہنی طور پر کھلونا بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے کھانے پینے کی اشیا کی جانب ہاتھ بڑھا دیا اور بدن کو توانائی ملنے لگی۔ خاتون اشوار یہ خاموش بیٹھی مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ فی الوقت تو میری سرپرست تھی وہ۔ میں اسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت کیسے دے سکتا تھا۔ البتہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس حسین عورت کے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش بن رہی ہے۔ کھانے سے فراغت حاصل ہو گئی تو ایشوا یہ نے کہا۔

''آؤ، اب باہر کی سیر کرو ہم عارضی طور پر یہاں قیام پذیر ہیں اس کے بعد واپس الشمامہ چلے جائیں گے۔ الشمامہ میں ہمارا محل ہے۔ آقا نوشیرواں الشمامہ کے معزز لوگوں میں سے ہے تمہیں اس سے مل کر خوشی ہو گی۔'' میں باہر نکل آیا اور خیموں کے اس شہر میں گردش کرنے لگا۔ خاتون اشوار یہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اپنے خیمے میں رہ گئی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ باقی لوگ جو وہاں خادموں کی حیثیت رکھتے ہیں میرے ساتھ بہتر سلوک کر رہے ہیں۔ کم بخت سوچیں کتنا ہی ان سے پیچھا چھڑاؤ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں بلکہ ذہن پر حملہ آور ہو رہی ہیں۔ ہر قدم پر ایک نئی یاد دل میں ابھر آتی ہے اور اب مجھے ان یادوں سے نفرت ہو گئی تھی بلاوجہ دل کا دکھ بن جاتی ہیں۔ خیموں سے باہر ہٹ کر میں نے دور دور تک بکھرے ہوئے ماحول کو دیکھا جنگل بکھرے ہوئے تھے۔ کھجوروں کے درخت جا بجا نظر آرہے تھے ہریالی بھی تھی۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ان جنگلوں میں درندے بھی بکثرت پائے جاتے ہوں گے۔ نہ جانے کس طرح یہاں تک پہنچا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر میں نے دور سے کچھ لوگوں کو آتے ہوئے دیکھا عجیب سا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ چار جیپیں تھیں۔ جن میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار بھی تھے لیکن چاروں جیپیں ترتیب سے چل رہی تھیں اور جو عجیب منظر تھا وہ یہ تھا کہ جیپوں سے رسے بندھے ہوئے تھے اور یہ رسے چند گھوڑوں کے جسموں سے بندھے ہوئے تھے۔ جیپیں بڑی ترتیب سے ڈرائیو کی جا رہی تھیں۔ غالباً سرکش اور جنگلی گھوڑوں کو پکڑا گیا تھا۔ انہیں جیپوں سے باندھ کر لایا جا رہا تھا۔ پانچ گھوڑے تھے۔ جن میں سے دو سفید ایک براؤن اور دو سیاہ تھے۔ براؤن گھوڑا درمیان میں تھا اور وہی سب سے زیادہ سرکش معلوم ہوتا تھا۔ یہ دلچسپ منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ جیپیں آہستہ آہستہ اسی کیمپ کی طرف آرہی تھیں اور تمام خدام نکل کر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ خاتون اشوار یہ مجھے آقا نوشیرواں کے بارے میں بتا چکی تھیں اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ آقا ہی ہے جو واپس آرہا ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ کھیل تھا اور اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے رگ وپے میں ایک سرسراہٹ سی ہو رہی تھی۔ پھر گھوڑے پر آنے والے تین [illegible] جیپوں سے پہلے یہاں پہنچ گئے۔ ایک دراز قامت اور ورزشی جسم کا مالک شخص جس نے شکار کا مخصوص لباس پہنا ہوا تھا۔ گھوڑے سے نیچے اترا اور خداموں کو ہدایت دینے لگا۔ میں ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ جیپیں قریب آئیں تو بہت سے خدام رسّوں کے پھندے بنا کر تیار ہو گئے۔ پھر چار افراد نے رسوں

کے پھندے بڑی مہارت سے سامنے والے گھوڑے کی گردن میں پھینکے اور اسے پھندوں میں [illegible] لیا اب ان کے سرے ان کے ہاتھ میں تھے اور [illegible] ہاتھ میں چابک تھے۔ جیپ والوں نے [illegible] احتیاط سے سیاہ رنگ کے گھوڑے کے رسے کھولے، غالباً یہ بھی بڑی احتیاط سے بنائے گئے تھے اور دور سے ہی انہیں کھولنا اور بند کرنا ممکن تھا۔ چنانچہ گھوڑا جیپ کی بندشوں سے آزاد ہو گیا اور اچھل کود [illegible] نے لگا۔ لیکن وہ چاروں خدام جنہوں نے گھوڑے کے رسے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ بڑی مہارت کے ساتھ گھوڑے کو جھٹکے دے دے کر زچ کر [illegible] تھے۔ یہاں تک کہ گھوڑے کی اچھل کود ختم ہو گئی اور [illegible] لوگ اسے لیے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ [illegible]۔ باقی گھوڑوں کو ابھی تک جیپوں سے کنٹرول کیا [illegible] رہا تھا اور وہ دراز قامت شخص جس کی شان و شوکت [illegible] کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ آقا ہی ہے۔ اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ خیموں کی اس بستی کے عقب میں گھوڑوں کے لیے عارضی جگہ بنائی گئی تھی اور اس کے [illegible] ملازمات بھی مہارت کے حامل تھے۔ پھر باقی گھوڑوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا۔ لیکن براؤن رنگ کا وہ گھوڑا کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تھا۔ وہ تھا بھی بے حد طاقت ور اور اس کی اچھل کود قابل دید تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے بدن میں ایک [illegible] سی پیدا ہو رہی تھی۔ براؤن رنگ کے [illegible] نے ایک طرف دوڑ لگائی تو اس کی مخالف [illegible] میں موجود خدام اسے قابو نہ کر سکے اور بری طرح اس کے ساتھ کھنچنے لگے۔ یہاں تک کہ پتھروں [illegible] ٹکرائے اور ان کے ہاتھوں سے رسیاں چھوٹ [illegible] گئیں۔ گھوڑا اس سمت دوڑ پڑا جدھر باقی دو خدام [illegible]۔ وہ دونوں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے [illegible]۔ پھر یہ اتفاق ہی تھا کہ گھوڑا میرے قریب سے گزرا تھا اور اتنے قریب سے گزرا تھا کہ میں اس کی [illegible] میں بھی آ سکتا تھا لیکن بس قدرتی طور پر ہی یہ [illegible] تھی۔ گھوڑا جیسے ہی میرے قریب آیا میں نے برق کی سی تیزی سے اس کی پشت پر چھلانگ لگا دی پہلے اس کی گردن پر پہنچا اور پھر کھسک کر پشت پر آ گیا۔ وہ دونوں خدام جو اسے سنبھالنے کی کوششوں میں مصروف تھے لڑکھڑا گئے تھے اور ان کی کیفیت بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہوئی۔ گھوڑا ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا لیکن اب میں اس کی پشت پر موجود تھا۔ نہ جانے زندگی کے کون سے حصے گھڑ سواری کی کچھ مشق ہوئی تھی کچھ یاد نہیں تھا۔ جنگلی گھوڑا اپنی پشت پر کسی کو پا کر اپنی زندگی کی بدترین جدوجہد کرنے لگا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کی گردن میں پڑے ہوئے پھندے کی رسی میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ یہ اسے کنٹرول کرنے کا کوئی موثر ذریعہ نہیں تھا لیکن میں نے اس رسی کو اتنا کس کے پکڑا کہ گھوڑے کی گردن کھنچنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ دیوانگی کا کون سا درجہ تھا۔ جو اس وقت مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ میرے دل میں صرف ایک خواہش تھی کہ یہ سرکش گھوڑا رام ہونا چاہیے۔ پتا نہیں یہی طریقہ ہوتا ہے یا صرف اس وقت میں اس میں غیر اختیاری طور پر کامیاب ہو رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی گردن میں پڑی ہوئی رسی کو سختی سے سخت کر لیا۔ گھوڑا بیس بیس قدم کھڑے ہو کر چل رہا تھا۔ لیکن اس وقت بھی رسی ہی مجھے اس کی پشت پر بیلنس کیے ہوئے تھی۔ میرے دونوں پاؤں آہنی کڑوں کی مانند اس کی پشت میں پیوست ہو گئے تھے اور میں گھٹنوں سے اس کی پسلیوں پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ میں نے ایسا کیوں کیا تھا یہ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔ بس دلچسپی کا ایک عنصر وجود میں پیدا ہوتا تھا اور میں نے یہ عمل کر ہی ڈالا تھا۔ گھوڑے کی گردن گھٹ رہی تھی اور اب وہ سیدھا دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا منہ آسمان کی جانب اٹھا ہوا تھا اور میں تقریباً ایک فرلانگ کے ایریا میں اسے بری طرح رگیدتا پھر رہا تھا۔ میں نے غور نہیں کیا تھا کہ وہ لوگ میری طرف متوجہ ہیں یا نہیں بس دل میں ایک خیال تھا کہ اس گھوڑے کو میرے قبضے میں ہونا چاہیے پھر کافی جدوجہد کے بعد گھوڑے میں تھکن کے آثار

نمودار ہو گئے۔ اصل میں اس کی پشت سے چپکے رہنا ایک مسئلہ تھا اور میں اس مرحلے سے گزر گیا تھا اس مرتبہ گھوڑے نے اپنے دونوں آگے کے پاؤں اٹھائے اور اس کے بعد جب زمین پر رکھے تو وہ سیدھا ہو گیا۔ میں نے رسی کو آہستہ سے ڈھیل دینا شروع کی گھوڑا اب کھڑا ہو گیا تھا اور میں کافی فاصلے پر چیخنے چلانے کی آوازیں سن رہا تھا۔ گھوڑے کو قابو میں کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ یہ اب سرکشی کا ارادہ نہیں رکھتا تو میں نے اس کا رخ تبدیل کیا اور آہستہ آہستہ اسے چلاتا ہوا اس جگہ تک لے آیا جہاں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ خاتون اشواریہ کو میں نے اس دراز قامت شخص کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھا تھا، دراز قامت شخص حیرت سے آنکھیں اور منہ کھولے کھڑا ہوا تھا۔ گھوڑا تو اب بالکل ہی موم ہو گیا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میرے اترنے کے باوجود وہ کوئی حرکت نہیں کرے گا تو میں اس کی پشت سے اتر آیا۔ اس کی رسی اب بھی میرے ہاتھ میں بندھی ہوئی تھی۔ خدام میری جانب دوڑے اور میں نے گھوڑے کی رسی ان کے حوالے کر دی۔

گھوڑے نے غالباً اب حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اتنی خاموشی سے وہ چلا گیا تھا کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور اس کے بعد اچانک میں نے تالیوں کی آوازیں سنیں، بہت سے لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ دراز قد آدمی میری جانب بڑھا اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک تھی۔ خاتون اشواریہ مسکرا رہی تھی، دراز قد آدمی نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولا۔

"مبارک باد پیش کرتا ہوں کمال کے شہ سوار ہو۔ اس سے پہلے یہ کمال میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اب تو مجھے اشواریہ کی فراست پر رشک ہو رہا ہے۔ اسی نے تمہیں دریافت کیا ہے اور بھلا اب اس بات کی گنجائش کہاں کہ تم ہم سے جدا ہو جاؤ۔ اشواریہ اپنی اس اولاد کو سنبھالو ہمارے لیے بے حد کام کا انسان ہے۔ مگر اس نے اپنا نام نہیں بتایا ہمیں، شہ سوار تمہارا نام کیا ہے؟"

جواب میں شکست خوردہ نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"اجنبی۔"

"کیا مطلب؟"

"یقین کیجیے، میں اپنے آپ سے اجنبی ہوں۔" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ یہ میرے اس منصوبے کا پہلا حصہ تھا جو میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔

"اور جب آپ کو میرے ان الفاظ کی وجہ معلوم ہو گی تو آپ مجھ پر جھنجھلانے کے کی بجائے ہمدردی کا اظہار کریں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو ہم ذرا ان باقی گھوڑوں کو بھی اصطبل پر پہنچا دیں۔" اس نے کہا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔ اشواریہ میرے قریب پہنچ کر بولی۔

"آؤ۔۔۔ تمہیں اپنا خیمہ یاد ہے۔"

"نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ آؤ میں تمہیں تمہارے خیمے تک پہنچا دوں۔" نہ جانے کیوں ان لوگوں نے مجھے وہاں رہنے نہیں دیا تھا۔ ایشواریہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی تمہیں اپنا نام یاد نہیں آیا۔"

"جو لوگ بے لوث کسی پر احسان کرتے ہیں اور کسی کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں تو بھلا کس کا دل چاہے گا کہ ان سے غلط بیانی کرے۔ حقیقت یہ ہے خاتون اشواریہ کہ میں اپنے آپ سے ناواقف ہوں۔ نہ جانے کیا، کیا بھول گیا ہوں۔ بس اتنا یاد ہے کہ انسان ہوں اور دنیا میں طویل عرصے سے جی رہا ہوں۔"

"حکیم الفضل باکمال حکیم ہے۔ وہ تمہارا علاج کرے گا اور تم ضرور اپنے آپ کو یاد کر لو گے۔ کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ یہ گھڑ سواری کہاں سے سیکھی۔ آقا نوشیرواں تو شدید حیران ہیں کہ کیا ہی اعلا شہ سوار انہیں ملا ہے اور اب وہ تم سے بہت خوش ہیں اور میرا

خیال ہے تمہیں ان کے درمیان جگہ مل جائے گی اور جو لوگ آقا نوشیرواں کی پسندیدگی حاصل کر لیتے ہیں انہیں زندگی میں خوش حالی اور خوش بختی نصیب ہوتی ہے۔ تم اپنے خیمے میں آرام کرو۔ وقت پر ہم تمہیں تکلیف دیں گے۔"

میں خاموشی سے اسی خیمے میں داخل ہو گیا۔ جس میں مجھے ہوش آیا تھا اور اس کے بعد اپنی کارکردگی کا اندازہ لگانے لگا۔ ویسے درحقیقت گھوڑے کو قابو میں کرنے کا طریقہ خود میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں نے یہ عمل کر ڈالا تھا۔ لیکن آقا نوشیرواں کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جو جذبات میں نے دیکھے تھے، اس سے مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی یہاں میرا کچھ کام بن جائے گا۔ ایک تھکن سی دل و دماغ پر غالب تھی۔ بس سو جانا چاہتا ہے۔ ایسی نیند جس میں کوئی مشکل تردد نہ ہو۔ کاش! مجھے اس کا موقع مل جائے۔ پھر دن گزر گیا، میں نے اس کے بعد خیمے سے باہر نکل کر باہر کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ اس کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور بولا۔

"آقا نے طلب کیا ہے۔" میں باہر نکل آیا، فضا میں گوشت بھننے کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ ماحول بہت ہی خوش گوار تھا۔ خاتون اشواریہ کے بڑے خیمے کے عقبی حصے میں ایک اور شان و شوکت والا خیمہ لگا ہوا تھا۔ جس کے اردگرد خدام گھوم رہے تھے۔ ایک کھلی جگہ پر قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر آقا، خاتون اشواریہ اور کچھ اور افراد تھے۔ مصنوعی روشنیاں جلائی گئی تھیں جو قیمتی شمع دانوں کی شکل میں تھیں اور یہ شمع دان جگہ جگہ نصب کیے گئے تھے۔ آقا قالین پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے لوگ مرتبے کے مطابق دوزانو بیٹھے تھے۔ آقا نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اجنبی!" اور پھر ہنس پڑا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا تو ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا۔

"اس طرف آؤ اور بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں۔۔۔ اسے میرے قریب آنے دو۔ خاتون اشواریہ! تمہاری اولاد آداب سے ناواقف ہے۔" میں نے دوسری بار یہ الفاظ سنے تھے۔ عجیب سے الفاظ تھے جو سمجھ میں نہ آئے۔ یہ اولاد کا کیا مطلب تھا۔ بہرحال میں قریب پہنچ کر دوسرے لوگوں کے انداز میں دوزانوں بیٹھ گیا تو آقا ہنسنے لگا، پھر بولا۔

"نہیں جوان۔۔۔ جو جانتے ہو وہ کرو، کیونکہ تمہارے بارے میں آخری فیصلہ تو بعد میں ہو گا۔ کم از کم اس طرح سے ہم تمہاری شخصیت سے تو واقف ہو سکیں گے۔ ہاں ذرا یہ بتاؤ ماضی میں کیا گزری تمہارے ساتھ۔ کیا تمہیں اس بات کا علم ہو گیا کہ تم ہمیں پہاڑوں میں بھٹکتے ملے تھے۔ خاتون اشواریہ ایک اسی سالہ خاتون ہیں۔ تمہیں یہاں لے آئیں حکیم الفضل نے تم پر اپنی حکمت آزمائی اور حکیم الفضل کے تو ہم قائل ہیں کہ وہ اپنی حکمت میں بے مثال، لیکن اب یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں، تمہاری ماضی کی کچھ باتیں یاد آتی ہیں؟"

"اگر ایسا ہوتا آقا! تو میں سب سے پہلے آپ کی مہربانیوں کا صلہ اسی شکل میں دیتا کہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔"

"حکیم الفضل آگے آؤ۔" آقا نے کہا اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں ایک عمر رسیدہ آدمی جو بہترین صحت کا مالک تھا، اٹھ کر آگے آیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے تھوڑی سی گردن خم کی اور اس کے بعد سیدھا ہو کر دوزانوں بیٹھ گیا۔

"ویسے تو ہم نے یادداشت گم ہو جانے کے لاکھوں واقعات سنے ہیں۔ اس نوجوان کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"عالی مرتبت! میں دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سر پر لگنے والی چوٹ دماغ کے خلیوں کو مضطرب کر دیتی ہے اور انسان کچھ عرصہ کے لیے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اگر یہ کچھ مخصوص

وقت میرے زیر علاج رہے تو میں دماغی قوتوں کو یکجا کرنے والی دوائیں دے کر اس کی یادداشت واپس لاسکتا ہوں۔"

"یہ خوب صورت نوجوان! جس نے چند ہی لمحوں میں ہمارے دل میں اپنے لیے بہت بڑا مقام بنالیا ہے۔ ہمارے لیے بہترین ثابت ہوسکتا ہے اور اگر ہم اسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں تو یہ بھلا کیسے کہاں جاسکتا ہے کہ یہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا اور ایک بے منزل، بے نشان شخص کو ہم اس طرح دربدر بھٹکانے کے لیے تیار نہیں۔ اے شخص۔۔۔تو جو اپنے آپ کو اجنبی کہتا ہے۔ اگر اپنے ہوش وحواس میں ایک سرکش گھوڑے کو رام کرسکتا ہے تو یہ بھی سوچ سکتا ہوگا کہ ہم تیرے لیے برے انسان ثابت نہیں ہوں گے اور جب تک تیری یادداشت واپس نہ آجائے، جب تک تو اپنے ماضی کو نہ جان لے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تو ہمارے ساتھ رہے۔" میں نے آقا کو دیکھا اور کہا۔

"حالانکہ کسی کی ہمدردی اور محبت کو اس طرح رسوا نہیں کرنا چاہیے۔ میں تو یہ سوچتا ہوں آقا! کہ میں آپ کی اس مہربانی کا کیا جواب دے سکوں گا۔"

"جواب ہم لیں گے تم سے، جس سرکش گھوڑے کو تم نے رام کیا وہ معمولی نہیں تھا اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس کے لیے ہمیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ہماری یہ صفت کیا کم ہے کہ تم تو ہمارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوسکتے ہو اور اگر تمہیں تمہارا ماضی یاد آجائے اور اس کے باوجود تم یہ پسند کرو کہ ہمارے ساتھ رہو تو ہم تمہیں اس کی دعوت دیتے ہیں اور تمہیں ایک عزت کا مقام بھی۔ اب ہم یہاں زیادہ قیام نہیں کریں گے کیونکہ ہم اپنا ہدف حاصل کرچکے ہیں اور اس کے بعد واپسی ہمارے لیے ضروری ہے کیونکہ ہمیں اپنے کچھ دوستوں کا بھی استقبال کرنا ہے۔ سو بہتر ہوگا کہ اب تم ہمارے ساتھ مسکن پر چلو، لیکن اجازت ضروری ہے تم سے۔۔"

"میں شکرگزاری کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور آقا خوش ہوگیا۔ اس نے اشواریہ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اور یہ اشواریہ۔۔۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ساٹھ سال کا پیدا کیا اور یہ اپنی زندگی کے مزید بیس سال گزار چکی ہیں۔ اپنے آپ کو تمہاری ماں کہتی ہیں۔ چنانچہ والدہ محترمہ کو احترام دو اور یہ تمہاری نگرانی کریں گی۔" اشواریہ ہنسنے لگی اور ایک بار پھر مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ گزرے ہوئے لمحات یاد آئے۔ عجیب سی بات کہی تھی اس نے، پھر خاتون اشواریہ نے کہا۔

"اور جب تک تمہیں تمہارا نام یاد نہ آئے میرے بچے! اگر میں تمہیں فرزان کہوں تو کیا بہتر نہ ہوگا۔ ویسے بھی یہ نام مجھے پسند ہے۔"

"یعنی ہوش مند۔۔۔ اچھا نام ہے۔ ہمیں پسند آیا۔ لیکن فرزان کے ساتھ کچھ اور شامل نہیں کیا جائے گا۔"

"نہیں۔۔۔ یہ تو ایک شناخت ہے اور ایک دعا ہے اس کے لیے۔ ہوش مندی اس کے قدم چومے۔ بس اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔" خاتون اشواریہ نے کہا۔ ایک خادم نے آکر کھانا تیار ہوجانے کی اطلاع دی تو آقا نے کھانا لگانے کے لیے کہہ دیا۔ بھنے ہوئے ہرن اور نیل گائے، تانبے کی بہت بڑی تھالیوں میں رکھ کر لائی گئیں اور تمام لوگ ان کے گرد بیٹھ گئے۔ آقا بھی تھا۔ خاتون اشواریہ بھی حکیم الفضل بھی اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ تھے اور میں بھی اس میں شامل تھا۔ میں اب اپنے آپ کو ان دلچسپیوں میں گم پا رہا تھا اور یہ محسوس کررہا تھا کہ یہ سب کچھ دلکش ہے۔ دیکھیں تقدیر نے جو نئے کھیل کا آغاز کیا ہے اس کا انجام کب ہوتا ہے اور ذہنی طور پر میں نے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ وقت گزاری کے لیے تیار کرلیا۔ یوں کھانا کھایا گیا۔ ایک عجیب سا ماحول تھا۔ جس میں مجھے لطف آرہا تھا اور اب اس نئے نام کے ساتھ جینے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

یہ رات بھی گزر گئی اور دوسرے دن یہاں سے واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بڑا زبردست انتظام کیا گیا تھا۔ دوپہر کو ایک بہت بڑا اور کھلی چھت کا کنٹینر لایا گیا جو غالباً ایک طویل سفر طے کرکے یہاں تک پہنچا تھا۔ پھر گھوڑوں کو اس کنٹینر میں چڑھایا گیا، چودہ گھوڑے تھے جنہیں رسیوں کے بنے ہوئے جال میں قید کردیا گیا۔ کنٹینر کے ساتھ دو ٹرک بھی آئے تھے۔ چار جیپیں تھیں۔ اس طرح یہ عظیم الشان قافلہ یہاں سے روانہ ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے خاصا عزت واحترام دیا جارہا ہے۔ خاتون اشواریہ میرے لیے ایک عجیب وغریب اور پُراسرار عورت تھی۔ نوخیز اور حسین لیکن واقعی اس کے انداز سے بوڑھاپن ٹپکتا تھا۔ بہت سوں کو وہ بیٹا کہہ کر بلاتی تھی اور وہ سب بھی اس کا اسی طرح احترام کرتے تھے۔ یہ ایک دلچسپ کردار تھا میرے لیے اور میں یہ محسوس کررہا تھا کہ مجھ پر بھی اس کی خاصی توجہ ہے بہرحال زندگی ایک نئے سفر کا آغاز کرچکی تھی اور میں نے بھی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اس میں پوری پوری دلچسپی لوں گا۔ آخرکار سفر کا اختتام ہوگیا اور یہ اختتام جس جگہ ہوا تھا۔ میں نے اس کا تصور کرلیا تھا۔ آقا کی جو شخصیت نظر آرہی تھی۔ اس کے مطابق اسے ایسی ہی جگہ کا مالک ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایک باقاعدہ محل نما عمارت تھی۔ طویل وعریض رقبے میں پھیلی ہوئی۔ اس قدر خوب صورت کہ نگاہ نہ ٹھہر پائے۔ ایسے حسین سبزہ زار موجود تھے اندر کہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ اصلی ہیں۔ دنیا کے حسین ترین پھول یہاں سجائے گئے تھے۔ نایاب درختوں کی بہتات تھی اور بڑے بڑے سوئمنگ پول بنے ہوئے تھے۔ اصل عمارت داخلی دروازے کے بائیں سمت تھی۔ داہنی سمت چھوٹے چھوٹے مکانات بکھرے ہوئے تھے۔ جو یقینی طور پر سرونٹ کوارٹر کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے۔ ایک اور درمیانہ درجے کی عمارت غالباً انیکسی کی شکل رکھتی تھی۔ گاڑیاں اندر داخل ہوگئیں اور میں اس پورے ماحول کو دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھتا ہوا آخرکار اس جگہ اتر گیا جہاں دوسرے تمام لوگ اترے تھے۔ آقا تو اندر چلا گیا۔ لیکن اشواریہ یہاں رہ گئی تھی۔ اس کے قریب آنے والے ملازمین میں سے ایک سے کہا۔

"معزز مہمان کو انیکسی میں لے جاؤ اور ان کے قیام کا معقول بندوبست کرو۔ یہ آقا کا حکم ہے۔"

خادموں نے گردن ہلادی۔ پھر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ انیکسی کو انیکسی صرف کہا جاسکتا تھا۔ انتہائی خوب صورت عمارت تھی۔ مجھے جس جگہ پہنچایا گیا وہ انیکسی کی پہلی منزل تھی۔ اوپری منزل میں کون تھا۔ اس کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ اس پہلی منزل کا پورا فلور میرے لیے مخصوص کردیا گیا۔ کئی بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک ڈرائنگ ہال تھا۔ سارے کے سارے اعلا پائے کے فرنیچر سے آراستہ حسین پردے اور ضرورت کی وہ تمام چیزیں جو کسی شان دار رہائش گاہ میں کسی اعلا درجے کی شخصیت کے لیے ہوسکتی تھیں۔ بہرحال میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اب جو بھی صورت پیش آئے میں اس کے لیے تیار تھا۔ پھر ایک ملازم میرے پاس پہنچ گیا اور اس نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام عالی ہے۔ آپ کی غلامی میں دیا گیا

ظالم شوہر

نفسیات کا ایک پروفیسر مختلف مواقع پر انسانی رویوں کی وضاحت کررہا تھا۔ اس نے کہا۔

"وہ آدمی جو غلطی پر ہو اور ہار مان لے وہ عقل مند ہوتا ہے اور وہ آدمی جو درست مؤقف رکھنے کے باوجود ہار مان لے تو وہ کون ہوتا ہے؟"

"جی وہ خاوند ہوتا ہے۔" ایک طالب علم نے کھٹ سے جواب دیا۔

☆☆☆☆

ہے مجھے، میرے لیے احکامات صادر فرمایے۔'' میں نے اس عمر رسیدہ شخص کو دیکھا۔ بڑا نرم اور مشفق چہرہ تھا۔ بہر حال یہ یہاں کے معاملات تھے۔ اس میں کوئی مداخلت تو نہیں کرسکتا تھا، میں نے اس سے کہا۔

''بزرگ عالی! ابھی مجھے کچھ درکار نہیں ہے۔ ہاں کوئی ضرورت ہوئی تو میں آپ سے بیان کردوں گا۔ ویسے آپ تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

''ہاں تھوڑا بہت۔۔۔ خصوصاً مجھے آپ کی خدمت پر اس لیے مامور کیا گیا ہے کہ میں انگریزی زبان جانتا ہوں۔''

''ٹھیک۔۔۔ اور اگر اب میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہوں تو۔۔۔؟''

''خادم کا فرض ہے کہ ہر حکم کی تعمیل کرے۔''

''تو بیٹھ جایئے۔'' میں نے کہا اور وہ فرش پر بیٹھنے لگا تو میں جلدی سے بولا۔

''نہیں بزرگ عالی! آپ کی ملازمت اپنی جگہ، لیکن میرے سامنے آپ زمین پر نہیں بیٹھ سکتے۔''

''یہ ہماری تربیت ہے۔ اپنے سے بڑی حیثیت کے انسان کے سامنے ہم کبھی کسی اور جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ کی شرافت اپنی جگہ، لیکن ہمیں اس کے لیے مجبور نہ کریں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی آپ کے سامنے بیٹھ جاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ عالی جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''مالک اگر فرش پر بیٹھے ہوں تو غلام کو کھڑے رہنا ہوتا ہے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں کسی قدر سرد لہجے میں بولا اور وہ مجھے دیکھتا ہوا بے بسی میں بیٹھ گیا۔ لیکن اس کے انداز میں بڑا ادب پایا جاتا تھا۔

''تم اپنے طور پر اپنی ذمہ داریوں کو جس انداز میں پورا کرنا چاہو، پورا کرو۔ لیکن ابھی تم کہہ چکے ہو بابا عالی کہ تم میرے ہر حکم کی تعمیل کرو گے۔''

''خادم یہی کوشش کرے گا۔''

''تو پھر بہتر یہ ہوگا کہ جو کچھ میں کہوں وہی کرتے رہو۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلائی اور مسکرانے لگا، میں نے کہا۔

''میں آقا کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''آقا الشمامہ کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور انہیں ایک عزت کا مقام حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ الشمامہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''اور اشواریہ خاتون۔'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ان کے بھائی کی صاحبزادی ہیں۔ آقا کے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے اور خاتون اشواریہ کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد آقا نے خاتون اشواریہ کی نگہداشت کا کام اپنے سپرد لیا اور تب سے اب تک وہ ان کے ساتھ ہی پرورش پا رہی ہیں۔ ان کے دل میں ایک بزرگی ہے اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ آگے بڑھ کر وہ سوچتی ہیں۔ چنانچہ آپ محسوس کریں گے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ بزرگی سے پیش آتی ہیں۔ بہت ہی اعلاظرف اور اعلا کردار کی مالک ہیں۔''

''آقا صرف گھوڑوں کی تجارت کرتے ہیں؟''

''آقا کے لیے یہ تجارت بے معنی ہے۔ اصل میں آقا کی زندگی میں مہمات کا بڑا دخل رہا ہے اور وہ ایک مہم جو کی حیثیت سے اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں۔ خاتون اشواریہ بھی ان کی ہم مزاج ہیں اور دونوں چچا، بھتیجی لیکن عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے بہت مانوس ہیں۔''

''ہونہہ۔۔۔! ٹھیک ہے بہر حال۔'' پھر اس کے بعد میں نے عالی کو جانے کی اجازت دے دی اور وہ چلا گیا۔ میں ایک بستر پر لیٹ کر وقت گزارنے کے باوجود میں سوچ رہا تھا۔ یہ لمحات میرے لیے بڑے پرسکون تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرے وجود سے ایک بھاری بوجھ کم ہو گیا ہے۔ بہر حال اب

جو بھی صورت حال یہاں پیش آئے۔ بظاہر تو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کے یہ دن خاصے پرسکون گزریں گے اور میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یہاں کے حالات سے واقفیت ہونے لگی۔ عالی ایک بہترین ساتھی تھا۔ میرے رویے کی بنا پر اب اس نے میرے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر لیا تھا اور میں اس سے معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ محل میں یا اس عمارت میں آنے جانے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ہر وقت گاڑیاں آتی رہتی تھیں اور اس میں سے مقامی اور غیر مقامی لوگ برآمد ہوتے تھے۔ غالباً آقا کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اکثر میں نے یہاں غیر ملکی مرد اور عورتیں بھی آتے ہوئے دیکھی تھیں۔ انیکسی کے بائیں سمت کا جو حصہ صدر گیٹ کی جانب کھلتا تھا وہاں سے مجھے باہر کے مناظر نظر آتے تھے۔ صدر گیٹ سے لے کر پورچ تک ایک روش تھی جس کے درمیان پکی سڑک گاڑیاں آنے کے لیے تھی اور اس کے دونوں طرف تقریباً آٹھ آٹھ فٹ چوڑائی میں سرخ بجری بچھی ہوئی تھی۔ دونوں سمت وسیع و عریض لان تھے۔ دائیں سمت بھی خاصی پکی جگہ غالباً پارکنگ کے لیے بنی ہوئی تھی۔ اس کے اختتام پر بھی ایک وسیع و عریض عمارت نظر آتی تھی جو ملازمتوں کو کوارٹروں کے عقبی حصے میں تھی۔ ان دونوں جگہوں کے درمیان خاصی حسین گھاس لگی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس دوران نہ تو خاتون اشواریہ سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی آقا نظر آیا تھا۔ بہر حال اب اتنا زیادہ بھی آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ لوگ خود ہی مجھے مخاطب کریں گے تو ٹھیک ہوگا۔ مجھے اپنے طور پر محتاط رہنا تھا۔ لیکن تیسرے دن آقا کی طرف سے طلبی ہو گئی۔ وہ بہت خوش گوار موڈ میں تھا، مجھ سے کہنے لگا۔

''گھوڑوں سے صرف اتنی دلچسپی ہی تھی کہ ایک سرکش گھوڑے کو قابو میں کر لیا یا اس سے کچھ زیادہ بھی دلچسپی لیتے ہو؟''

''کبھی ایسا موقع نہیں آیا جناب!''

''اوہ معاف کرنا۔ میں بھول ہی گیا کہ ماضی کی باتیں تو تمہیں یاد ہی نہیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے ماضی میں تمہیں گھوڑوں سے خاصی دلچسپی رہی ہوگی۔ ورنہ اتنی عمدہ شہ سواری کا مظاہرہ نہ کرتے۔ آؤ میں تمہیں اپنے گھوڑے دکھاؤں۔'' آقا کے ساتھ چلتا ہوا میں اس عمارت کے عقبی حصے میں پہنچا۔ ابھی تک میں نے پوری عمارت نہیں دیکھی تھی۔ عقبی حصے کی شان ہی الگ تھی۔ ایک عظیم الشان اصطبل نظر آرہا تھا۔ جس میں درجنوں خدام موجود تھے۔ آقا نے مجھے اس اصطبل کی سیر کرائی اور گھوڑوں کی اقسام کے بارے میں بتاتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''غیر ملکی تاجر یہاں آتے ہیں اور میں گھوڑوں کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔ تم اگر گھڑ سواری کا شوق رکھتے ہو تو یہاں سے کچھ فاصلے پر میں نے ایک ٹریک بنایا ہے۔ وہاں تم گھوڑوں کو لے جا سکتے ہو۔ ویسے میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ ہی قیام کرو۔ ہم سرکش گھوڑوں کو رام کرنے کے لیے بڑی محنت کرتے ہیں۔ میرے پاس چھ ایسے افراد ہیں جن کے سپرد جنگلی گھوڑے کیے جاتے ہیں اور وہ انہیں مختلف طریقوں سے درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ماہر ترین لوگ ہیں اور تم سے ملاقات کرنے کے خواہش مند کیونکہ انہیں تمہارے بارے میں بتایا گیا ہے۔'' میں نے گردن ہلا دی اور اس کے بعد میری ملاقات ان افراد سے کرائی گئی۔ براؤن رنگ کا وہ گھوڑا جسے میں نے قبضے میں کیا تھا۔ یہیں موجود تھا، آقا نے کہا۔

''یہ ہے وہ شخص۔۔۔ جس نے اس گھوڑے کو اپنے قبضے میں کیا تھا اور شاید تمہیں حیرانی ہو فرزان کہ ابھی تک اس گھوڑے نے اپنی پشت پر کسی اور کو سوار نہیں ہونے دیا۔ کیا تم اب بھی اس گھوڑے پر اپنی مہارت کا نمونہ پیش کرسکتے ہو؟''

''اگر آپ کا حکم ہوگا آقا! تو میں کوشش کروں گا۔''

''ہاں میں ان لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دیکھو اس شخص نے وہ کام کر دکھایا ہے جو دوسرے نہیں کر پائے۔'' میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے اس وسیع و عریض میدان میں اس گھوڑے پر کیسے قابو پالیا تھا۔ ایک شخص گھوڑے کو کھولنے کے لیے اندر پہنچا تو اس نے پھر وہی اچھل کود شروع کر دی۔ بمشکل تمام اس نے اپنے آپ کو بچا کر گھوڑے کا رسا کھولا۔ گھوڑے نے ایک لمبی زقند لگائی اور سامنے کی سمت بھاگا۔ آقا اچھل کر ایک طرف ہو گیا تھا ورنہ وہ گھوڑے کی لپیٹ میں آجاتا۔ گھوڑے کی رسی اب بھی زمین پر لٹک رہی تھی۔ میں نے پھر برق رفتاری کا مظاہرہ کیا اور وہ رسی پکڑ لی۔ اس کے بعد میں نے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ لوگوں میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ گھوڑا شدید اچھل کود مچا رہا تھا۔ لیکن اس جانور کے بارے میں کوئی خاص تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے کم از کم اتنا اندازہ ضرور لگایا کہ اس کے اندر ایک خاص حس پائی جاتی ہے۔ ایک بار میں نے اس کی اس پشت پر سواری کی تھی۔ جب اس نے دوبارہ مجھے اپنے قریب پایا تو پہچان لیا اور اس کے انداز میں خاصی نرمی نظر آنے لگی۔ میں نے آہستہ آہستہ رسی تنگ کرنا شروع کر دی اور اس کے بعد میں ایک بار پھر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ آقا خوشی سے چیخا۔

''دیکھا تم نے، میں نے جو کہا تھا وہ سچ ہی ہے نا۔''

دوسرے لوگ بھی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ گھوڑے کو خاصی دور تک دوڑانے کے بعد میں واپس لے آیا اور اسے اس کی جگہ باندھ دیا۔

''یہ شخص ہمارے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے دوستو! اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسے اپنے ساتھ رکھنا از حد ضروری ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔

''فرزان! تم یہ سمجھ لو کہ تمہیں یہاں آقا کی اس رہائش گاہ میں ایک اعلا مقام حاصل ہے اور اب جب تک تم یہاں سے خود ہی نہ جانا چاہو ہم تم سے کبھی جانے کے لیے نہ کہیں گے۔ ویسے تمہاری اپنی رائے اس سلسلے میں کیا ہے۔ کیا تم کہیں جانا چاہتے ہو؟''

''نہیں آقا!''

''بس میں تمہاری زبان سے یہی الفاظ سننا چاہتا تھا۔ جس شے کی بھی حاجت ہو بے تکلفی سے بیان کر دینا۔'' بہرحال میرا یہاں ایک مقام بنتا جا رہا تھا۔ لیکن بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ میری زندگی پر کبھی جمود تو طاری ہی نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ نت نئی کہانیاں میری زندگی سے وابستہ ہو جاتی تھیں اور اسی طرح ایک اور نئی کہانی کا آغاز بھی ایک شام اس وقت ہوا جب آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور شام وقت سے پہلے جھکتی چلی آرہی تھی۔ چونکہ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اور یہاں اپنا مقام بھی پہچان لیا تھا۔ آقا نے مجھے صرف اس لیے یہ عزت بخشی تھی کہ وہ گھوڑوں کا تاجر تھا اور میں نے ایک سرکش گھوڑے کو قابو میں کر لیا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ میں اس کے لیے نہایت کارآمد شخص ثابت ہو سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے بھی اب جب اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا تو یہی فیصلہ کیا تھا کہ خاموشی سے آقا کی خواہش پوری کرتا رہوں اور اپنا وہ کام سرانجام دوں جس کے لیے مجھے یہاں جگہ دی گئی ہے۔ زیادہ بڑا بننے کی کوشش بالکل بے مقصد ثابت ہوتی، اگر میں اپنے طور پر یہاں دوستیاں بڑھانے کی کوشش کرتا تو وہ میرے حق میں بہتر نہ ثابت ہوتے۔ حالانکہ خاتون اشواریہ کا کردار میرے لیے ایک معمہ تھا اور دل میں یہ خواہش تھی کہ اس جوان بوڑھی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کروں جو اس قدر کم عمر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس گھر کا ایک بزرگ سمجھتی ہے اور ہر ایک کے ساتھ بزرگانہ انداز میں پیش آتی ہے۔ لیکن یہ ساری خواہشیں میں نے اپنے دل میں دبالی تھیں۔ آقا نے تو صرف مجھ سے اتنا ہی کہا تا کہ میں یہاں قیام کروں، لیکن میں نے گھوڑوں کے اصطبل سے دلچسپی لینا شروع کر دی

تھی اور یہ ایک بہترین مشغلہ بھی تھا۔ کچھ جانور ہی اتنے وفادار ہوتے ہیں کہ ان کی محبت کے جواب میں انہیں محبت دینا پڑتی ہے۔ ان میں گھوڑے بھی سرفہرست آتے ہیں۔ میں نے تمام گھوڑوں سے مانوسیت کر لی اور ان کی مکمل دیکھ بھال کرنے لگا۔ حالانکہ یہاں بہت سے سائینس تھے جو گھوڑوں کی نگہداشت کرتے تھے۔ چونکہ آقا نے میرے بارے میں انہیں بھی بتا دیتا تھا۔ اس لیے وہ بھی اب میرے احکامات کی تکمیل کرتے تھے اور یہ مشغلہ واقعی خاص دلچسپ ثابت ہوا۔ میرے سامنے گھوڑوں کی خرید و فروخت ہوتی رہتی تھی۔ خریدار آتے تھے۔ لیکن یہ عام گھوڑے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ زیادہ تر گھوڑے ریس وغیرہ کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ لیکن خریدار انہیں خریدنے کے بعد خود ان کی تربیت وغیرہ کیا کرتے تھے۔ بلکہ ایک بار تو ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہی گھوڑا جس کی وجہ سے یہاں میری قدر و قیمت ہوئی تھی۔ ایک مقامی خریدار کو پسند آ گیا اور اس نے اسے دیکھ کر اس کی قیمت معلوم کی۔ آقا سے اس کی سودے بازی ہوئی تھی اور اس کے بعد گھوڑا اس کی تحویل میں دے دیا گیا، لیکن گھوڑے کو لے جانا ایک مسئلہ تھا۔ مقامی شخص نے اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کر لی لیکن وہ گھوڑا کسی طور اس کے قبضے میں نہ آیا تو آقا نے مسکراتے ہوئے مجھے اشارہ کیا اور میں نے باآسانی گھوڑے کی پشت پر سواری کر کے دکھا دی۔ گھوڑوں کا خریدار حیرانی سے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''یہ کون ہے آقا؟''

''ان گھوڑوں کا سرپرست۔'' آقا نے مجھے اپنا ملازم نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ شخص جو بہت دولت مند تھا، کہنے لگا۔

''آقا گھوڑے کی قیمت طے ہو ہی گئی ہے۔ اس سرپرست کی قیمت بھی طے کر لو، یہ تو بہت ہی ماہر آدمی معلوم ہوتا ہے اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ تم سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' آقا مسکرایا، پھر بولا۔

''کیا قیمت دے سکتے ہو اس کی تم؟''

''جو تم مانگو۔''

''تو پھر تمہارے پاس جتنا جو کچھ بھی ہے، وہ سب میرے حوالے کر دو اور اس کے بعد اس کے بارے میں بات کرو۔''

وہ شخص کسی قدر ناراض ہو گیا، پھر بولا۔

''کیا تم میرا مذاق اڑانا چاہتے ہو آقا!''

''نہیں۔۔۔ چونکہ تم نے بات ہی ایسی کی ہے اس کا جواب دے رہا ہوں میں گھوڑوں کا سوداگر ہوں، انسانوں کا نہیں اور کسی انسان کا بیچنے کا حق مجھے حاصل نہیں ہے۔''

''لیکن یہ گھوڑا اسی قیمت پر خریدا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ تربیت کار بھی میرے سپرد کر دیا جائے۔''

''جا سکتے ہو۔'' آقا نے سرد لہجے میں کہا اور یہ سودا ملتوی ہو گیا، تو بات اس شام کی ہو رہی تھی، جس میں مجھے ایک نئی کیفیت سے روشناس ہونا پڑا۔ عظیم الشان اصطبل میں گھوڑوں کے چارے کے لیے گودام بنا ہوا تھا اور چونکہ اب میں یہاں کی نگرانی کرنے لگا تھا۔ اس لیے ہر چیز پر میری نگاہ تھی۔ گودام میں چاروں طرف گھوڑوں کی خوراک بند تھی اور یہ خوراک اس قدر قیمتی تھی کہ بعض انسان بھی اسے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ عظیم الشان گودام کے اندر میں خوراک کے حساب کتاب میں مصروف تھا۔ ایک دو افراد اور بھی میرے ساتھ میرے کام میں معاونت کر رہے تھے کہ اچانک اصطبل کی چھت پر مجھے عجیب طرح کی بھاگ دوڑ سنائی دی اور میں چونک کر اوپر دیکھنے لگا۔ میرے تینوں ساتھی بھی حیران تھے۔ اصطبل کی اونچی دیوار میں ایک بڑا سا روشن دان تھا۔ جو کھلا ہوا تھا اور اس سے باہر کی کجلائی ہوئی شام نظر آرہی تھی۔ لیکن اچانک ہی روشن دان پر ایک سایہ نظر آیا اور پھر کوئی اس روشن دان سے گزر کر دھم سے اصطبل میں آ کودا۔ اصطبل کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کودنے والا جو خاصی بلندی سے اندر کودا تھا، ایک

لمحے کے لیے اپنی جگہ رکا اور پھر اس نے دروازے کی جانب ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ اصطبل کے اس حصے میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ اس روشنی میں، میں نے ایک لڑکی کو دیکھا، جس کے بدن کا لباس نہایت بوسیدہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نوجوان کے بدن کے نقوش صاف نظر آ رہے تھے۔ ننگے پاؤں تھی اور جس طرح اوپر سے کودی تھی، وہ معمولی بات نہیں تھی۔ بلندی اتنی تھی کہ اس کی ٹانگیں ٹوٹ جانی چاہیے تھیں۔ لیکن میں نے دیکھا تھا کہ وہ بلی کی طرح پنجوں کے بل نیچے کودی ہے اور اس کے بعد اس نے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی ہے۔ لیکن چونکہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچی، لیکن دروازہ کھولنے میں کامیاب نہیں ہوسکی اور میرے ساتھی حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہی دروازے پر دھڑ دھڑاہٹ ہوئی، کسی نے چیخ کر کہا۔

"دروازہ کھولو، وہ اندر آئی ہے۔" لڑکی دروازے کے پاس سے چھلانگ لگا کر ایک بار پھر پلٹی اور ان بوریوں پر چڑھ گئی جو ایک طرف چنی ہوئی تھیں۔ وہ ان بوریوں میں چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی، لیکن جگہ نہیں تھی۔ تاہم وہ خاصی بلندی تک پہنچ گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر روشن دان قریب ہوتا تو وہ واپس اسی روشن دان سے اوپر جانے کی کوشش کرتی۔ لیکن اب وہ کسی قدر بے بس نظر آ رہی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہونے والا ایک مکروہ سی شکل کا آدمی تھا۔ چوڑے چکلے بدن کا مالک، آنکھوں میں وحشت، داڑھی بڑھی ہوئی اور بال الجھے ہوئے، اس کے پیچھے تین اور افراد موجود تھے۔ آگے والے آدمی کے ہاتھ میں ہنٹر تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اندر گھس کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

"ہوشیار رہو، وہ یہیں موجود ہے۔" پھر اس نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

"کہاں گئی ہے وہ؟"

"وہ اوپر بوریوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ لیکن کون ہے وہ اور کیا چاہتے ہو تم۔" جواب میں اس شخص نے مجھے گھورا، لیکن کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

"دیکھو دیکھو۔۔۔ وہ ہے اسے اتارو۔" اور وہ لوگ لڑکی کو اتارنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے بوریوں کو دھکیلنا شروع کر دیا، تاکہ وہ نیچے گر پڑے۔ لیکن لڑکی غضب کی پھرتی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے ایک ایسا عمل کیا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ آنے والے کے ساتھیوں نے ایک بوری گھسیٹی تو وہ اس کے ساتھ ہی نیچے لڑھک آئی۔ لیکن جیسے ہی بوری زمین سے ٹکی، لڑکی نے اس پر پاؤں رکھ کر ایک الٹی چھلانگ لگائی اور دوبارہ بوریوں پر چڑھ گئی۔ یہ جسمانی پھرتی کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ وہ انہیں ڈاج دے رہی تھی۔ اس دلچسپ کھیل میں ایک لمحے کے لیے میں کھو سا گیا۔ لیکن اچانک ہی میرے ذہن کو ناگواری کا احساس ہوا۔ یہ آدمی اپنے بارے میں بتائے بغیر میری اس مملکت میں ہنگامہ خیزی کر رہا ہے اور بوریاں گرا رہا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔

"اسے مارو اور مار کر نیچے اتارو، جس طرح سے بھی بن پڑے اسے مارو۔" تو میں نے عقب سے اسے کہا۔

"تم اندھے ہو، دیکھ نہیں رہے کہ تمام چنا ہوا سامان تتر بتر ہو رہا ہے۔" اس نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"وہ آخری سرا نظر آ رہا ہے تمہیں، وہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

اچانک ہی لڑکی پھسل کر نیچے آئی اور اسی وقت خوں خوار شکل کے آدمی نے اس پر اچانک حملہ کیا۔ شائیں کی آواز ابھری، لیکن لڑکی نے لوٹ لگا کر اپنے آپ کو اس چابک کی زد سے بچا لیا تھا۔ پھر وہ شخص پے در پے چابک برسانے لگا۔ مگر کیا مجال کہ لڑکی

کے بدن کو چھو بھی سکا ہو۔ انتہائی ناقابل یقین منظر تھا یہ، لیکن اب میرا دماغ گرم ہونے لگا تھا۔ کچھ بھی تھا بہرحال وہ ایک لڑکی تھی۔ چنانچہ اس شخص نے پھر چابک اٹھایا تو میں نے اس کا چابک اپنی مٹھی میں پکڑ لیا اور اسے ایک زوردار جھٹکا لگا کیونکہ میرا پکڑنا غیر متوقع تھا۔ اس لیے اسے اپنا توازن سنبھالنا پڑا۔ لڑکی بھی بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ اچھل کر بوریوں پر چڑھ گئی تو وہ شخص میری جانب مڑا اور بولا۔

"تم پاگل کے بچے معلوم ہوتے ہو، جانتے ہو میں کون ہوں اور تم نے کسے پکڑا ہے؟"

"چلو پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب۔" اس نے کہا اور میں نے اسے سمجھا دیا۔ اس کے چابک کا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک دفعہ پھر میں نے اس کو جھٹکا دیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا میری جانب چلا آیا۔ لیکن جیسے ہی میرے قریب پہنچا، میں نے داہنے ہاتھ کا گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کیا اور اس کی گردن ٹیڑھی ہو گئی، لیکن اب اس نے خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اب اتنا کچا بھی نہیں تھا میں کہ اپنے حملہ آور سے مار کھا جاتا، میں نے اپنے آپ کو اس کی زد سے بچایا اور پھر زمین پر لیٹ کر دونوں پیروں پر اسے روکا اور پوری قوت سے اچھال دیا۔ اس نے کئی قلابازیاں کھائی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے اور اب ضروری تھا کہ میں بھی بھرپور جنگ کروں۔ چنانچہ میں نے انہیں گھونسوں پر رکھ لیا۔ ایسی مرمت کی میں نے ان لوگوں کی ان کی شکلیں بگڑ گئیں۔ وہ خونخوار شخص بھی میرے ہاتھوں بری طرح مار کھا رہا تھا حالانکہ وہ انتہائی طاقت ور تھا۔ لیکن اس طرح کی جنگ کا ماہر نہیں تھا۔ کوڑے وغیرہ برسا لینا ایک الگ بات ہے یا کسی پر جسمانی تسلط قائم کر لینا ایک الگ چیز ہے۔ یہاں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ ایک الگ بات تھی۔ میرے ساتھی جو تھوڑی دیر پہلے میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑے ہوئے میری کارکردگی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان سب کے چہرے خون میں ڈبو دیے اور وہ لڑکھڑانے لگے۔ زبردست پنچ مارے تھے میں نے ان کے جبڑوں پر۔ ان کی آنکھیں، ناک اور منہ سوج گئے تھے۔ پھر اچانک ہی کچھ اور لوگ بھی اندر گھس آئے۔ یہ میرے شناسا افراد تھے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک نے دروازہ کھولا تھا۔ اندر آنے والے اس عمارت کے منتظم تھے۔

"کیا ہو رہا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے یہاں، کہاں گئی وہ۔" جواب میں خونخوار شخص نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ کون ہے۔ میں اس کا خون پینا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات کر رہے ہو خانان۔۔۔! جانتے ہو یہ اصطبل کا نگران ہے۔ آقا کا منظور نظر۔"

"میرا حلیہ دیکھ رہے ہو، میرا یہ حلیہ اس نے بنایا ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ، آقا کی نوکری چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کی گردن میں اس کے شانوں سے ضرور اتار دوں گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے خانان! آخر بات کیا ہے؟"

"ادھر دیکھو بات کیا ہے۔" اس خونخوار شخص نے، جس کا نام اب مجھے خانان معلوم ہوا تھا۔ بوریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ لڑکی کسی بلی کی طرح اپنی جگہ بیٹھی ہوئی آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ عمارت کے کیئر ٹیکر نے کہا۔

"پکڑو اسے، تم اسے پکڑ کیوں نہیں رہے، یہ بھاگ نہ جائے۔"

"اسے پکڑنے کے لیے ہی میں اندر داخل ہوا تھا اور اصطبل کے نگران نے میرا یہ حال کیا۔ میرے ساتھیوں کو بھی اس نے مارا ہے۔" منتظم کئی بار مجھ پر آقا کی مہربانیاں دیکھ چکا تھا۔" صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"نہیں خانان! تم بھی اپنے آپ کو اعتدال

میں لاؤ اور تم دوست، تمہارا نام ہمیں فرزان بتایا گیا ہے۔ یہ آقا کی قیدی لڑکی ہے۔ قید خانے سے نکل بھاگی ہے۔ اس کو پکڑنا ضروری ہے، تم ہماری مدد کرو۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آقا کے نام پر مجھے خاموش ہونا پڑا تھا۔ البتہ میں نے اتنا ضرور کہا۔

''ٹھیک ہے، پکڑلو اسے۔'' میرے لہجے میں طنز تھا۔ لیکن اب میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس معاملے میں بولوں گا نہیں۔ خانان کے ساتھی میرے ہاتھوں کافی نقصان اٹھا چکے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ لڑکی چھلاوا تھی۔ وہ اسے پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کررہے تھے۔ لیکن وہ ان کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ یہ میرے لیے انتہائی حیران کن بات تھی۔ پھر مزید کاوشیں ہونے لگیں۔ ایک مضبوط جال لایا گیا۔ کچھ اور آدمی بھی آگئے اور سارے کے سارے اسے پکڑنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ وہ پورے ہال میں انہیں نچاتی پھر رہی تھی۔ میں اور میرے ساتھی ایک دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ پھر وہ لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگئے۔ بڑی محنت سے انہوں نے جال تان لیا تھا اور اس بار جب لڑکی نے چھلانگ لگائی تو اس سے اندازے کی غلطی ہوگئی اور بوریوں کی دیوار سے نیچے آرہی اور سیدھی جال پر گری۔ وہ سارے کے سارے اس سے لپٹ گئے تھے اور آخرکار اسے قابو کرلیا گیا تھا۔ نجانے کیوں میرے دل کو ایک افسوس ہورہا تھا۔ پھر وہ اسے بڑی بے دردی کے ساتھ پکڑتے ہوئے باہر لے گئے۔ میں خاموش کھڑا رہا تھا۔ جب وہ باہر نکل گئے تو میں نے بھاری لہجے میں اپنے آدمیوں سے کہا۔

''جو سامان وہ تتر بتر کرگئے ہیں اسے واپس اس کی جگہ لگادو۔'' میں نے ان لوگوں سے لڑکی کے بارے میں نہیں پوچھا، لیکن میرے ذہن میں ایک خلش سی بے دار ہوگئی تھی۔ لڑکی کا چہرہ میں نے غور سے دیکھا تھا۔ سانولی رنگت تھی۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، سر کے بال بے انتہا خوب صورت اور بدن انتہائی سڈول نجانے آقا کا عتاب اس پر کیوں نازل تھا۔ وہ کون تھی؟ بے شمار سوالات میرے ذہن میں آرہے تھے اور میں مضمحل سا ہوگیا۔ رات ہوگئی، میں اصطبل سے نکل کر انیکسی کی جانب چل پڑا اور پھر معمول کے مطابق غسل وغیرہ کیا، رات کا کھانا عالی لے کر آگیا تھا۔ میرے ذہن میں مسلسل لڑکی گردش کررہی تھی۔ عالی بہت اچھا انسان تھا اور مجھ سے بڑی انسیت رکھتا تھا۔ اچانک ہی میں نے اس سے کہا۔

''عالی بیٹھ جاؤ۔''

''جی عالی طرب حکم۔'' اس نے کہا۔

''عالی تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''خادم حاضر ہے۔''

''آج اصطبل میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔''

''کیا۔۔۔''

''اصطبل کے روشن دان سے ایک لڑکی اندر گھس آئی، عجیب سی لڑکی تھی، پھٹے ہوئے لباس میں ملبوس، پھر خانان نامی ایک شخص اپنے ساتھیوں کے ہمراہ داخل ہوا تھا اور لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بے حد پھرتیلی تھی اور وہ لوگ اس کے ساتھ بڑی بے دردی سے پیش آرہے تھے۔ کیا تم اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

عالی کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی، پھر اس نے کہا۔

''آقا بہت اعلاظرف انسان ہے۔ ہم تو اس طرح سے اندازہ لگاسکتے ہیں کہ یہاں اس کی حویلی میں جتنے افراد موجود ہیں ان میں سے آپ کو ایک بھی ایسا نہیں ملے گا عالی طرب جو اپنے مالک سے کوئی شکایت رکھتا ہو۔ خاتون اشواریہ اور آقا اپنے ہر ملازم اور ہر دوست کا بہترین خیال رکھتے ہیں۔ ایک بار آقا کسی مہم جوئی سے لوٹے تھے اور اپنے ساتھ ایک کٹہرا لائے تھے۔ لوہے کے بنے ہوئے کٹہرے میں وہ لڑکی جس کا آپ تذکرہ کررہے ہیں بند تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی شیرنی ہوتی ہے۔ پتا نہیں وہ اسے کہاں

سے لائے تھے۔ پھر بعد میں عقوبت گاہ میں اسے بند کردیا اور اس وقت سے وہ وہیں ہے۔ وہ لڑکی کون ہے، اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، لیکن اس کا محافظ خانان ہے۔ ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ جس کے ساتھ آٹھ افراد کام کرتے ہیں۔ وہ بھی آقا کا ملازم ہے۔ خانان اس کی نگرانی کرتا ہے۔ لڑکی نے تین بار فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ ایک بار اس نے اپنے ناخنوں سے خانان کے ایک ساتھی کا چہرہ لہولہان کردیا تھا اور اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ بہت خونخوار تھی، لیکن اس شخص کے علاوہ اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ صرف یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتی ہے۔ بس اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم، ممکن ہے وہ عقوبت خانے سے نکل بھاگی ہو اور گودام کی چھت پر آگئی ہو۔

''اس سے زیادہ تم کچھ نہیں جانتے؟''

''نہیں عالی طرب! جانتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔'' میں خاموش ہوگیا، لیکن میرے ذہن میں ایک شدید خلش بے دار ہوگئی۔ اس رات میں بہت دیر تک سوچتا رہا تھا کہ لڑکی کون ہوسکتی ہے۔ چہرے سے جس قدر معصوم نظر آتی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی بری لڑکی نہیں ہے۔ یہ کیا راز ہے جسے آقا جیسے اچھے انسان نے اپنے سینے میں پوشیدہ کررکھا ہے۔ میں نے سوچا اگر ممکن ہوسکا تو کسی طریقے سے اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال یہ ایک پُراسرار اور دلچسپ کھیل تھا۔ خانان کی پٹائی ہوگئی تھی میرے ہاتھوں سے اور وہ مجھ سے نالاں تھا۔ دوسرے دن بھی وہ مجھے نظر آیا۔ اس کے چہرے پر کئی جگہ ٹیپ چپکے ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ مجھے کافی فاصلے پر نظر آیا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نفرت کے آثار تھے۔ جیسے ہی مجھ سے نگاہ ملی، وہ ایک جھٹکے کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ میرے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ملی۔ لیکن بہرحال مجھے کسی سے خوف نہیں تھا۔ پھر دو، تین دن گزر گئے، وہ لڑکی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اس عظیم الشان حویلی کے بہت سے حصے ایسے تھے جنہیں میں نے ابھی تک دیکھا نہیں تھا اور عقوبت خانے کے بارے میں بھی مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف ہے۔ لیکن بہرحال میں اس لڑکی کو نہیں بھول سکا۔ میرے معمولات بدستور جاری تھے۔ آقا نے مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں یہ بات اس تک پہنچی بھی یا نہیں، لیکن اس دن بائیں باغ میں جب میں ایک گھوڑے کی تربیت کررہا تھا اچانک ہی مجھے خاتون اشواریہ نظر آگئیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اس نے مجھے آواز دی، تو میں آہستہ سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے تعظیم دی تو وہ بولی۔

''کیسے حال ہیں میرے بچے! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری طرف سے میں نے آنکھیں بند کررکھی ہیں تو یہ غلط ہے۔ میرے پاس اپنے ذرائع ہیں، جن سے میں تمہارے بارے میں پوچھتی رہتی ہوں اور مجھے علم ہوا ہے کہ تم خوش ہو۔'' دل میں مجھے ہنسی آگئی تھی۔ یہ مجھ سے خاصی چھوٹی عمر کی لڑکی مجھے بچہ کہہ کر مخاطب کررہی تھی۔ لیکن خاتون اشواریہ کے بارے میں خاصی باتیں میرے علم میں آچکی تھیں۔ وہ بہت ہی پاکیزہ فطرت کی مالک تھی۔ ویسے تو یہ حقیقت ہے کہ اس پوری حویلی میں مجھے انتہائی پُراسرار واقعات کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔ یہ سب کے سب اچھے لوگ تھے۔ لیکن ان کے اندر کوئی ایسی بات پوشیدہ تھی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی یا پھر ہوسکتا ہے یہ ماحول میرے لیے اجنبی ہو۔ چونکہ یہاں کسی دوسرے آدمی نے مجھ سے اس کی پُراسراریت کے بارے میں ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے خاتون اشواریہ سے کہا۔

''ہاں۔۔۔ میں خوش ہوں، سوائے ایک تکلیف کے۔''

''آؤ۔۔۔'' اس نے گھاس کے ایک قطع کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اور میں اس کے حکم کی تعمیل میں آگے بڑھ گیا۔ وہ سنگ مرمر کی ایک بینچ پر بیٹھ گئی تو میں نے اس کے پاس ہی گھاس کے قطعے پر بیٹھ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کہنے لگی۔
"ہاں بتاؤ۔۔۔کیا تکلیف ہے تمہیں؟"
"خاتون اشواریہ! آپ کو علم ہے کہ آپ ہی نے مجھے اپنے قریب آنے کی دعوت دی ہے۔ میں کسی جانے بوجھے منصوبے کے تحت یہاں نہیں آیا ہوں۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہم تمہیں ایک باعزت مقام دیتے ہیں اور کسی کو بھی کوئی مقام دیا جائے تو وہ احسان نہیں ہوا بلکہ کوئی خود کو اس مقام کا اہل ثابت کرتا ہے تو اسے یہ مقام دیا جاتا ہے۔ تم ایک پُراسرار نوجوان ہو۔ ہم تو اس بات پر حیران ہیں کہ تم اپنا ماضی بھول گئے ہو۔ بہرحال ہر انوکھی شخصیت میں ایک دلکشی ہوتی ہے اور تمہاری دلکشی کو سب ہی محسوس کرتے ہیں۔ مگر کہنا کیا چاہتے ہو؟"
"پہلی بات تو یہ کہنا چاہتا ہوں خاتون اشواریہ! کہ بے ایمان آدمی نہیں ہوں۔ آپ لوگوں نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اس کی قدر میرے دل میں ہے اور میری ذات سے آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن انسان جس جگہ ہوتا ہے وہاں کے بارے میں بہت کچھ جان لینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔"
"ہاں کیوں نہیں۔"
"بہت سے سوالات ایسے ہیں میرے دل میں جنہیں جاننے کی خواہش کبھی کبھی شدت اختیار کر لیتی ہے۔"
"کیا ہمارے بارے میں؟"
"ہاں"
"کسی سے معلوم کیا؟"
"نہیں۔"
"تو مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔" جواب میں، میں نے اس لڑکی کی کہانی خاتون اشواریہ کو سنائی۔ خاتون اشواریہ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ حیرت سے بولی۔
"ارے مجھے تو معلوم ہی نہ ہوا۔ کیا تم نے خانان کو مارا، خانان تو بہت خونخوار شخصیت کا مالک ہے۔ کیا واقعی۔۔۔ مگر مجھے یقین ہے، تم نے ایسا کیا ہوگا۔ جو شخص ایک جنگلی گھوڑے کو قابو میں کر سکتا ہے اس کے لیے انسان مشکل نہیں ہوتے۔ دلچسپ، بے حد دلچسپ اور عجیب۔"
"مگر میں اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"
"وعدہ کرو کسی سے تذکرہ نہیں کرو گے۔ تمہارے دل میں ایک خلش ہے کہ ہم تمہیں اپنے آپ سے دور رکھتے ہیں۔ میں تمہارے دل کی اس خلش کو مٹانے کے لیے یہ باتیں کر رہی ہوں جو مجھے نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ پتا نہیں آقا اسے پسند کریں یا نہ کریں، لیکن پھر بھی۔۔۔"
"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا اہم راز ہوا تو میں اسے اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گا۔"
"وہ اہم راز نہیں ہے۔ آقا اصل میں ایک عظیم مہم جو ہیں اور تم یقین کر لو گھوڑوں کی تجارت کا انہیں صرف شوق ہے ہماری ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت سے ایسے وسائل اور ذرائع ہیں جن سے ہماری بہترین آمدنی ہوتی ہے۔ ہمیں گھوڑوں کی تجارت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں ایڈونچرز کا شوق ہے چنانچہ آقا اس طرح سے جنگل کے گھوڑے پکڑتے ہیں۔ شہری گھوڑوں کی وہ کبھی تجارت نہیں کرتے۔ بس انہیں علم ہے اور اس علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ وہ ایک مہم جو ہیں۔ میں ان کی ہر مہم میں ان کے ساتھ نہیں ہوتی۔ یہ بس میری خواہش پر مبنی ہے کہ میں جب چاہوں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہی، تو ایک بار ایک مہم سے لوٹے کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ تھے اور یہ لڑکی کہیں سے پکڑ کر لائی گئی تھی۔ آقا مجھ سے کچھ نہیں

بتاتے۔ میں نے جب اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک سربستہ راز ہے اور جب یہ راز کھلے گا تو وہ خود ہی اس کے بارے میں بتا دیں گے۔ اصل میں اس کا تعلق کچھ اور لوگوں سے ہے اور وہ ہی اس کے بارے میں جانتے ہیں۔" میں نے آقا سے اصرار کیا تو وہ بولے۔
"یقین کرو عزیز۔۔۔! مجھے چونکہ خود بھی ابھی اس کے بارے میں تفصیل سے نہیں معلوم۔ سمجھ لو یہ لڑکی کسی کی امانت ہے میرے پاس اور مجھے اس کی نگرانی کرنی ہے۔ تو تم سمجھ گئے ہو فرزان کہ مجھے اس بارے میں کوئی صحیح تفصیل نہیں معلوم۔ بس خانان اس کا نگراں ہے۔ ہم اسے قید میں رکھے ہوئے ہیں اور آقا اس کے سلسلے میں شاید کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔" میں خاموشی سے خاتون اشواریہ کی صورت دیکھتا رہا۔ بات الجھی کی الجھی رہ گئی۔ خاتون اشواریہ نے کہا۔
"اور میرا خیال ہے یہ اس قدر اہم بات نہیں ہے۔ ویسے میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ آئندہ اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑانا۔ خانان کو کچھ ذمہ داریاں آقا نے سونپی ہیں۔ میرا خیال ہے کسی بہتر شخص نے خانان کو آقا سے تمہاری شکایت کرنے سے روکا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ آقا کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا۔ لیکن میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گی اور وہ یہ کہ اس مسئلے میں خود کو معتدل رکھو۔ آقا کے کچھ ایسے معاملات ہیں جن کا مجھے بھی علم نہیں ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔"
"ہاں۔"
"خوب صورت زندگی کو مشکلات میں ڈال کر اپنے آپ کو الجھا دینا عقل مندی نہیں ہے۔ بہتر ہے زندگی کو ہلکی پھلکی نگاہ سے دیکھو۔ آقا تو تمہارے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں۔"
"میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں آقا۔" میں نے سوال کیا۔
"ڈاکٹر کا تعلق امریکا سے ہے۔ بہت بڑے نفسیات دان بھی ہیں اور نفسیاتی معالج بھی۔ ڈاکٹر سے آقا نے تمہارے بارے میں ٹیلی فون پر گفتگو کی ہے۔ اصل میں آقا کی خواہش ہے کہ تم اپنی یادداشت حاصل کر لو۔ وہ تمہیں بے حد پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر وسکارٹ کو دعوت دی ہے کہ وہ یہاں آئے اور تمہارا تجزیہ کریں۔ ڈاکٹر وسکارٹ شاید تھوڑے ہی عرصے میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گردن ہلائی اور بولا۔
"زمانے کی بے اعتنائی سمجھ لیں خاتون!"
"کیا مطلب۔"
"مطلب یہ کہ ہر شخص اپنے بارے میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہے جتنا وہ مناسب سمجھتا ہے جیسے آپ۔" میں نے جرات کر کے کہا۔ خاتون اشواریہ بجائے اس بات کے کہ میری اس بات پر ناراض ہو جاتی حیرت سے مجھے دیکھنے لگی، پھر بولی۔
"کیا میری ذات سے بھی تمہیں کوئی شکایت ہے؟"
"شکایت نہیں، تجسس۔"
"کس سلسلے میں؟"
"خاتون اشواریہ! میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا ہوں۔"
"کیا؟" وہ اچانک سنجیدہ ہو گئیں۔
"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میرے ذہن میں آپ کے لیے کوئی ایسا ویسا تصور ابھرتا ہے۔ صاف گوئی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں خاتون اشواریہ! کہ آپ کی عمر اور آپ کے حسن کو دیکھ کر میرے دل میں ایک مرد جاگا ہے تو سب سے پہلے میں معذرت کے ساتھ آپ سے یہ عرض کر دوں کہ ایسی بات نہیں ہے، میں آپ کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ لیکن آپ کی شخصیت بھی میرے لیے ایک پراسرار معمے کی مانند ہے۔"
"ارے نہیں، میں تو ایک سادہ سی کتاب ہوں۔"

"کتاب اگر اوپر سے سادہ ہو تو اس کی سادگی کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کہ اس کے اندر کے اوراق نہ پڑھے جائیں۔"

"کیا جاننا چاہتے ہو میرے بارے میں؟"

"آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" وہ پُر مزاح انداز میں بولی۔

"لیکن آپ نے اپنے اوپر بزرگی طاری کر لی۔"

"کچھ چیزیں خود بخود اپنے اوپر طاری نہیں کی جاتیں۔"

"تو پھر۔" میں نے سوال کیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ لمحے گردن جھکائے بیٹھی رہی، پھر اس نے کہا۔

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا وقت سے پہلے سامنے آنا مناسب نہیں ہوتا۔"

"میں اپنی اوقات پہچانتا ہوں۔ آپ اس قدر محبت سے پیش آئیں دل میں ایک سوال ابھرا تو میں نے آپ سے اس کے لیے اظہار کر دیا۔ ضد نہیں کروں گا۔"

"ہاں ضد نہ کرو۔" وہ اداس لہجے میں بولی۔

"آپ کے اندر بزرگی کا ایک ایسا جذبہ؟"

"اس کی کچھ وجوہات ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں بتائی جا سکتیں۔"

"پھر کب۔۔۔؟"

"شاید کبھی نہیں۔" اس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"آپ ناراض ہو گئیں۔" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔" اس نے کہا پھر بولی۔

"مجھے اجازت۔" اور اس کے بعد وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی گئی اور میں اپنی جگہ سر کھجاتا رہا۔ کیا کمال کا ماحول ہے۔ بہرحال اس کے بعد کئی دن خاموشی سے گزر گئے۔ کوئی ایسی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔ میں بھی اب خاصی حد تک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ذمہ داریاں سنبھالنے والے بے شمار افراد تھے۔ میری ذمہ داری صرف اتنی سی تھی کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ حالانکہ یہ بھی ایسے ہی ایک کام اپنے سر لے لیا تھا۔ ورنہ گھوڑوں کے سلسلے میں میری یادداشت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ میں نے کوئی ایسی خاص مہارت حاصل کی تھی۔ اب میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنا سیکھ لیا تھا اور جب انسان اپنے کسی ایک شعبے سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں خواہشیں ابھرتی ہیں کہ وہ دوسری چیزوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔ سو ان دنوں میرے لیے مسئلہ وہی لڑکی تھی اور میں اس تاک میں تھا کہ جیسے ہی کہیں سے کوئی موقع ملے میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لوں۔ ویسے بھی مجھے اس عمارت میں گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی تھی۔ عالی میرا مددگار تھا اور چالاکی کے ساتھ میں اس سے مختلف حصوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ تبھی میں نے اس حویلی کے بالکل مختلف حصے میں وہ جگہ دیکھی جسے عقوبت خانہ کہا جاتا تھا۔ اب ظاہر ہے حویلی میلوں کے علاقے میں پھیلی ہوئی نہیں تھی کہ اگر تھوڑی سی کوشش کی جاتی تو اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتی۔ عقوبت خانے کی عمارت الگ رکھی گئی تھی۔ ویسے آقا اس قسم کا انسان نہیں تھا کہ اسے کسی عقوبت خانے کی ضرورت پیش ہوتی۔ لیکن بہرحال آقا تھا اور اس کے معاملات بالکل مختلف تھے اور ایک بار مجھے موقع مل گیا میں نے خانان کو آقا کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دونوں اہم کردار چلے گئے تھے اور اس وقت اگر میں کوشش کرتا تو تھوڑی سی کوشش کے ساتھ اس عقوبت خانے کا جائزہ لے سکتا تھا۔ ویسے میں نے خانان کی موجودگی میں وہاں جانے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نفرت کے آثار پائے تھے اور یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ شخص جب بھی کبھی کوشش کرے گا تو میرے خلاف کوئی بھی عمل کر سکتا ہے۔ بہرحال خانان اور آقا کی غیر موجودگی نے مجھے خاصی حد تک مطمئن کر دیا۔ ابھی ابھی وہ لوگ نکلے تھے اور وقت کافی مل گیا تھا۔ اس لیے میں اپنے طور پر کوشش کر سکتا تھا۔ پھر جھٹپٹا ہونے پر میں آہستہ آہستہ اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے چل پڑا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور ماحول پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا عقوبت خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ خانان بے شک موجود نہیں ہے لیکن اس کے ساتھی وہاں موجود ہوں گے۔ تاہم پھر بھی اپنے طور پر کوشش کرنا چاہتا تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ میں لوگوں کی نگاہ سے بچتا بچاتا عقوبت خانے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ سامنے کی سمت تمام دروازے بند تھے۔ لیکن عقبی سمت میں ایک احاطہ موجود تھا جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ احاطے کے قریب پہنچ کر میں اپنے طور پر اندر جانے کے راستے تلاش کرنے لگا۔ پھر میں نے عقوبت خانے کی عقبی دیوار عبور کی اور احاطے میں اتر گیا۔ دروازوں کو آزمانا بے کار تھا۔ میں جانتا تھا کہ مضبوطی سے اندر سے بند کر دیا گیا ہو گا۔ لیکن پھر بھی میں درختوں کے ذریعے شاخوں شاخوں چلتا ہوا عمارت کی چھت پر پہنچا اور پوری چھت پر ہاتھوں اور پیروں کے بل چل کر نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ مجھے ایک پائپ نظر آیا۔ اس پائپ کے ذریعے میں نیچے اترنے لگا۔ پھر میں نے اس عمارت کے صحن میں جھانکا۔ یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سب لوگ عمارت کے باہر ہیں جو اس عمارت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں احتیاط کے ساتھ صحن میں اتر گیا صحن میں اتر کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک کمرے میں مجھے مدہم روشنی نظر آئی۔ چنانچہ میں اس روشنی کی جانب بڑھ گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ لڑکی اسی ہال نما کمرے میں بند تھی۔ میں آہستہ آہستہ ایک کھڑکی کے قریب پہنچا۔ کھڑکی میں شیشے نہیں بلکہ جالی لگی ہوئی تھی۔ غالباً اس لڑکی کے تحفظ کے لیے، اس کے شیشے نکال دیئے گئے تھے۔ کیونکہ شیشوں کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ تاہم جالی سے بھی اندر دیکھا جا سکتا تھا چونکہ باہر رات پھیلی ہوئی تھی اور اندر روشنی تھی۔ اس روشنی میں، میں نے اس لڑکی کو یوگا کے انداز میں پالتی مارے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور سینے سے لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک پتھر کے بت کی مانند بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن جس جگہ میں اسے دیکھ رہا تھا، وہ وہاں سے صاف نظر آ رہی تھی بدن پر بے شک چیتھڑے جھول رہے تھی۔ لیکن اس وقت وہ جس انداز سے بیٹھی تھی اس سے مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کم از کم ذہنی طور پر غیر متوازن نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ وہاں اصطبل کے گودام میں بھی اسے جس طرح ان لوگوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا تھا اس سے اس کی ہوش مندی کا اظہار ہوتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس سے مخاطب ہوں لیکن کس طرح؟ اس کی کوئی ترکیب سمجھ نہیں آئی تھی۔ اچانک ہی اس نے آنکھیں کھولیں اور گردن اٹھا کر اس طرف دیکھنے لگی جس طرف میں کھڑا تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی سانسیں بھی روکی ہوئی تھیں۔ لیکن نہ جانے کس طرح اسے میری یہاں موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ میں یہاں سے ہٹ جاؤں۔ کہیں وہ کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے کسی کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو جائے۔ یہ صورت حال خطرناک ہوتی۔ بہرحال میں خطرہ مول لے کر یہاں آیا تھا اور میرے تجسس نے مجھے اس طرح مجبور کیا تھا، حالانکہ اس کے مضر اثرات بھی ہو سکتے تھے۔ خاتون اشواریہ نے بھی مجھے منع کیا تھا، حالانکہ اس کے مضر اثرات بھی ہو سکتے تھے۔ خاتون اشواریہ نے مجھے جس طرح آقا کی اس لڑکی سے دلچسپی کے

بارے میں بتایا تھا، اس کے بعد اس بات کے امکانات بھی تھے کہ اگر آقا کو اس بات کا علم ہو جائے کہ میں لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے اور اس کی ناراضی مختلف صورتوں میں میرے لیے خطرناک ہو سکتی تھی اس اجنبی جگہ بہرحال میرے لیے یہ گھر بہت بڑا سہارا تھا۔ لیکن پھر بھی میرے قدم وہاں سے نہ ہٹے۔ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر سیدھی میرے قریب آئی تھی۔ پھر وہ کھڑکی سے چہرہ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی روشن چمک دار آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ تاریکی میں ہونے کی وجہ سے میرا چہرہ اسے نظر نہیں آ رہا ہوگا۔ لیکن اس طرح ساکت کھڑی ہوئی تھی جیسے وہ مجھے بخوبی دیکھ رہی ہو۔ میں نے ہمت کی اور آہستہ سے بولا۔

”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تمہیں یہاں قید کرنے کا باعث بنے ہیں۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گی۔“ وہ خاموشی سے کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر میں نے کہا۔

”اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہاری کوئی بات میں کسی سے کہہ دوں گا، تو اس غلط فہمی کو اپنی دل سے نکال دو، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ تم کون ہو، اور یہاں ان لوگوں نے تمہیں قید کیوں کر رکھا ہے۔ میں تمہاری رہائی کی کوشش بھی کر سکتا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنے ہی نقصانات کیوں نہ اٹھانے پڑیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم کم از کم مجھے اپنے بارے میں بتا دو۔“ وہ خاموش کھڑی رہی اور میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے پھر کہا۔

”اگر تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو تم پر ظلم کر رہے ہیں۔ میں تمہارے بارے میں دوسرے طریقوں سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے بعد تمہیں یہاں سے رہائی دلانے کی کوشش بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن کم از کم مجھے کچھ تو اپنے بارے میں بتاؤ۔“ دیر تک جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے آہستہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے جب مجھے کچھ علم ہی نہیں ہے تو میں تمہیں کیا بتا سکوں گا یا کیا کر سکوں گا تمہارے لیے۔“

میں اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے وہ صرف دیکھنا چاہتی ہو۔ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکلا تھا۔ پھر اچانک ہی عقب میں مجھے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور میں بجلی کی سی تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ پہلے سے ہی تعین کر چکا تھا کہ اگر پیچھے سے کوئی آ جائے تو میرے چھپنے کے لیے کون سی جگہ بہتر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بھاگ کر اس بڑے چوڑے چوکور ستون کی آڑ میں پہنچ گیا۔ جہاں سے ادھر کا جائزہ بھی لے سکتا تھا۔ میں نے نہایت پھرتی سے یہ عمل کیا تھا۔ آنے والے دو افراد تھے جو اس لڑکی کے قید خانے کے دروازے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ غالباً وہ کسی اور کمرے کی جانب جا رہے تھے۔ لیکن مجھے خوشی تھی کہ وہ میری یہاں موجودگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ میں نے اور زیادہ خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ آج کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ اگر میرے الفاظ لڑکی نے سمجھے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ بعد میں وہ اس بارے میں سوچے اور اس سے دوسری ملاقات کے لیے کوئی مناسب موقع تلاش کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے واپسی کا ہی فیصلہ کیا اور دبے قدموں آگے بڑھتا ہوا احاطے کی دیوار کے پاس آ گیا۔ پھر دوسری جانب کود گیا اور لوگوں کی نگاہوں سے چھپتا چھپاتا اپنی رہائش گاہ میں آ گیا۔ آج میں نے لڑکی کو بغور دیکھا تھا۔ کیا چیز ہے آخر وہ، کیا وہ جان بوجھ کر خاموش رہنا چاہتی ہے۔ کیا اس کا دماغی توازن خراب ہے کیا قصہ ہے؟ کوئی ایک بات جو سمجھ میں آئی ہو۔ بہرحال اس سے کوئی فرق

نہیں پڑتا تھا۔ میں بستر پر لیٹ کر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ عالی بھی مجھے اس کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتا سکتا تھا اور اب زیادہ تجسس میرے لیے خطرناک تھا۔ کیونکہ بہرحال عالی بھی میرا ملازم نہیں تھا۔ بلکہ آقا کا وفادار ساتھی تھا۔ مجھے احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا پڑے گا لیکن بہرحال دل میں یہ آرزو ضرور تھی کہ اس لڑکی کے بارے میں تفصیلات معلوم کروں گا۔ پھر اس کے بعد مجھے اپنے ذہن سے تمام خیالات جھٹک دینا پڑے۔ بلاوجہ ذہن تھکانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی موقع مل جائے تو اس سلسلے میں ضرور کوشش کروں گا۔ یہ لوگ میرے لیے دل میں بڑے اچھے خیالات رکھتے ہیں اور میں خود ان سے محبت کرنے لگا تھا۔ جس طرح اچھے لوگوں کا ساتھ مل جاتا ہے۔ میرا کتنا خیال رکھا جا رہا تھا اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ خاتون اشوار یہ اس کے بعد کئی بار ملی لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس دن کی اداسی اس نے اپنے ذہن سے جھٹک دی ہو۔ اس کے بعد کچھ اور تبدیلیاں ہوئیں۔ کئی دن گزر گئے تھے اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس دن کچھ نئے مہمانوں کی آمد ہوئی۔ کچھ خواتین اور ایک خوبصورت سا نوجوان جو مقامی ہی معلوم ہوتے تھے، وہاں پہنچے۔ ابتدا میں تو مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ پتا چل گیا کہ وہ آقا کے عزیز واقارب ہیں۔ کسی اور ملک سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ خوبصورت سا نوجوان جو انتہائی دلکش شخصیت کا مالک تھا، اس کا نام ناصری تھا اور وہ بزرگ شخصیت، جو خواتین کے علاوہ ان لوگوں کے ساتھ آئی تھی اس کا نام عصران تھا۔ یہ آقا کے بہت قریبی عزیز تھے۔ غالباً بہت ہی قریبی عزیز، کیونکہ ان کی آمد سے آقا بہت خوش نظر آتا تھا۔ خواتین بھی جدید لباس میں ملبوس تھیں۔ لیکن ذرا لیے دیے تھیں اپنے آپ کو۔ میرے لیے یہ بڑے دلچسپ لمحات تھے۔

(جاری ہے)

فائرنگ

ہنری اپنے دوستوں کو امریکا کے واقعات سنا رہا تھا۔

”ایک روز مجھے ریڈ انڈین لوگوں نے گھیر لیا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ان پر فائر کھول دیا۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ بارہ۔۔۔ چودہ۔۔۔ ایک منٹ ایک منٹ۔“

ایک دوست نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم نے اپنا ریوالور لوڈ کب کیا تھا؟“

”جب کوئی شخص اتنی بُری طرح گھر جائے۔“ ہنری نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ فضول چکروں میں پڑے اس کو تو صرف فائرنگ سے غرض ہوتی ہے۔“

☆☆☆

یادداشت

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر پہنچے اور کافی دیر اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔ کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے وہیں کھانا بھی اک ساتھ کھالیا۔ پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔

کئی گھنٹے بعد جب پروفیسر رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسماً پوچھا۔

”گھر پر سب خیریت ہے نا؟“

پروفیسر نے چونک کر جواب دیا۔

”خوب یاد دلایا، اصل میں، میں تمہارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔“

☆☆☆

سرپرائز

اکرام اختر

وہ ایک معمولی آدمی تھا اور ایک لڑکی کو بہت بڑا سرپرائز دینا چاہتا تھا... لیکن وقت اس کے لیے کچھ اور ہی چھپائے بیٹھا تھا

ایک لفٹ آپریٹر کی دلچسپ کہانی

لفٹ آپریٹر جو نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ذرا احتیاط سے مس چوتھی منزل آ گئی ہے۔'' لفٹ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ دروازہ کھلتے ہی لڑکی بڑے باوقار انداز میں لفٹ سے نکلی اور ایڑیاں کھٹکھٹاتی کوریڈور میں چل دی۔ جو اس وقت لفٹ کے دروازے سے لگا، دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے کوریڈور میں جاتی ہوئی سنہرے بالوں والی دوشیزہ کی طرف دیکھا جو ہوٹل کے قالینی فرش پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

اس کے چلنے کے انداز اور دلکش ٹانگوں کو دیکھ کر آپریٹر کے دل میں ایک گدگدی سی ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ لڑکی کچھ ایسی بری بھی نہیں۔ اس نے آج اسے پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک خوب صورت دوشیزہ تھی جو اس کے بارے میں سوچتے سوچتے جمائیاں لینے لگا۔ لفٹ کا سگنل بند تھا یقینی کسی شخص کو اس وقت لفٹ درکار نہیں تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور جو کی لفٹ اس وقت بھی ہوٹل میں کام کر رہی تھی اس نے سوچا کہ اسے انتظار کرنا چاہیے۔ اسے لڑکی کی

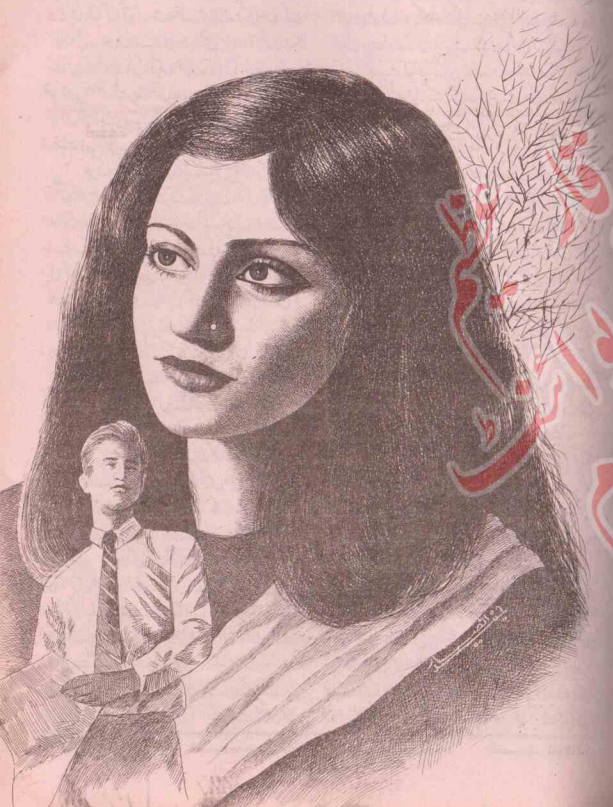

منزل کا پتا تھا وہ جانتا تھا کہ لڑکی یقیناً لابی میں نیچے جانے کے لیے واپس آئے گی۔

لڑکی ۴۰۲ نمبر کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ یہ دروازہ ہال کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی نے سیاہ دستانے والا اپنا ہاتھ اٹھایا اور بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ جو حیران تھا کہ اتنی آہستہ دستک بھلا اندر کسی نے کیسے سنی ہوگی۔ جو نے اپنے پیروں میں پڑا ہوا سگریٹ کا خالی پیکٹ ٹھوکر مار کر ایک طرف ہٹا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ ۴۰۲ نمبر والا بھی خوب ہے۔ یہ جتنی بار بھی شہر میں آتا ہے ہر بار ایک نئی دوشیزہ اس کے بستر کی زینت بن جاتی ہے۔

کمرے میں مقیم آدمی ایک سابق پیشہ ور فٹ بالر تھا گز بھر چوڑے چکلے بھرے بھرے شانوں کا مالک اور مضبوط کسرتی بدن والا تھا۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کے بدن کی کشش عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اب وہ کئی کھیلوں کا سامان بنانے والی کمپنی کے لیے سیلز مین کا کام کرتا تھا۔ جو کے چہرے پر یہ خیال آتے ہی ایک زہریلی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ”ہونہہ“ اس نے سوچا ”کھیلوں کے سامان کے ساتھ ساتھ گڑیوں کی تجارت بھی کرتا ہے، کم بخت۔“ اس نے نفرت سے سوچا۔

اس نے اپنے سکڑے ہوئے کندھے اچکائے اور اسے اپنے سرخ یونیفارم سے کراہت سی آنے لگی۔ اس نے دل میں سوچا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اس آدمی سے جلنے لگا ہوں۔“ پھر اسے خیال آیا کہ خود اس کی بیوی ایک حسین عورت ہے لیکن وہ مجبور تھا کیونکہ وہ جب بھی کسی نوجوان جوڑے کو یا ہوٹل میں مقیم کسی عیاش آدمی کے کمرے کی طرف کسی حسین دوشیزہ کو جاتے ہوئے دیکھتا اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ جانے کیوں اسے ان باتوں سے بڑی نفرت تھی۔

لڑکی نے دو بار ذرا زور سے دروازے پر دستک دی۔ جو واپس لفٹ میں آ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر تیسری بار بھی دستک دینے پر جواب نہ ملا تو لڑکی منہ لٹکائے واپس آ جائے گی اور ہوا بھی یہی۔ چند لمحوں بعد مایوسی کی تصویر بنی وہ لڑکی لفٹ کی طرف واپس آ رہی تھی۔ لفٹ والے کو اپنا انتظار کرتے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرانی کا تاثر ابھرا، پھر وہ گردن جھکائے لفٹ میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ جو نے اس کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے اپنی خفت مٹانے کے خیال سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اندر کوئی نہیں ہے۔“

جو نے کہا۔ ”ممکن ہے وہ سو رہا ہو۔“ لڑکی اس بات کے لیے تیار نہیں تھی۔ ”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ پھر وہ زیرِ لب مسکرائی اور بولی۔ ”میں نے دروازہ اس زور سے کھٹکھٹایا تھا کہ وہ کسی مردہ آدمی کو جگانے کے لیے بھی کافی تھا بہرحال میں لابی میں انتظار کروں گی۔“ جو کا ہاتھ خود کار مشین کی طرح لفٹ کے کنٹرول کی طرف بڑھا پھر وہ کچھ جھجکا۔ اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ لڑکی لابی میں بیٹھی ہوئی ہے اور شاطر و عیار شکاری مرد، بھوکے بھیڑیوں اور گدھ کی طرح سے اس کے آس پاس اس کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں اس نے سوچا۔۔۔ یہ لڑکی تو بمشکل تمام سولہ برس کی ہوگی اتنی کم سن بھولی اور معصوم وہ تو قد میں اور عمر میں اس سے بھی کہیں چھوٹی تھی۔ نہیں نہیں، وہ اسے نیچے نہیں لے جائے گا پھر اسے خیال آیا کہ آخر وہ کیوں دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے پر مصر ہے۔

کیا میں کوئی اسکاؤٹ بوائے ہوں یا اس لڑکی کا سرپرست ہوں جو اس کے لیے خوامخواہ اس قدر فکر مند ہو رہا ہوں۔ جہنم میں جائے یہ اور اس کے اوباش دوست! لیکن وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”مس اگر آپ چاہیں تو بجائے لابی میں انتظار کرنے کے اس کے کمرے میں جا سکتی ہیں۔ میرے پاس اس کمرے کی دوسری چابی موجود ہے۔“

لڑکی نے اپنی پلکیں اٹھائیں اور جو کی نیلی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ یہ اس کے لیے پہلا موقع تھا کہ وہ ایسی صورت حال کا سامنا کر رہی تھی۔ وہ کچھ نروس سی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہنسی۔ ”کیا تم ہمیشہ اسی

طرح اجنبی لوگوں کو دوسروں کے کمروں میں اندر بھیج دیا کرتے ہو۔“

”وہ بالکل اعتراض نہیں کرے گا اس لیے کہ میں پہلے بھی کئی بار لڑکیوں کو اسی طرح اس کے کمرے میں بھیج چکا ہوں۔“

لڑکی کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ پھر اس نے غیر ارادی طور پر اپنی آنکھیں جو پر گاڑ دیں۔ جو نے سوچا کہ وہ اس کا ذہن پڑھ سکتا ہے۔ اس نے سوچا ممکن ہے یہ لڑکی دوسروں سے ذرا مختلف ہو۔۔۔ ”مس! آپ کوئی اجنبی تو نہیں ہیں نا۔“ پھر اس نے لڑکی کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پہلے بھی کئی بار تمہیں اور ۴۰۲ نمبر والے کو ایک دوسرے کے ساتھ دیکھا ہے۔ لابی میں، کافی شاپ میں اور دوسری جگہوں پر پھر اجنبیت کا کیا سوال۔“

لڑکی نے ایک آہ بھری اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ تو وہ بولا۔

”دراصل آج دوپہر میری بیوی مجھ سے تم دونوں کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے خیال میں تم دونوں واقعی سنجیدہ ہو گئے ہو۔۔۔ ویسے بھی تم جانتی ہو کہ شادی شدہ عورتوں کو خوامخواہ کنواری لڑکیوں کے معاملات سے ہمیشہ دلچسپی رہتی ہے اور وہ کسی نہ کسی کا جوڑا ملانے اور بتانے پر مصر رہتی ہیں۔“

”کون۔۔۔؟ تمہاری بیوی۔“ لڑکی نے بوکھلا کر پوچھا۔

جو نے کہا۔ ”ہاں وہ یہاں کافی شاپ میں بطور ویٹرس ملازم ہے۔ وہی سنہرے بالوں والی لڑکی خوب صورت لڑکی۔ شاید تم نے اسے وہاں دیکھا بھی ہوگا۔“

لڑکی نے کہا۔ ”ہاں، مجھے یاد آیا واقعی وہ بہت حسین لڑکی ہے۔“ جو کو اس کی آواز میں حیرانی کے عنصر کی پہلے سے توقع تھی۔ لوگ واقعی یہ سن کر اکثر حیران ہو جاتے تھے کہ نائٹ شفٹ کے لفٹ آپریٹر کو خدا نے ایسی حسین گڑیا سی بیوی عطا کی تھی لیکن اب وہ لوگوں کو محض حیران اور پریشان کر دینے سے زیادہ بھی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ جانے کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح اس لڑکی کو مرعوب کر لے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی نازک سی کلائی کو اپنی آہنی گرفت کے شکنجے میں جکڑے اور کہے ضروری نہیں کہ طاقت ور اور کسرتی بدن کے لوگ ہی جوان مرد ثابت ہوں بعض اوقات مجھ جیسے مرد بھی بڑے اہم ثابت ہو سکتے ہیں لیکن اسے خیال آیا کہ بھلا اسے ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

لڑکی شاید وقت گزارنے کے خیال سے گفتگو کو طول دے رہی تھی اسے معلوم نہیں تھا کہ ہوٹل کے ملازمین آنے جانے والے گاہکوں کے متعلق اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں۔ جو مسکرایا۔ ”میں جانتا ہوں ہم جیسے لوگ اکثر اوقات تم لوگوں کے لیے محض ملازم ہوتے ہیں اور بس اب مجھے ہی دیکھ لو میں صرف اس لفٹ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہوں۔“ اس نے خود کو حقیر سمجھتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر وہ کسی اچھے عہدے پر ہوتا تو لڑکی یقیناً اس سے مرعوب ہو کر رہتی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

لڑکی اس کی سوچ کو پا گئی تھی وہ بولی۔ ”ارے نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ احتجاج کرتے ہوئے کہہ رہی تھی لیکن جو اپنے خیالات میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر وہ ہوٹل منیجر ہوتا یا کوئی اور بڑا افسر ہوتا تو اس وقت صورت حال قطعی مختلف ہوتی اور یہ لڑکی اس کے ڈی لکس سوٹ کے دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہوتی۔ پھر اس نے سوچا کیوں نہ وہ ڈرامہ کرے اور اس پر یہ ظاہر کرے کہ وہ بہت اہم آدمی ہے۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے گلا صاف کیا اور بولا۔

”مس! دراصل بات یہ ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں۔“ پھر اس نے پُراسرار انداز میں یونیفارم کا کوٹ اٹھایا اور ریوالور کا بٹ اسے دکھاتے ہوئے بولا۔ ”رات کو یہاں اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے تو میں سنبھال لیتا ہوں۔ اسی لیے مجھے نائٹ شفٹ کا انچارج بنایا گیا ہے۔“

لڑکی کی آنکھیں حیرت اور تجسس سے پھٹ گئیں۔ وہ بولی۔ ”اس کا مطلب ہے تم کوئی خفیہ

جاسوس بھی ہو۔" جو نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "ہاں، لیکن یہ بات اپنے تک ہی رکھنا کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے یہ ایک خفیہ اور اہم راز ہے اور اسے راز ہی رہنا چاہیے۔"

لڑکی نے جلدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھوں گی۔"

قصہ دراصل یوں تھا کہ یہ ریوالور ہوٹل میں گشت کرنے والے سارجنٹ اوریلی کا تھا۔ وہ ایک بیوہ سے ملنے جا رہا تھا اور کیونکہ جو اس کا قابل اعتماد دوست تھا۔ اس لیے چلتے وقت یہ ریوالور بطور امانت اس کے پاس رکھوا کر خود ہوٹل سے باہر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹا تو نویں منزل پر مقیم دولت مند بیوہ سے ملنے چلا گیا۔

اوریلی نے اس سے کہا تھا۔ "بھائی! قصہ یہ ہے کہ میں اس عورت کو خوامخواہ سراسیمہ نہیں کرنا چاہتا تم تو جانتے ہی ہو۔ محبت کے معاملے میں کسی دوشیزہ یا محبوبہ کو ہراساں کرنا بھلا کہاں کی عقل مندی ہے۔ بس ایک ہی گھنٹے کی تو بات ہے۔ میں واپسی آ کر لے لوں گا۔"

جو نے ریوالور اپنی پتلون میں اڑس لیا تھا۔

لڑکی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا اور بولی۔

"تم نے شاید کمرے میں اس کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ واقعی یہ بات اسے حیران کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔ ٹھیک ہے میں کمرے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کروں گی۔"

جو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ حیران تو وہ یقیناً ہوگا۔

جو اس لڑکی کو ہمراہ لیے ۴۰۲ نمبر کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ پھر اس نے ڈبل چابی تالے میں ڈالی اور دروازہ کھول دیا۔ لڑکی شاید اسے ٹپ دینے کے لیے اپنا پرس ٹٹول رہی تھی یکا یک اس نے اوپر نظر اٹھائی اور جو منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا اسے ہراساں کرنے کے لیے کافی تھا۔

کمرے میں ایک عورت کی گھٹی گھٹی چیخ ابھری اور پھر فٹ بال کے کھلاڑی نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے تھے۔ وہ دونوں بے لباس حالت میں تھے۔ آدمی کی آنکھوں سے غصے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ کوریڈور میں کھڑی ہوئی لڑکی لڑکھڑائی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ یہ شرمناک منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔

خود جو کی حالت بھی غیر تھی۔ وہ دروازے کے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن مفلوج ہو کر رہ گیا ہو۔ اس میں ہلنے جلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ یکا یک کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی۔ جو نے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

جو اور لڑکی کوریڈور میں بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے ان کے بدن سے لہو کا آخری قطرہ تک خشک ہو گیا ہو۔

"تم جانتے تھے کہ اندر کیا ہو رہا ہے تم اچھی طرح واقف تھے اور تم نے پھر بھی۔۔۔"

جو قالین کی طرف گھورے جا رہا تھا۔ "میں پہلے بھی کمرے کے پاس سے گزرا تھا۔ میں نے انہیں باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے سن لیا تھا۔" اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا، لیکن وہ لڑکی سے نظریں چرا رہا تھا۔

"تم چاہتے تھے کہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ یہ شخص کس قدر بدکردار اور سیاہ کار ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

"مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔" جو نے کہا۔

لڑکی اس کے قریب آ گئی اور آہستہ سے اس کا ہاتھ چھو کر بولی۔ "تمہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔ میرا مطلب ہے تمہیں کوئی الجھن یا پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی ویسے بھی تمہارا کام تو جاسوسی ہے نا۔"

جو نے اس کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیا اور بولا۔ "کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔" وہ اب اس لڑکی کو جلد سے جلد ہوٹل سے رخصت کر دینا چاہتا تھا۔ وہ

چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جائے۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ کی طرف گھسیٹا۔ "آؤ میں تمہیں نیچے لے جاؤں۔" وہ تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھا۔

لفٹ میں داخل ہوتے ہی لڑکی کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

"خدا کے لیے آپ اس بات کا غلط اثر نہ لیں۔ میں آپ سے التماس کرتی ہوں کہ جو بھی ہوا اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جائیں۔ اس شخص کی میری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے لیے اب میرے دل میں کوئی وقعت کوئی گنجائش نہیں۔ ہو سکتا ہے کل تک۔۔۔ ہو سکتا ہے ابھی۔۔۔ بہر حال میں اسے یوں بھول جاؤں گی جیسے میں اسے کبھی ملی ہی نہیں تھی۔" اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

جو کا دل چاہا کہ لڑکی اپنی بکواس بند کر دے۔ وہ ہنکارا۔ "یقیناً۔۔ میرا خیال ہے ایسا ہی ہوگا۔"

اچانک لفٹ میں نویں منزل کی لائٹ روشن ہوگئی۔ "اوہ۔" جو نے سوچا۔ "اس کا مطلب ہے اوریلی واپس آ چکا ہے اور اس وقت اسے لفٹ کی ضرورت ہے۔" لابی اس وقت خالی پڑی تھی۔ لڑکی جلدی سے لابی میں چلی گئی۔ جو کی چمک دار نیلی آنکھوں کی روشنی مدھم ہوگئی۔ لفٹ کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ اوریلی غالباً اس وقت کافی بے چینی سے نویں منزل پر ٹہل رہا تھا۔ جو نے سوچا اوریلی کو اس وقت نیچے آنے کی جلدی ہے تاکہ وہ ہوٹل کے منیجر کے راؤنڈ سے پہلے اپنی ڈیوٹی پر واپس آ کر اپنی مستعدی کا ثبوت دے سکے اور ادھر مجھے جلدی ہے جس قدر جلدی ممکن ہو میں اوپر جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنا کام جو ادھورا رہ گیا ہے اسے مکمل کر سکوں۔ جو کی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آنسو اس کے پپوٹوں میں آ کر رک گئے ہوں۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کرنے لگا۔ اسی اثنا میں لڑکی لابی کے وسط میں پہنچ کر رک گئی تھی اور پلٹ کر جو کی طرف دیکھ رہی تھی غالباً اس کا خیال تھا کہ جو کچھ کہے گا۔ جو کی نظر لڑکی پر پڑی جو مین گیٹ کی طرف جانے کا ارادہ کر رہی تھی۔

جو نے لفٹ سے سر نکال کر لڑکی کو "شب بخیر" کے الفاظ کہے اور سگریٹ سلگا کر لفٹ کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ دھوئیں کے مرغولے ہوا میں بکھرنے لگے۔ ہال اور لابی کے گرم ماحول میں اسے ایک عجیب سی آسودگی مل رہی تھی لیکن اس کے دل میں ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔ نفرت اور انتقام کا آتش فشاں۔۔۔

لفٹ کے دروازے میں کھڑے ہو کر وہ لڑکی کے چہرے کے تاثرات کے بارے میں اندازہ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ واقعی یہ سب کچھ نہ صرف لڑکی کے لیے ایک بہت بڑی سرپرائز پارٹی تھی بلکہ خود اس کے لیے بھی اس سے بڑھ کر حیرت کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے ہرگز اس بات کی توقع نہیں تھی کہ یہ سب کچھ اس طرح ہو جائے گا۔ پہلے تو اسے خود بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ کسی غلط کمرے میں چلا گیا ہے لیکن کمرے کا منظر ابھی تک اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ بے لباس حالت میں وہ عورت جو کمرا نمبر ۴۰۲ میں اس کھلاڑی کے ساتھ تھی وہ اس کی اپنی بیوی تھی۔۔۔

اس نے سوچا۔ کل صبح جب یہ لڑکی اخبار پڑھے گی تو حیرت سے سکتے میں رہ جائے گی۔ واقعی یہ خبر تو اخبار کی سرخی ہوگی اور جلی حروف میں شائع کی جائے گی۔ ممکن ہے وہ اس کی، اس کمینے فٹبالر کی اور اس کی بیوی کی تصویریں بھی شائع کریں۔ سب اخباروں میں یہ سنسنی خیز خبر ضرور شائع ہوگی اور جنگل کی آگ کی طرح شہر کے بچے بچے کی زبان پر یہ قصہ ہوگا۔ ویسے بھی ایسا تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ سابق پیشہ ور کھلاڑی کسی ہوٹل میں مردہ پایا جائے۔ اس نے لابی پر آخری بار نظر ڈالی اور لفٹ بند کر کے چوتھی منزل پر کمرا نمبر ۴۰۲ کی طرف چل دیا۔

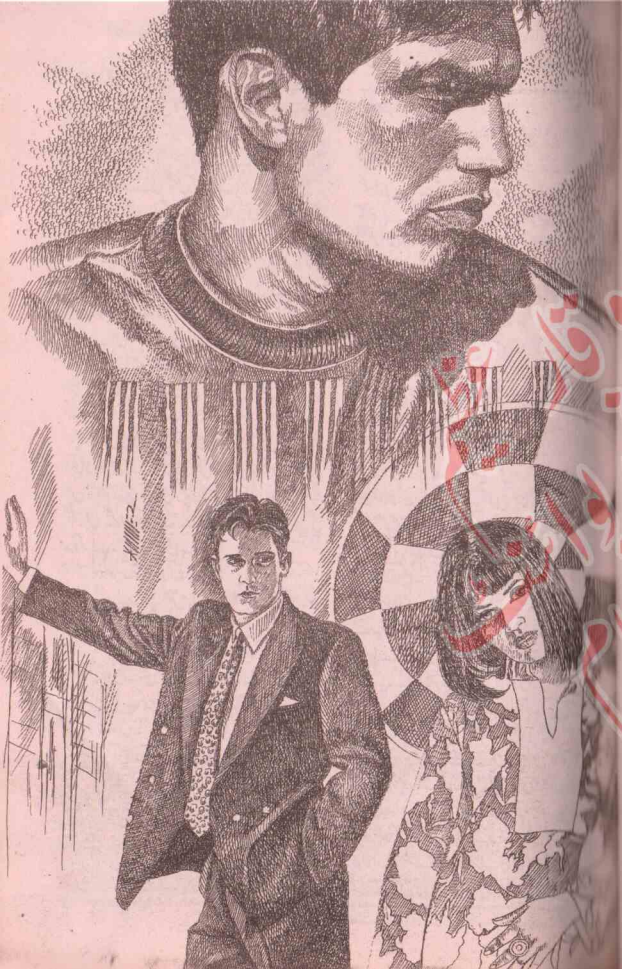

آٹھویں قسط

لاوارث

غزالہ جلیل راؤ

انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو' کسی بھی ملک میں رہتا ہو' جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں' وہیں اس سے نفرت کرنے والوں کا وجود بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کو زمانے کے گرم و سرد سے بچانے والے' اس کو سایہ فراہم کرنے والے اس کے لیے جان نچھاور کرنے والے ہر جگہ' ہر علاقے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے خلاف سازشیں کرنے والے' اس کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے' اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے دوستوں کے روپ میں اس کے وجود کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ' اس کے باپ کا پتا نہیں تھا...... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا...... اس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی...... لیکن اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی موجود تھے۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک سلسلہ وار انوکھی داستان

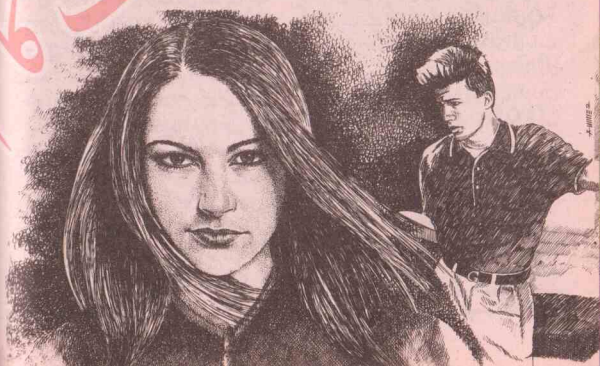

ایک صحافی نے کہا۔

"سب سے پہلے ہم اس انوکھے ادارے کی بنیاد رکھنے پر جناب حیدر علی کو مبارک باد دیتے ہیں۔ یقیناً ادارہ ملک میں اپنی نوعیت کا انوکھا ادارہ ثابت ہوگا اور جس کے مقاصد بے شک بہت اعلا ہوں گے۔ میں پہلا سوال حیدر علی صاحب سے یہ کرتا ہوں کہ اس ادارے کی تکمیل کب تک ہو جائے گی؟"

حیدر علی نے گلا صاف کیا اور کسی قدر اعتماد سے بولے۔

"اس کے لیے وسیع و عریض زمین محفوظ کر لی گئی ہے۔ ہم نے اس کا نقشہ ایک ماہر آرکیٹیکٹ سے بنوایا ہے اور اب ہماری خواہش ہے کہ حکومت ہمارے اس منصوبے کی جلد تکمیل کے لیے ہماری مدد کرے اور ہمیں ایسی الجھنوں میں نہ پڑنے دے جس سے اس پروجیکٹ کی تکمیل کے سلسلے میں تاخیر ہو۔"

"بے شک! یہ حکومت کا بھی فرض ہے۔ ہم اخبار والے آپ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ہم آج کی اس رپورٹنگ کو نمایاں طور پر شائع کریں گے اور حکومت سے اپیل کریں گے کہ آپ کی مدد کرے۔" ایک صحافی نے کہا۔

دوسرے صحافی نے پوچھا۔

"ویسے۔۔۔ محترم! آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟"

"بھئی۔۔۔ بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ پاکستانی ہوں۔ یہی میرا وطن اور ملک ہے اور میں اس سے اپنے آپ کو دنیا کے دوسرے تمام تعلقات پر ترجیح دیتا ہوں۔"

"پاکستان آنے سے قبل آپ کا قیام کہاں تھا۔"

"بادہ بنکی کا رہنے والا ہوں۔ وہیں پیدا ہوا تھا۔ مگر اب یہ پرانی بات ہے۔" حیدر علی صاحب نے کہا۔

ایک صحافی جو کسی سلسلے میں بابر علی صاحب کا انٹرویو کر چکا تھا۔ چونک کر بولا۔

"آپ بابر علی صاحب کے والد ہیں، بابر علی صاحب خود کو لکھنوی بتاتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ہے کہ آپ کا تعلق بادہ بنکی سے ہو اور بابر علی صاحب کا لکھنو سے؟"

حیدر علی صاحب ایک لمحے کے لیے بوکھلا گئے۔ جانتے تھے کہ بیٹا اس بات کے لیے کوشاں رہا ہے کہ خود کو بادہ بنکی کے بجائے لکھنوی ظاہر کرے۔ شیری نے ان کی بوکھلاہٹ محسوس کی۔ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"معافی چاہتا ہوں دخل اندازی کی، اس کے جواب میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لکھنو کی تہذیب اور وہاں کے رہنے والوں کا ایک خاص تاثر اس کے اطراف میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ جس طرح خود لکھنو میں اور لکھنو کے بالکل قرب و جوار میں رہنے والے اس تہذیب سے متاثر ہیں اور خود کو لکھنوی کہلانے میں ایک شان محسوس کرتے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔" صحافی مطمئن ہو گیا۔

اس کے بعد بھی حیدر علی صاحب سے بہت سے سوالات کیے گئے۔ یہ بھی پوچھا گیا کہ "آپ کا گھر" کے اخراجات کہاں سے پورے کریں گے۔ اس میں کتنا اسٹاف ہوگا، حکومت سے کتنی امداد حاصل کی جائے گی۔"

حیدر علی صاحب جواب دیتے رہے۔ صحافیوں نے یہ سارے جوابات نوٹ کر لیے تھے۔ اس کے بعد چائے رکھی گئی۔ جس کے ساتھ بہترین لوازمات پیش کیے گئے۔ پھر یہ کانفرنس ختم ہو گئی۔

حیدر علی صاحب کی بے شمار تصاویر لی گئیں۔ ان کے اہلِ خاندان کی تصاویر بھی کھینچی گئیں۔ اور دوسرے دن اخبارات نے اس پریس کانفرنس کی شان دار رپورٹنگ کی۔ تقریباً تمام ہی اخبارات نے حیدر علی صاحب کے اس دوستانہ اقدام کو بے حد سراہا تھا اور لکھا کہ اگر ملک و قوم کے ہمدرد یہی درد دل میں رکھ کر اپنے حسب حیثیت ملک کی فلاح کے لیے کام کرتے رہیں تو وہ وقت دور نہیں جب اس ملک میں

[illegible] حال لوگ تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملیں [illegible] حیدر علی صاحب اور ان کے اہل خاندان کی [illegible] نمایاں طور پر شائع کی گئی تھیں۔

تمام اخبارات شیری نے حیدر علی صاحب کو [illegible] تھے اور حیدر علی صاحب کی خوشیوں کا کوئی [illegible] نہیں تھا۔ انہوں نے بڑے متاثر کن لہجہ میں کہا

"شیری! دراصل انسان بہت کچھ ہوتا ہے، [illegible] اسے تحریک دینے والا حقیقت میں سب کچھ ہوتا [illegible] میری تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا گیا ہے، میں صرف تمہاری مہربانی سمجھتا ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے مجھے حاصل ہوا ہے۔"

"اور میں آپ کا کون ہوں دادا ابو!" شیری [illegible] بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم میرے بیٹوں ہی کی مانند ہو۔ میں دروغ گو آدمی نہیں ہوں۔ لیکن میرے دل میں تمہاری [illegible] اسی طرح جاگزین ہے جس طرح اپنے تمام [illegible] کے لیے۔"

"بہت بہت شکریہ دادا ابو! اس سے زیادہ مجھے اور کچھ درکار نہیں ہے۔" شیری نے کہا۔

گھر کے تمام افراد بے حد خوش تھے۔ البتہ شام کو بابر علی صاحب آگ بگولہ بنے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ خونخوار [illegible] سے وہ اہل خانہ کو گھورتے ہوئے اپنے [illegible] میں چلے گئے اور پھر بیگم کو آواز دی۔

بیگم صاحبہ بڑے مطمئن انداز میں اندر پہنچیں۔ [illegible] کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ [illegible] نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آ گئے آپ۔۔۔ میرا تو خیال تھا کہ دو چار [illegible] کے بعد آئیں گے۔ کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی [illegible] کب آئیں گے۔"

"کیا خیال تھا آپ کا، دو چار مہینوں کے بعد [illegible] گا۔ تا کہ آپ لوگوں کی رنگ رلیوں میں کوئی [illegible] نہ پڑے۔" بابر علی صاحب غرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ بیگم صاحبہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔

"اپنے الفاظ پر غور کر رہے ہیں آپ! کون سی رنگ رلیوں کی طرف اشارہ ہے؟"

"اخبارات ضرور دیکھے ہوں گے آپ نے بلکہ نہایت ذوق و شوق سے دیکھے ہوں گے سب کی تصویریں ہیں ان میں۔ ماشاء اللہ! بڑی شہرت ملی ہے آپ سب کو۔"

"کسی ناچ رنگ کی محفل کی تصویریں ہیں کیا؟" بیگم صاحبہ بھی چک کر بولیں۔

"پریس کانفرنس کا انتظام کس نے کیا تھا؟"

"آپ کے والد صاحب کے حکم پر شیری نے۔"

"شیری۔۔۔" بابر علی صاحب غرائے۔

"میں جانتا تھا، اچھی طرح جانتا تھا۔۔۔ میں خوب جانتا ہوں کہ شیری کو میرا قائم مقام بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گھر میں میرا نہیں اب شیری کا حکم چلتا ہے۔ وہ سب کچھ بن چکا ہے اس گھر کا۔ ہر شخص اسی کے گن گا رہا ہے اور ابو۔۔۔ وہ اس گھر پر بہت بڑی تباہی لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بات کر لیں آپ ان سے۔ ہم لوگوں پر کیوں بگڑ رہے ہیں۔"

"اس لیے بیگم کہ ابو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ وہ عقل کھو بیٹھے ہیں لیکن میرے بعد گھر کی ذمہ داریاں آپ پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ کی آنکھیں بند ہونے پر مجھے تعجب ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔"

"خوش فہمی ہے آپ کی۔۔۔ میں کہتا ہوں، غور کیا ہے کبھی شیری پر۔۔۔ سوچا ہے کبھی اس کے بارے میں۔ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ کیا کرنا چاہتا ہے وہ اس گھر میں۔ بیگم آپ بیٹیوں کی ماں ہیں، جوان

بیٹیوں کا گھر ہے۔ اس جیسا شاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گی کسی وقت۔۔۔ کیا آپ انتظار کر رہی ہیں اس وقت کا جب آپ کی ناک کٹ جائے اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔"

"خاموش ہو جایئے بس علی صاحب! خاموش ہو جایئے۔ اگر میری زبان کھل گئی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ سارا غرور خاک میں مل جائے گا۔ جایئے میں ذمہ داری لیتی ہوں، ضمانت دیتی ہوں اس بات کی کہ آپ کی بیٹیوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو آپ مجھے گولی مار دیجیے گا۔ جو کچھ میں نے سنا ہے، دیکھا ہے، اس کے لیے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی بیٹیاں بہک سکتی ہیں، شیری نہیں بہک سکتا۔" بیگم صاحبہ پرجوش لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب۔ کیا مطلب ہے اس بات کا۔"

"بس، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"پھر بھی کوئی تو مطلب ہوگا، اس بات کا۔۔۔"

"صرف ایک مطلب ہے اور وہ یہ کہ وہ کسی شریف ماں کی اولاد ہے، وہ کسی مریم صفت کا بیٹا ہے جس نے اسے شرافت سکھائی ہے۔ میں نے اس کی ذمہ داری قبول کی ہے۔"

بیگم صاحبہ کی کیفیت دیکھ کر باہر علی صاحب کچھ نرم پڑ گئے۔

"آپ بہت جذباتی ہیں اس کے لیے۔۔۔"

"وہ ہے ہی محبت کیے جانے کے قابل۔۔۔ خدا کی قسم! شیری اب گھر میں غیر نہیں رہا۔ میں ماں ہوں اس کی۔ وہ ہماری عزت کا رکھوالا ہے، مجھے وہ اپنے دوسرے بیٹوں ہی کی مانند عزیز ہے۔"

"تعجب ہے وہ آج تک مجھے متاثر نہیں کر سکا۔"

"آپ لوگ کچھ بھی کہیں اس کے بارے میں۔ کوئی بھی رنگ چڑھ جائے آپ پر۔۔۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کہیں کوئی پھانس ضرور ہے۔ نہ جانے وہ کیا چاہتا ہے۔۔۔ کچھ ضرور۔۔۔" بابر علی صاحب کی آواز دھیمی پڑ گئی وہ غور و فکر میں ڈوب گئے تھے۔

بابر علی صاحب کی زندگی میں ایک جھگڑا تھا۔ دولت کی ہوس تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ سارے ملک کی دولت اپنی تجوریوں میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اندر کا آدمی کبھی کبھی جاگتا تھا۔ لیکن اس پر حاوی تھے۔ اس کی بات پر انہوں نے کبھی کان نہیں دھرے تھے۔ یہ اندر کا آدمی تو ہمیشہ بہکاتا ہے فضول باتیں کرتا ہے۔ نیکوکاروں کی بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ جن میں بھوک، افلاس، بیماریاں پرورش پاتی ہیں۔ نورانی چہرے فاقہ کشی سے زرد نظر آتے ہیں۔ انہیں یہ زرد چہرے ناپسند تھے۔ زردی اور سونے کے انبار کی اور وہ سونے کے انبار لگا رہے تھے۔ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے۔ چالاک آدمی تھے۔ ہمیشہ پہلو بچا کر کام کرتے رہے تھے۔ شہر میں ان کی کئی ملیں اور فیکٹریاں کام کر رہی تھیں۔ ان فیکٹریوں میں مختلف چیزوں کی پروڈکشن ہوتی تھی۔ صاف ستھرا مال باہر نکلتا تھا۔ اور بڑی ایمان داری سے صحیح داموں فروخت ہوتا تھا۔ حکومت کو بھی ان سے ٹیکس کی شکایت نہیں ہوئی تھی لیکن درپردہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ملک کی مارکیٹ میں بابر علی صاحب کا کتنا ناجائز مال پھیلا ہوا ہے۔ اسمگلنگ کے ذریعے جو کچھ باہر سے آتا تھا، وہ ان بڑی بڑی عظیم الشان فیکٹریوں کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانوں میں اسٹور ہو جاتا تھا اور ان فیکٹریوں کی طرف کوئی بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا چونکہ بڑی اچھی ساکھ تھی ان کی۔ پھر یہ مال بازار میں پھیل جاتا تھا۔ اس طرح کے نظام قائم کر رکھے تھے بابر علی صاحب نے اپنے چند دوستوں کی مدد سے کہ کوئی آنچ ان پر نہ آئے۔ بہت ہی چالاکی سے انہوں نے اپنا یہ کاروبار آگے بڑھا رکھا تھا۔ ایک طرف تو حکومت کی نگاہ میں ان کی شخصیت انتہائی ارفع و اعلا تھی اور وہ ایک انتہائی ایمان دار تاجر گردانے جاتے تھے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی تھا جو ابھی تک کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا۔ ان چند افراد کے جو اس سلسلے میں براہ راست ملوث تھے۔ وہ برے آدمی ضرور تھے۔ لیکن ان کی ذات میں ایک خاص بات تھی۔ وہ قتل و غارت گری اور خونریزی سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ اسمگلنگ ضرور کراتے تھے لیکن ان کے کارکنوں کو ان کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ دہشت گردی اور درندگی نہ کریں۔ اگر کبھی مال پکڑا جائے تو وہ جان بچا کر فرار ہو جائیں۔ پولیس پر ایک بھی فائر نہ کریں۔ یہ ان کی شرافت کی ایک اور مثال تھی۔

اپنی اولاد کے لیے بہت اچھے باپ تھے۔ بچپن سے حیدر علی صاحب سے ڈرتے تھے اور آج تک یہ قائم تھا۔ مجموعی طور پر وہ کیا تھے اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔

آج کل شہریار ان کے ذہن کی خلش بن گیا تھا۔ گھر میں وہ ایک حلیم الطبع بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بچوں کے معاملات میں مداخلت ضرور کرتے اور جائز ضروریات میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

شیری کون ہے۔ کیوں اس کوٹھی میں آ گھسا ہے۔ یہ بات بابر علی صاحب کے لیے پریشان کن تھی۔

وہ خوف زدہ تھے کہ کون ہے جو ان کی ٹوہ میں ہے۔ لیکن جب گہرائیوں پر نگاہ ڈالتے تو انہیں یہ لغو نظر آتی چونکہ گورنمنٹ کے اعلا ترین عہدیداران سے لے کر نچلے درجے تک کے تمام افراد ان سے متاثر تھے اور خود کو ان کا دوست سمجھتے تھے۔ پھر کون سا ایسا محکمہ تھا۔ جس نے اپنا ایک آدمی ان کے بیچ داخل کر دیا تھا۔ اگر یہ دشمن کسی انتظامی محکمے سے تعلق نہیں رکھتا تو پھر یہ کوئی جرائم پیشہ آدمی ہو سکتا ہے جو دولت کے حصول کے لیے یہاں آ گھسا ہے۔ لیکن اس نے ایک مضبوط شاخ پر قدم جمائے ہیں یعنی حیدر علی صاحب۔ جب تک وہ زندہ تھے، بابر علی صاحب کو یقین تھا کہ وہ کبھی اپنی بات ان کی بات سے اونچی نہ کر سکیں گے اور آج وہ اس شخص کے بارے میں بڑی گہرائی سے سوچ رہے تھے۔

شہریار۔۔۔ عرف شیری۔۔۔ اگر اس شخص کے ذہن میں کوئی خطرناک منصوبہ ہے تو اس سے ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ گھر کے لوگ تو ناتجربے کار اور احمق ہیں۔ ابو تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔ پھر یہ شخص کیا چکر چلا رہا ہے۔ گھر کے لوگوں کو مٹھی میں لے کر اس نے کیا جال پھیلا رکھا ہے۔

ایک بار تو ان کا دل چاہا کہ اس کا قصہ ہی پاک کرا دیں۔ اغوا کر کے کسی دوسرے ملک پہنچوا دیں اور ہدایت کر دیں اپنے آدمیوں کو کہ یہ شخص دوبارہ یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ اس احساس سے ہی خوف زدہ ہونے لگتے تھے۔ لیکن اب تو یہ شیری بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ بات اگر صرف حیدر علی صاحب کی تفریحات تک محدود رہتی تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس پریس کانفرنس نے بابر علی کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ شخص اتنی دور تک جا سکتا ہے اس بارے میں بابر علی صاحب نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"اپنا گھر" کی تعمیر کالونی والی زمین پر حیدر علی صاحب کا قبضہ یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جو بابر علی کسی طور برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں روپیہ خرچ ہوگا اور اس کے بعد خرچ ہوتا ہی رہے گا۔ بھلا ایک ایسا ادارہ جو غریبوں کی اعانت کے لیے بنایا گیا ہو، ذاتی بنیادوں پر کیسے چل سکتا ہے۔ حکومت سے اسے کیا مل جائے گا یا مخیر حضرات اسے کیا دے دیں گے۔ یہ ساری چیزیں تو دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ اخبارات میں خبریں اور تصاویر چھپوانے کے لیے اس قسم کے ڈرامے کیے جاتے ہیں۔ حقیقتیں تو کچھ اور ہی ہوتی ہیں اور ان حقیقتوں سے بابر علی صاحب جیسے شخص واقف نہ ہوتے تو اور کون ہوتے۔

گھر کے ایک ایک فرد پر شیری اس طرح چھایا

ہوا تھا کہ کوئی اس کے خلاف ایک لفظ سننے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بیگم بابر جیسی سنجیدہ خاتون، جو بہت کم کسی پر ایمان لاتی تھیں، اس کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی تھیں۔

بابر علی صاحب کو ان ساری باتوں کی بہت زیادہ پروا نہ تھی لیکن بس یہ احساس انہیں مارے دے رہا تھا کہ کہیں یہ نوجوان کوئی بہت گہری چال نہ چل رہا ہو۔

کافی دیر تک وہ سوچتے رہے پھر انہوں نے اس سلسلے میں حیدر علی صاحب سے ہی بات کرنا مناسب سمجھا اور وہاں سے اٹھ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔

اتفاق ہی کی بات تھی کہ شیری اس وقت حیدر علی صاحب کے پاس موجود نہیں تھا اور کہیں گیا ہوا تھا۔ چنانچہ حیدر علی صاحب انہیں تنہا مل گئے۔

''ابو! میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں کہو آؤ۔۔۔'' حیدر علی صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

''ابو آپ نے بڑی محنت سے یہ گھر تعمیر کیا ہے۔ بڑی مشقت کی گئی ہے اس کی بنیادوں میں، آپ ہی کی وجہ سے آج ہمارے باغ میں پھول ہی پھول نظر آ رہے تھے۔ میں اس بات کا معترف ہوں کہ ابو! آپ نے ہمیشہ مجھے ذہانت کے راستے دکھائے اور آپ ہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر آج میں اس مقام تک پہنچا ہوں۔ لیکن ابو کیا آپ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ گزرنے والا ہر لمحہ گزرے ہوئے ہر لمحے سے زیادہ ذہانت کا حامل ہوتا ہے۔ وقت انسان کو بہت سے تجربات دیتا ہے اور عمران تجربات کے لیے محدود ہوتی ہے۔''

''دیکھ بھائی! میں جاہل قسم کا آدمی ہوں۔ مجھ سے فلسفے کی زبان مت بول، جو کہنا ہے صاف صاف کہہ۔''

حیدر علی صاحب پھکڑ انداز میں بولے اور بابر علی صاحب جلدی سے سنبھل گئے۔ یہ زبان حیدر علی صاحب کے غصے کا احساس دلاتی ہے چنانچہ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

''ابو میں کالونی والی زمین کی بات کر رہا ہوں۔ اتنی قیمتی زمین ہے وہ اور اتنا بڑا پروجیکٹ ہے وہ میرا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔''

''پھر وہیں آ گئے تم۔۔۔ آخر کی مصیبت آ جائے گی تم پر اگر میں اس زمین کو استعمال کرا لوں تو۔۔۔''

''اوہو۔۔۔ نہیں ابو جان میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ آپ تو میرا جو کچھ موجود ہے، وہ سب استعمال کر ڈالیں تب بھی میری پیشانی پر شکن نہیں آئے گی۔ آخر یہ ہے کس کا دیا ہوا؟ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ پسند کریں تو میں کوئی دوسری جگہ اس کام کے لیے مختص کر دوں۔''

''ہاں، ہاں کر دو۔۔۔ کر دو۔۔۔ شہر سے تقریباً دو سو میل پرے۔ وہاں جہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہ مار سکے۔ تم کوئی جگہ ہمارے حوالے کر دو۔ ہم وہاں ''اپنا گھر'' بنا لیں گے لیکن وہاں تک پہنچنے والوں کے لیے شہر ہی سے طبی امداد فراہم کرنا ہو گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔''

''نہیں۔۔۔ نہیں ابو۔۔۔ اتنی دور نہیں۔۔۔ بس یہیں کہیں مناسب جگہ، آپ اس کے لیے مجھے موقع تو دیں۔''

''دیکھو بھائی جو کچھ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اس پر میں اٹل ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات کرنا ہو تو میں حاضر ہوں۔''

''آخر آپ اس احمقانہ کام کو کر کے کیا حاصل کر لیں گے ابو!''

''کیا مطلب۔۔۔ ہوش درست ہیں تمہارے۔'' حیدر علی غرائے۔

''نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے ابو! آپ کو یہ تمام راستے اسی شیری نے دکھائے ہیں نا۔ ابو ایک بار پھر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ

...پر نظر ثانی کر لیں۔''

''...شیری پر۔۔۔''

''جی۔۔۔ جی اس کی بات کر رہا ہوں۔''

''اگر شیری پر مجھے نظر ثانی کرنی پڑی بیٹا تو اس ...پہلے میں تم پر نظر ثانی کرنا پسند کروں گا اور میں یہ ...کروں گا کہ میری تربیت میں کہاں خامی رہ گئی تھی ...ہمارے اندر یہ فطرت پیدا ہو گئی۔''

بابر علی صاحب ایک لمحے کے لیے جھلا گئے ...باپ کے سامنے تھے۔ جانتے تھے کہ آج بھی ...علی صاحب کے بدن میں بڑی جان ہے اور آج ...بھی انہیں اپنے ذہن پر قابو پانا اسی طرح مشکل ہو گا ...طرح بابر علی صاحب کے بچپن میں۔ جوتا ...یں گے اور پل پڑیں گے اور اس کے بعد تماشا ...کے قابل ہو گا۔ اس لیے خود کو سنبھال کر ...لے۔

''بڑا سرمایہ خرچ ہو گا ابو! آپ کا ہو یا میرا۔ ...صورت ہم الگ تو نہیں ہے، آپ کو اس سے ملے ...گا؟ چند روز کے بعد پریشان ہو جائیں گے۔ ...ے بھوکے ننگے آپ کو گھیر لیں گے۔ آپ اس ...کے بارے میں نہیں جانتے۔ محنت کرنے کے ...ے یہ ہاتھ پھیلانا پسند کرتی ہے۔ شہر میں لاکھوں ...ایسے مناظر آپ کو دیکھنے کو ملیں گے کہ ہٹے کٹے ...تندرست لوگ کسی بھی ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوں ...یا بیٹھے ہوں گے کہ کوئی آئے اور انہیں محتاج سمجھ ...کر کھانا کھلا دے۔ یہ ہے فطرت ہماری اس قوم کی۔ ...ک کام کے بجائے آپ کے اس ''اپنا گھر'' کو ...گھیر لیں گے۔ آپ کی زندگی عذاب ہو جائے گی۔

''ٹھیک ہے بھائی! میں انہی بھوکوں ننگوں کے درمیان زندہ رہنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ اگر میں تمہاری کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ اپنا گھر اس کالونی والی زمین پر تعمیر ہو گا۔ اس میں تم کوئی رخنہ مت ڈالو۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے وسائل سے کام لے کر میرا نقشہ جلد از جلد پاس کرا دو اور ہاں ایک بات سن لو میں یہ بھی اندازہ کر چکا ہوں کہ تم اس کے مخالف ہو۔ نقشہ پاس کرانے کے سلسلے میں تم تساہل ہی سے کام نہیں لو گے بلکہ اس کی مخالفت بھی کرو گے۔ تو سنو میرے بیٹے، میرے بچے! یہ نقشہ جلد ہی پاس ہو جانا چاہیے، ہر قیمت پر۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے کاموں میں کوئی پیچ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو تم جیسے لوگ اسے دور کر لیتے ہیں سمجھے۔ نقشہ پاس کرا کے اسے جلد سے جلد میرے حوالے کر دو۔ میں نقشہ بنانے کے لیے دے چکا ہوں۔'' حیدر علی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''جی ابو!'' بابر علی صاحب ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ بولے۔ اب کوئی ترکیب نہیں رہ گئی تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کڑوے گھونٹ کو پی لیا جائے۔ لیکن یہ کڑوا گھونٹ اگر یہیں تک محدود رہتا تو ٹھیک تھا لیکن شہریار نہ جانے اور کیا کیا سوچ رہا تھا۔ وہ بس اسی کے لیے پریشان تھے۔ ابو کے پاس سے بالکل ناکام اور مایوس ہو کر اٹھے تھے اور اب ان کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

بہت کم وقت ایسے ہوتے تھے جب بابر علی صاحب کو باہر کے کاموں سے فرصت ہو اور وہ گھر میں وقت گزاریں۔ گھر والے ان کی غیر حاضری کے عادی ہو گئے تھے اور اب گھر میں کوئی تقریب ہو یا کوئی بھی ایسی تفریح جس میں سارا گھر حصہ لے رہا ہو، بابر علی صاحب کی کمی کو محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ خود بیگم بابر علی بارہا اس سلسلے میں بابر علی سے شکایتیں کر چکی تھیں۔ لیکن وہ اپنی مصروفیات کا بہانہ کر دیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اب اس کی عادی نہیں رہی تھیں۔ جن دنوں بابر علی گھر میں رہتے ان سب کو حیرت ہوتی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ الجھن سی محسوس کرتے تھے سب کے سب۔ حالانکہ بیٹے اور بیٹیاں باپ سے محبت کرتے تھے لیکن بس ایک عادت بن چکی تھی ان کی۔

ان دنوں بابر علی گھر پر وقت گزار رہے تھے۔ شاید کوئی مصروفیات نہیں تھی ان کی یا پھر تھک گئے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے یا پھر کوئی تیسری بات جو

ان کے ذہن کی گہرائیوں میں ہی پوشیدہ ہوسکتی تھی یہ ہوگی کہ اس دوران وہ شیری کی نگرانی کررہے تھے۔ وہ اس شخص کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اور اس بات کو معلوم کرنے کے خواہش مند تھے کہ اس کی آمد کی وجہ کیا ہے یا اس کی مقبولیت کا کیا راز ہے۔ اکثر وہ کوٹھی کے مختلف حصوں میں نکل جاتے تھے

اس وقت بھی وہ ٹہلتے ہوئے اوپری منزل پر اس جگہ آگئے جہاں نفیسہ نے اپنا نگار خانہ بنایا ہوا تھا۔

نگار خانے کا وسیع و عریض ہال گوناں گوں تصویروں سے سجا ہوا تھا لیکن یہ تصویریں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر بابر علی صاحب سر پیٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ بڑے بڑے مصوروں کی تجریدی پینٹنگز جو دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ تجرید آج تک دوسروں کی طرح ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ لیکن جدید رجحان اسی سمت تھا۔ ایک دوبار انہیں ایسی نمائشوں میں مدعو کیا گیا تھا جو کسی بڑے مصور کی تصویروں کی تھیں اور وہاں بابر علی صاحب یہی سوچتے رہ جاتے تھے کہ آرٹ گیلری میں لگی ان تصویروں کا مقصد کیا ہے۔ ایک دوبار انہیں اس سلسلے میں مہمان خصوصی بنانے کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"بھئی میں کسی ایسی تقریب کا مہمان خصوصی کیسے بن سکتا ہوں جو میری سمجھ ہی سے باہر ہو۔ اگر تم لوگ مجھ سے ان تصویروں کے بارے میں کچھ کہلوانا چاہو گے تو یقین کرو میں بھی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کروں گا کہ ان تصویروں کی اہمیت ہی ختم ہوجائے گی۔"

لیکن اب یہ مرض ان کے گھر تک پہنچ چکا تھا۔ سامنے ہی انہوں نے اس نوجوان مصور کو دیکھا جو شکل وصورت سے اچھا خاصا اور شریف نظر آتا تھا۔ وہ عقب میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے عین سامنے نفیسہ ایک کینوس بورڈ پر ایک تصویر بنارہی تھی۔ غالباً وہ اس تصویر کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔

بابر علی صاحب جب اندر داخل ہوئے نوجوان مصور اٹھ کھڑا ہوا۔ بابر علی صاحب کو اس سلام کیا تھا اور بابر علی صاحب نے شرافت سے اس جواب بھی دیا تھا لیکن اس کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئے اور نفیسہ کے قریب پہنچ گئے۔ نفیسہ باپ کو دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"آیئے ابو، زہے نصیب کہ آپ نے آج ہمارے اس نگار خانے کا رخ کیا۔"

"ہاں بھئی دیکھنا چاہتا تھا میں کہ تم نے جس زوروشور سے جو کام شروع کیا ہے، اس کی کیفیت کیا ہے؟"

"تو دیکھ لیجیے ابو! استاد صاحب کا کہنا ہے کہ میں قدرتی فن کار ہوں۔"

"سبحان اللہ سبحان اللہ، استاد صاحب یہ نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا۔" بابر علی صاحب طنزیہ انداز میں بولے۔

"دیکھیے ابو! میں نے یہ تصویر مکمل کرلی ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ میری پہلی مکمل تصویر ہے۔ اب میں لائنوں کی دنیا سے نکل آئی ہوں۔"

"ٹھیک، ٹھیک۔ تو یہ تصویر ہے۔" بابر علی صاحب رنگوں کے اس ملغوبے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی ابو! ذرا بتایئے تو سہی یہ کیا ہے۔" نفیسہ نے پوچھا۔

"میں تو اسے اپنی تقدیر سمجھتا ہوں۔" بابر علی صاحب نے کہا۔

"جی میں سمجھی نہیں ابو!"

"ہاں۔۔۔ ہاں بھئی تصویر اور تقدیر میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ یہ تصویر کی خرابی ہے یا میری تقدیر کی خرابی کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"اوہ ابو! میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔ براہ کرم اس طرف آیئے۔" نفیسہ نے کہا۔

"بھئی بدلتے ہوئے ادوار ہیں یہ۔ کل کی مصوری خود بخود سمجھ میں آتی تھی۔ کسی بھی تصویر کو دیکھ

پتا چل جاتا تھا کہ مصور کا ذہن کس طرف چل پڑا اور آج کی تصویر کے لیے مصور کو سمجھانے کی ضرورت پیش آتی ہے اگر وہ کسی کو نہ سمجھائے تو خدا کی قسم کوئی کچھ نہ سمجھے۔" بابر علی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولے۔

"سمجھاؤ بھئی سمجھاؤ، یہ کیا ہے۔"

"یہ سراب ہے ابو۔" نفیسہ نے کہا۔

"س والا یا ش والا؟" بابر علی بولے۔

"سراب۔۔۔ سراب۔۔۔ دھوکا۔۔۔ فریب"

"خوب۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ میں نے مان لیا۔ فنِ مصوری کے لیے تجربہ سب سے بڑا دھوکا ہے۔" بابر علی صاحب بولے۔

"ابو! آپ استاد صاحب کے سامنے یہ بات کررہے ہیں۔ ہمارے استاد ایک عظیم مصور ہیں۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔ واقعی میں ان کی عظمت اس کینوس پر دیکھ رہا ہوں۔" بابر علی صاحب طنزیہ انداز میں عاقل کی جانب مڑ کر بولے۔ عاقل خاموش کھڑا تھا۔

بہت ہی حساس نوجوان تھا۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے لیتا تھا۔ بابر علی صاحب کی طنزیہ گفتگو اسے اپنے سینے پر نشتر کی مانند محسوس ہورہی تھی۔

"کیوں نوجوان مصور کیا سکھا رہے ہو اس بچی کو؟" انہوں نے سوال کیا۔

"غالب خود بھی اپنے کسی شعر کی تشریح نہ کرسکے۔ شاعر شعر کہہ دیتا ہے اور اسے سمجھنے والا صحیح معنوں میں اس کا قدردان ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کے بارے میں اگر کسی سے پوچھا جاتا تو وہ بہادر شاہ ظفر یا استاد ذوق تھے جو اس شاعر کی روح میں اتر سکتے تھے۔" دروازے سے آواز آئی اور بابر علی صاحب چونک کر پلٹے۔ شیری مسکراتا ہوا اندر آرہا تھا۔۔۔ بابر علی صاحب کے ہونٹ بھینچ گئے۔ انہوں نے سوال کیا۔

"آپ کی آمد کا مقصد۔۔۔؟"

"سراب کی دوغائی۔" شیری نے فوراً گردن خم کرکے جواب دیا۔

"لیکن میں آپ سے اس کا خواہش مند نہیں ہوں۔" بابر علی صاحب بھنا کر بولے۔

"میں نے عرض کیا نا کہ غالب کے شعر کا صحیح حسن استاد ذوق کی نگاہ میں دیکھا جائے۔ دیکھیے یہ سراب ہے۔ رنگوں کی اپنی زبان اپنی کہانی ہوتی ہے۔ پرانے دور کے عکاس ان رنگوں کو دوسرں درجے کی چیز سمجھتے تھے اور انہیں صرف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ تصویر خوشنما معلوم ہو۔ جب سے رنگوں کی زبان سمجھی گئی۔ لائنیں بے مقصد ہوکر رہ گئیں۔ ہر رنگ اپنی زبان خود رکھتا ہے۔ اپنی کہانی خود کہتا ہے۔ یہ زرد رنگ نفرت اور مایوسی کا علمبردار ہے۔ سرخ رنگ میں تیزی اور شدت پائی جاتی ہے۔ نیلا رنگ امن پسندی اور مسکراہٹوں کا امین ہے۔ سبز رنگ میں نرمی اور بزرگی پائی جاتی ہے۔ سو جناب محترم! ہر رنگ کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور پھر ان مخصوص لائنوں سے ہٹ کر زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں کو برش کی مدد سے نمایاں کیا گیا ہے جن پر چلتے ہوئے انسان اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ ان راستوں سے اپنی منزل کا تعین کرتا ہے حالانکہ یہ راستے اس قدر ناہموار ہوتے ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان ناہموار راستوں کے جال میں انسان بھٹک تو سکتا ہے منزل کبھی نہیں پاسکتا۔ یہ رنگ اس کے عکاس ہیں کہ انسان خود کو سمجھ لے، نیلے رنگ کی کشادگی اپنائے۔ سرخ رنگ کی تیزی سے بچے۔ اس تصویر کے ہر پیچ وخم میں نصیحتیں پنہاں ہیں۔ بس اس کی ضرورت ہے کہ انسان انہیں سمجھ لے اور اپنے راستے بدلنے کی کوشش کرے۔ یہ تمام راستے سراب ہیں۔ ایک دھوکا ایک فریب جو کبھی منزل کو سامنے نہیں لاتے۔ بلکہ انسان کو بھٹکا کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔"

شیری اپنی ترنگ میں بولے جارہا تھا۔ عاقل اور نفیسہ حیرت سے منہ پھاڑے شیری کو دیکھ رہے تھے۔ جو کچھ شیری نے کہا تھا وہ ایسا دل کو لگتا تھا کہ بس

اس سے آگے اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ عاقل کے وہم و گمان میں بھی یہ تشریح نہ تھی۔ وہ بے چارہ مصور تھا ہی کب۔ وہ تو شیری نے کھینچ کھانچ کر اسے مصور بنا دیا تھا اور شیری ہی کے کہنے پر وہ نفیسہ کو الٹی سیدھی تصویریں بنانا سکھا رہا تھا۔

جہاں تک نفیسہ کا تعلق تھا، اس نے بھی اس تصویر کی اسکیچنگ پر یہ غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب جو اس نے اس تصویر کو دیکھا تو درحقیقت شیری کی باتیں اسے بالکل سچ نظر آئیں۔

دوسری طرف بابر علی صاحب بھی شیری کو گہری نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ نجانے ان کے ذہن میں کیا تھا۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بھئی واقعی، تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں شیریں! میں نے اس انداز میں اس تصویر کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس سے ایک اندازہ مجھے اور ہوا ہے۔''

''وہ کیا جناب۔۔'' شیری نے پوچھا

''یہ کہ تم مصوری پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہو۔ کبھی کرتے رہے ہو مصوری؟''

''نہیں جناب! میں نے بس فن پاروں کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاعروں کے اشعار کی گہرائیوں پر غور کیا ہے۔ ادیبوں کی نثر پر توجہ دی ہے۔ مصوروں کی فطرت کو میں نے پڑھا ہے اور اس سے مجھے ان سب کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں ہر معاملے میں تھوڑی بہت شد بد رکھتا ہوں۔'' شیری نے جواب دیا۔

''بھئی تم سے کچھ گفتگو کرنی ہے مجھے بھی۔'' بابر علی صاحب نے کہا۔

''حاضر ہوں جناب! خادم ہوں آپ سب کا، جب بھی حکم فرمائیں۔''

''فرصت کس وقت ہے تمہیں؟'' بابر علی صاحب بولے۔

''میں نے عرض کیا نا میں تو حکم کا غلام ہوں۔ جب حکم دیں حاضر ہو جاؤں۔''

''تو پھر آج دوپہر کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں نشست رہے گی۔''

''تنہا میں ہی ہوں گا یا۔۔۔؟''

''نہیں بھئی صرف تم۔۔۔ بات تم ہی سے کرنی ہے۔'' بابر علی صاحب نے کہا اور شیری نے سر تسلیم خم کر دیا۔ بابر علی صاحب باہر نکل گئے تو نفیسہ شیری کی طرف متوجہ ہوئی وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے شیری کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''شیری بھائی! آج آپ نے لاج رکھ لی میری۔ میں اتنی تفصیل سے ابو کو یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی جو آپ نے بتایا اور اس کا ذمہ دار میں اپنے استاد صاحب کو قرار دوں گی۔''

''وہ کیوں۔'' شیری نے پوچھا

''اس لیے کہ استاد صاحب نے اس تصویر کی اسکیچنگ تو کر دی تھی لیکن مجھے اس کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ آپ ان سے میری سفارش کر دیجیے کہ آئندہ جب بھی یہ مجھ سے کسی چیز کی اسکیچنگ کرائیں تو مجھے اس کے ہر پہلو سے آگاہ کر دیں۔''

''ہاں بھئی، اتنی سفارش تو میں آپ سے ضرور کروں گا عاقل صاحب۔'' شیری نے کہا اور عاقل بے چارہ مشینی انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے کیا بنوایا ہے اور کیا بن گیا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد شیری، بابر علی صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تنہا تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''آؤ۔۔۔'' انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ ذہن میں تو شیری کے لیے سخت نفرت تھی۔ اس کی چرب زبانی کو دیکھ چکے تھے۔ تصویر کے معاملے کو اس نے جس خوبی سے سنبھال لیا تھا۔ بابر علی صاحب کی جہاندیدہ نگاہیں اسے سمجھ چکی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ نوجوان آفت کا پرکالہ ہے اور اس سے جیتنا خاصا مشکل کام ہوگا۔

بہر طور جہاندیدہ انسان تھے، سمجھ دار تھے زیرک تھے اور اپنے کاروباری مخالفین کو کاروباری محاذوں سے شکست دیتے آئے تھے۔ اس لیے اس نوجوان سے ہار تو نہیں مان سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پینترا بدل لیا تھا۔ شیری کو بیٹھنے کی پیشکش کی تو وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

''میں تم سے تمہارے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بس یہی ایک پہلو ہے دنیا کا جو میری نگاہوں سے تاریک ہے۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا جناب کہ زیر بحث بنوں۔ جب میں خود ہی اپنی ذات کی شناخت نہیں کر سکا تو دوسروں کو اس کے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''دیکھو بیٹے! میں زندگی کا طویل عرصہ گزار چکا ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ بہت سے لوگوں سے میرا سابقہ پڑا ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ کون شخص کس انداز میں کس وقت بول رہا ہے۔ تم خود کو چھپانے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہے اور میں اس کوشش کو مشکوک سمجھتا ہوں۔''

''شاید ایسا ہو۔'' شیری نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن یہ بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں شیری کہ بہرطور یہ میری مملکت ہے۔ انسان اپنے گھر کی چار دیواری کو اپنی مملکت سمجھتا ہے۔ یہاں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو مجھ سے منحرف ہو سکتی ہے اور وہ ہیں حیدر علی صاحب۔۔۔ اور میں تمہیں داد دیتا ہوں تم نے وہیں سے ابتدا کی ہے۔ یہ کسی معمولی آدمی کا کام نہیں لیکن تم یہاں جو کچھ کر رہے ہو یا کرنا چاہتے ہو۔ بہر طور کسی نہ کسی دن وہ میرے علم میں ضرور آئے گا اور اس وقت جب مجھے یا اس کوٹھی میں رہنے والوں کو کسی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا تو میں ویٹو پاور بھی استعمال کر سکتا ہوں کیونکہ یہ میری مملکت ہے۔ تم جانتے ہو اس وقت تمہارا کیا بنے گا؟''

''جانتا ہوں جناب والا! درحقیقت اس وقت میری پوزیشن انتہائی ہی نازک ہو جائے گی اور میں کوئی پناہ گاہ نہ حاصل کر سکوں گا لیکن یہ اس وقت ممکن ہوگا نا جب میں اس کوٹھی کے لیے یا اس کوٹھی کے مکینوں کے لیے کوئی غلط کام کروں گا۔ اگر ایسا سرے ہی سے نہ ہو تو پھر آپ کو میری مخالفت کا سودا کیوں سمانے لگا۔'' شیری نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم ان خوبصورت باتوں سے دلوں کو موہ لینے کی قوت رکھتے ہو۔ لیکن میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میری نگاہ میں تمہاری شخصیت مشکوک ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمہیں پیار کرنے لگوں تو پھر یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔

''میں نے عرض کیا نا، میں ایک سادہ سا ورق ہوں جس پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ ملازمت چاہتا تھا، سو اس گھر میں آ گیا۔ یہاں کے لوگوں کی خدمت کی۔ انہوں نے مجھے اپنا لیا۔ آپ کے ذہن میں جو شکوک و شبہات ہیں آنے والا وقت یقیناً انہیں زائل کر دے گا اور میں اپنے تقدیر میں اس روشنی کا انتظار کروں گا ورنہ یہاں پر باقی لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' شیری نے جواب دیا۔

''تو تم کچھ نہ بتاؤ گے اپنے بارے میں۔''

''میں نے عرض کیا نا۔ اگر کچھ ہوتا تو ضرور بتاتا۔ آنے والے وقت میں بھی اگر میری زندگی میں کوئی ایسی چیز شامل ہوئی جو کسی کو بتائی جا سکے تو میں آپ کے سامنے عرض کر دوں گا۔''

''ہوں۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی ذہانت بھی آزمانی ہو گی تمہارے سلسلے میں بہر طور تم اس گھر میں ایک فرد کی حیثیت سے رہتے ہو۔ کیا تم مجھے اس گھر کا بڑا تسلیم نہیں کرتے۔''

''یقیناً کرتا ہوں جناب والا۔'' شیری نے جواب دیا۔

''تو پھر میرا ابھی کچھ حق بنتا ہے تم پر۔''

''بسر و چشم، بسر و چشم۔''

''میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔''

''حکم فرمائیے۔۔۔ بندہ حاضر ہے۔'' شیری

سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

”کسی بھی طرح ابو کو ”اپنا گھر“ کی تعمیر سے روک دو۔“ بابر علی صاحب نے کہا اور شیری کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے رنگ آیا لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل گیا۔

”دیکھیے جناب! انسان کی زندگی میں دو روٹیاں یا بدن کا کپڑا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ضمیر کے لیے بھی زندہ رہتے ہیں۔ اپنا گھر کے اغراض و مقاصد میری اپنی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مجھ جیسے بے سہارا نوجوان جو میری طرح خوش نصیب نہیں ہوتے اور انہیں ایسے کسی اچھے خاندان میں جگہ نہیں ملتی، زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار ہو کر سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ مجھے ان کا کرب معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ سب پہلی امداد کے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر انہیں بس اتنا سہارا دے کہ وہ اس وقتی کرب سے نجات حاصل کر کے معاشرے میں اپنا کوئی مقام حاصل کر لیں تو آپ یقین جانیے کہ وہ معاشرے کے بہترین افراد ثابت ہو سکتے ہیں۔ بصورت دیگر ان کی مالی پریشانیاں ذہنی الجھنیں انہیں برائی کے راستے پر لے جاتی ہیں۔ وہ چور، قاتل، ڈاکو، خونی، اسمگلر، جیب کترے، بلیک میلر نجانے کیا کیا بن جاتے ہیں۔ یہ تو ایک قومی خدمت ہے جناب! جس کا حکم دین بھی دیتا ہے اور دنیا بھی۔ میں وطن پرست ہوں، یہ میرا وطن ہے۔ میرے وطن کے سربرآوردہ لوگ اگر میرے انداز میں نہیں سوچتے تو جو شخصیت میری سامنے اس انداز میں سوچتی ہوئی سامنے آئے، میں بھلا اس کی مخالفت کیسے کر سکتا ہوں۔“ شیری نے جواب دیا۔

”شیری میں بہت غلط آدمی ہوں۔ چرب زبانی کسی بھی طور قابل قبول نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ”اپنا گھر“ تعمیر نہ ہو اور تمہیں اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہوگی۔

”نہیں بابر علی صاحب! آپ اس بات کو ذہن سے کھرچ دیں کہ میں اس سلسلے میں آپ کا معاون ہو سکتا ہوں بلکہ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں دادا ابو کو آپ کے اس جذبے سے آگاہ کروں۔“

”کک۔۔۔ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ بابر علی صاحب بوکھلائے ہوئے انداز میں بولے۔

”فرض۔۔۔ فرض ہے۔ ”اپنا گھر“ ابھی تعمیر بھی نہیں ہوا اور اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ میں اس سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں اس مخالفت کی اطلاع دادا ابو کو دوں۔“ شیری کھڑا ہو کر بولا۔

”اگر تم نے ایسا کیا تو یہ نمک حرامی ہوگی۔ تم ہمارے درمیان تفرقے کا باعث بنو گے۔“

”تو پھر آپ وعدہ کریں کہ اپنا گھر کی مخالفت نہیں کریں گے۔“ شیری نے کہا اور بابر علی صاحب اسے گھورنے لگے۔ پھر بولے۔

”تمہاری تعلیمی حیثیت کیا ہے۔“

”بس ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔“

”میں تمہیں اپنی ایک فرم میں ایک بڑا عہدہ پیش کروں تو اسے قبول کرو گے۔“

”اپنا گھر“ کے عوض سارے جہان کے عہدے ٹھکرا دوں گا۔ یہ میرا عزم ہے۔“ شیری نے جواب دیا اور بابر علی صاحب دانت پیسنے لگے پھر گردن ہلا کر بولے۔

”تم لوگوں کے لیے یہ ادارہ مصیبت بن جائے گا۔ اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکو گے اور ہزاروں کی مخالفتیں مول لے لو گے۔ لوگ طرح طرح کے الزامات رکھیں گے تم پر۔ دیکھ لینا، میری بات کو گرہ میں باندھ لینا، بعد میں پچھتاؤ گے۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں۔“ شیری نے کہا اور پھر باہر نکل گیا۔ بابر علی گہری گہری سانسیں لیتے رہے۔ انہیں شدید غصہ آ رہا تھا شیری پر لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ معتدل ہو گئے۔ وہ اس کی شخصیت پر غور کرنے لگے تھے۔ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا مجھ سے۔ اس کی فطرت میں ملازموں جیسی کوئی

بات ہی نہیں ہے۔ کون ہے یہ، آخر کون ہے۔

صفدر بابر علی بی اے کے آخری سال میں تھا۔ سیدھا سادا شریف سا نوجوان نئی نئی جوانی آئی تھی اور وہ اس کی جاذبیت سے آشنا نہیں تھا۔ امنگوں بھرا دل تھا، کو ابھی غلط راستوں کی جانب مائل نہیں ہوا تھا۔ لیکن کئی شوق ذہن میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ اسے موسیقی سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت سی ڈی پلیئر اس نے اپنے کمرے میں رکھا ہوا تھا اور مغربی موسیقی کی بے شمار سی ڈیز اس کے پاس موجود تھیں۔ رقص سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ لیکن بابر علی صاحب سخت آدمی تھے۔ ایسے کسی شوق کو بے مہار نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ البتہ جب بھی تنہائی ہوتی تو دھیمے سروں میں سی ڈی لگا کر رقص کی مشق کیا کرتا تھا اور اس وقت بھی یہی صورتحال تھی۔ کمرے کے قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور ایک خوبصورت گانوں کی سی ڈی دھیمے سروں میں لگا دی۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں قالین پر رقص کرنے لگا۔ اچھے خاصے اسٹیپس تھے حالانکہ کسی سے کبھی سیکھا نہیں تھا۔ گانے کی دھنیں اسے مست کر رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد وہ ماحول کو بھول گیا۔

اس کا بدن تھرک رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے کون داخل ہوا۔ سی ڈی کے ختم ہونے تک اسے احساس نہ ہو سکا۔ پھر جب سی ڈی ختم ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلیں تو اپنے سامنے کسی کو پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن جب اس شکل پر نگاہ پڑی تو خوف کا احساس دل سے نکل گیا۔ یہ ایک انتہائی قابل اعتماد صورت تھی۔ شیری متحیرانہ انداز میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

صفدر جھینپے ہوئے انداز میں ہنس پڑا۔ اور بولا۔

”مجھے شوق ہے شیری بھائی!“

”شیری کو بے وقوف بنا رہے ہو۔“

”کیوں۔۔“ صفدر تعجب سے بولا۔

”کتنا پرانا ہے یہ شوق؟“

”کافی پرانا۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”رقص کس سے سیکھا؟“

”سیکھا ہی کہاں ہے۔ بس موسیقی خود بخود تھرکا دیتی ہے۔“

”کیا میں ناقابل اعتبار ہوں صفدر!“ شیری اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔ مگر میں سمجھ نہیں سکا۔“

”تمہارے رقص کا انداز ناتجربے کارانہ نہیں تھا۔“

”ارے نہیں شیری بھائی!“

”شیری کی معلومات کو چیلنج کر رہے ہو۔“

”اس کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔“

”ایک ایک قدم لاجواب تھا تمہارا۔“

”خدا کی قسم کسی سے نہیں سیکھا۔“

”تب پھر ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے۔ تم پیدائشی فن کار ہو۔“

”شیری بھائی۔۔۔ کیوں گھس رہے ہیں۔“

”تم لوگوں سے اتنا مخلص ہوں کہ کسی کو گھس ہی نہیں سکتا۔ اس گھر میں ایک بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔“

”کس بات کا۔“ صفدر نے کرسی گھسیٹ کر شیری کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ایسے ایسے ناتراشیدہ ہیرے پڑے ہیں اس گھر میں کہ اگر ان کی تراش خراش ہو جائے تو دنیا ان کی چمک دیکھ کر دنگ رہ جائے۔ مجھے انتہائی دکھ ہے صفدر! یقین کرو تم لوگ بے مثال ہو ایسے کہ جو اپنی اصلی شکل میں سامنے آ جائیں تو نجانے کیا ہو جائے۔ تمہارا یہ رقص۔۔۔ خدا کی پناہ۔۔۔ اگر یہ کسی اسٹیج پر ہوتا تو یقین کرو، تمہیں نجانے کہاں سے کہاں لے جاتا۔“

صفدر اب سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ شیری کی سنجیدگی دیکھ کر اب اسے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ وہ واقعی پیدائشی فن کار ہے۔

"لیکن شیری بھائی! ہم اپنی اس بدنصیبی کا کیا کریں کہ ایک دقیانوسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابو گھر کی فضا کو قبرستان کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنجیدہ سنجیدہ سا ماحول، نہ کو ہنس سکے نہ بول سکے۔ نہ زندگی کی دوسری تفریحات میں حصہ لے سکے۔ تمام چیزیں اخلاق کی بندشوں میں آتی ہیں۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ اپنے کسی شوق کی تکمیل نہ کرو۔ صرف وہ کرو جو بابر علی صاحب کو پسند ہے۔"

"ہاں! مجھے اس کا احساس ہے۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتادوں کہ فن کار قدرتی طور پر فن کار ہوتا ہے اس کے فن کی حیات کو جتنا دباؤ گے وہ اتنا ہی ابھریں گی اور بابر علی صاحب اس بات سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن وہ فن کار کو دبا نہیں سکتے۔"

"مم۔۔۔ مگر میں کیا کروں شیری بھائی!"

"دیکھو دوست! زندگی ایک مختصر سی چیز ہے۔ خواہشات اگر ذہن میں پیدا ہوں تو بلاشبہ وہ فطری ہیں۔ بلاشبہ کچھ خواہشات سفلی بھی ہوتی ہیں لیکن گندگی اور غلاظت باآسانی عیاں ہوجاتی ہے اور جس چیز سے ذہن میں کراہت نہ پیدا ہو اور وہ ذہن کی گہرائیوں میں جنم لے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ ایک جائز خواہش ہے اور جائز خواہشات کو پروان چڑھانے کے لیے تھوڑی سی سرکشی تھوڑی سی بغاوت ضروری ہوتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا شیری بھائی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔ اگر فن سے شوق ہے تو اسے اپناؤ۔ موسیقی کا تعلق روح سے ہوتا ہے اور اگر روح کو قتل کرو گے تو باقی کیا رہ جائے گا۔"

"میں کب اسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔" صفدر کراہ کر بولا۔

"تم اور صرف تم اس کے قاتل بنو گے میری بات کو یاد رکھنا۔ آڈرے ایبرن کی داستان حیات معلوم ہے تمہیں۔"

"نہیں لیکن اس کے ریکارڈ موجود ہیں میرے پاس۔"

"پریسلے کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"صرف ایک بات کہ کسی نے اسے زندگی میں سیدھا کھڑے نہیں دیکھا۔ شاید وہ سوتے میں بھی تھرکتا رہتا تھا۔"

"کتنا بڑا فن کار تھا۔ یہ معلوم ہے؟"

"دنیا جانتی ہے۔"

"راک شائن، سوان بک اور ایسے ہی دوسرے، یہ لوگ فطرتاً فن کار تھے۔ فن نے انہیں زندہ جاوید کردیا۔ موسیقی کے قدردان ان کی پوجا کرتے ہیں ہمارے ہاں کی غلط اقدار نے بے شمار فن کار ذبح کیے ہیں۔ مجھے فنکار کی موت کا بہت دکھ ہے صفدر! تم کسی طور آڈرے ایبرن، ایلوس پریسلے، راک شائن اور سوان بک سے کم نہیں ہو۔"

"شیری بھائی۔۔۔! شیری بھائی۔۔۔! آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن۔۔۔ لیکن میں کیا کروں؟"

"فن کی حیات چاہتے ہو تو اسیر بنو۔"

"کک۔۔۔ کس طرح۔"

"اس فن کو سیکھو، اسے چلا دو۔ کھلے عام اس کا پرچار کرو لیکن خوف کے عالم میں نہیں ہمت سے، دلیری سے۔۔۔"

"شیری بھائی۔۔۔ شیری بھائی! آپ میری مدد کریں۔ خدا کے لیے آپ میری مدد کریں۔" صفدر کا سانس پھولنے لگا۔

"شیو بناتے ہو؟"

"ایں۔۔۔" صفدر اس بے تکے سوال پر چونک پڑا۔ پھر بولا۔

"ہاں بناتا ہوں۔"

"آج سے چھوڑ دو۔ داڑھی اور سر کے بال بڑھاؤ۔ آج سے ان میں نہ تیل پڑے نہ کنگھی ہو۔ شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ سوان بک نے تمہاری شکل میں نیا جنم لیا ہے۔ اس قدر مشابہہ ہو تم اس سے کہ کینیڈا کی لڑکیاں تمہیں دیکھ کر پاگل ہوجائیں۔ دنیا بھر کی ڈیڑھ لاکھ لڑکیاں سوان بک

...ش کرتی تھیں اور اس کی موت پر اپنا ذہنی توازن ...بیٹھی تھیں۔

صفدر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے شیری کے ...ؤں پکڑ لیے۔

"شیری بھائی۔۔۔ شیری بھائی! آپ کی مدد کے بغیر میں کچھ نہ کرسکوں گا۔ میری رہنمائی کیجیے ...ری بھائی۔ میں اپنے فن کی بلندیوں کو پانا چاہتا ...وں۔ میں روح کی آسودگی چاہتا ہوں۔ مجھے میری ...زل دکھادیں شیری بھائی۔۔۔! میں آپ کا یہ ...سان۔۔۔"

"جذباتی نہ بنو صفدر! دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ...ی نے کسی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ انسان نے ہمت ...ور لگن سے اپنی منزل پائی ہے۔ اگر تم مجھ سے کچھ ...ہتے ہو تو صرف میرے مشوروں پر عمل کرو۔"

"میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔"

"ہمت ہے۔" شیری نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ کچھ بھی ہوجائے۔ میں سنگر بنوں ...۔ میں رقاص بنوں گا۔" صفدر نے کہا۔

"تو ابتدا کرو۔"

"کس طرح۔"

"میں تمہیں اس فن پر لٹریچر فراہم کروں گا۔ ان ...ظیم لوگوں کی تصاویر حاصل کروں گا کہیں نہ کہیں ...ے یہاں سے نہ ملیں تو باہر سے منگواؤں گا، تم آغاز کرو۔ کل سے شیو نہیں بنے گی۔ بال نہیں کٹیں گے۔ ...اس کے ڈیزائن میں تمہیں فراہم کردوں گا، سلواؤ ...گے تم خود۔ سب سے پہلے اپنا حلیہ وہ بناؤ جو تم ہو۔"

"او کے۔ میں عمل کروں گا۔" صفدر نے کہا۔

"ایک درخواست ہے صفدر!" شیری آخر میں ...ولا۔

"حکم۔۔۔ حکم کہیں شیری بھائی!"

"میں اس گھر کا ملازم ہوں۔ کسی بھی وقت کان ...پکڑ کر نکالا جاسکتا ہوں۔ کسی بھی سلسلے میں میرا نام نہ ...آنے پائے۔ یہ میری محبت کا صلہ ہوگا تمہاری طرف ...سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ شیری بھائی! اگر آپ پر اس گھر میں کوئی زیادتی ہوئی تو آپ تنہا اس گھر سے نہیں جائیں گے۔ ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔"

"اس کی نوبت ہی کیوں آئے صفدر! تم جو کچھ کرو ٹھوس بن کر کرو اور کرنے سے پہلے سوچ لو، اگر ہمت نہ پاؤ تو قدم ہی مت اٹھاؤ۔"

"اب تو مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

"او کے۔ فن کار اسی طرح جنم لیتے ہیں۔ ریاض جاری رکھو۔" شیری نے کہا اور صفدر سے اجازت لے کر نکل آیا۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس نے شیلاک پائی کی آواز سنی۔

"پیار کا درخت، آسمان کی وسعتوں میں"

اور شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

شہریار عرف شیری کے شب و روز جاری تھے۔ کوٹھی کا ہر فرد اسے چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ نوکروں کو بھی اس سے لگاؤ ہوگیا تھا۔ ہر ایک کے کام آنے والا علم و فن کا سمندر۔ کون سے کام میں دسترس نہیں تھی اسے۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کرلو اور تو اور لڑکے لڑکیوں کے تعلیمی معاملات میں بھی وہ ان کا مددگار تھا۔ بدر بابر علی میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ ایک ذہین طالب علم گردانا جاتا تھا وہ، لیکن کئی بار ایسے مواقع بھی آئے جب شیری نے اس کی مدد کی اور بدر بابر علی آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا تھا۔ اسے تعجب تھا کہ شیری میڈیکل کی ان الجھی ہوئی گتھیوں کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔

اکثر اہل خاندان اس کے بارے میں گفتگو کرتے تو ان کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب جاتیں۔

"میں تو صرف یہ سوچتی ہوں کہ آخر اس کی تعلیمی حیثیت کیا ہے۔ کوئی معمولی انسان نہیں ہے وہ اور اگر معمولی انسان نہیں ہے تو پھر اتنی معمولی ملازمت کیوں کر رہا ہے۔" انیسہ کہتی۔

"خدا جانے۔ اس کے بارے میں سوچو تو کوئی برا خیال تو ذہن میں ابھرتا ہی نہیں۔"

"وہ برا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"میں تو صرف ایک نتیجے پر پہنچتی ہوں۔" نفیسہ گہری سانس لے کر بولی۔

"وہ تنہا انسان ہے۔ محبتوں اور اپنوں کو ترسا ہوا۔ اسے ایک گھر کی تلاش تھی اور وہ گھر اسے مل گیا۔"

"اب تو وہ تنہا نہیں ہے۔ ہم اس کے ہیں۔"

"خدا کی قسم اسے دور رکھ کر سوچو تو عجیب لگتا ہے۔"

"ہاں واقعی۔ اپنے خون کی سی بو آتی ہے اس میں۔"

"کبھی پوچھو تو سہی، اس کی تعلیم کے بارے میں۔"

"بے کار ہے۔ جو بات وہ نہ بتانا چاہے اسے کوئی پوچھ سکتا ہے۔ تعلیم تو درکنار، اس کی ذات کے بارے میں کسی کو کیا معلوم ہے۔ کوئی معلوم کر سکتا ہے اس سے۔۔۔"

"میرا خیال ہے کوئی نہیں۔" اور یہاں خاموشی چھا جاتی تھی۔ وہ ان سب کا اپنا تھا۔ سب اس سے پیار کرتے تھے، لیکن سب اس سے ناواقف تھے اور وہ ان سب کی سوچوں سے بے خبر اپنی دھن میں مست تھا۔

اس وقت بھی وہ دادا ابو کے بیڈ روم میں تھا اور قہقہے اڑ رہے تھے۔ اخبار سامنے تھا۔ صحافی انہیں نہیں بھولے تھے اور آج کے اخبار میں بھی "اپنا گھر" کے بارے میں ایک مضمون تھا جس میں حیدر علی صاحب کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ بابر علی صاحب کا بھی تذکرہ اور ملک کے تعمیر کنندگان میں ان کا نام لیا گیا تھا۔

"ایک یہ بابر علی ہے۔ اسے دولت سمیٹنے کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ بھئی دولت ہم نے بھی کمائی اور خوب کمائی اور اس کے حوالے کر دی۔ اب جبکہ نوٹوں کے انبار لگے ہوئے ہیں سونے کے ڈھیر چمک رہے ہیں تو ان میں ضرورت مندوں کا حق کیوں نہ نکالا جائے۔ کیا دولت اس کوٹھی میں رہنے والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ عیش سے گزارو لیکن اپنی عیش خوشیوں میں ان کا بھی تو خیال رکھو جن کی دولت بھی تمہارے قبضے میں آ گئی ہے۔ انہیں سونے کے ڈھیر نہ دو زندگی تو دے دو۔" دادا ابو کہہ رہے تھے۔

"خدا آپ کو زندگی دے دادا ابو! ابھی تو بہت سے منصوبے ہیں میرے ذہن میں۔ "اپنا گھر" کو ساری دنیا کے لیے ایک مثال نہ بنا دوں تو ڈاکٹر زواگو نہیں۔"

"سمجھ رہا ہوں۔۔۔ سمجھ رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے۔"

"وہ کیا دادا ابو!"

"ہمارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کا کاروبار زواگو کے نام سے ہی کیوں نہ ہو۔ بہت دل کش نام ہے۔"

"اوہ نہیں دادا ابو! میں اس کے لیے ایک اور نام سوچ چکا ہوں۔" شیری نے کہا۔

"اوہ۔۔۔ وہ کیا۔" دادا ابو نے پوچھا۔

"آئرن ٹاور۔۔۔ عرف دادا ابو، درحقیقت میں آپ کو ایک فولادی مینار سمجھتا ہوں دادا ابو! جس کی عظمت مستحکم ہے اور جسے کوئی مضبوط ترین ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا۔ میں اس ادارے کا نام آئرن ٹاور تجویز کر چکا ہوں۔"

"ارے۔۔۔ ارے بھئی کمال کے آدمی ہو۔ دادا ابو تو سب کچھ ہیں، مگر دادا ابو کا یہ آئرن ٹاور بھی تو ڈاکٹر زواگو کے سہارے کام کر رہا ہے۔ ورنہ اکیلے دادا ابو تو زندگی میں کچھ بھی نہ کر سکے۔"

"ڈاکٹر زواگو تو دادا ابو کا ایک ادنیٰ خادم ہے۔ مجھے تو دادا ابو کے نام ہی سے مسرت ہوتی ہے۔ آپ یقین کریں دادا ابو! کہ میرا دل تو کبھی کبھی یہ چاہتا ہے کہ کاش! میں سچ مچ آپ کے خاندان کا فرد ہوتا اور درحقیقت میرے دادا ابو ہوتے۔" شیری نے کہا۔

"دیکھو بیٹے شیری! میں جذباتی گفتگو کر کے تمہیں قائل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ دو مختلف خاندان ہوتے ہیں جن کا آپس میں کبھی کوئی ربط نہیں ہوتا پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک خاندان کی لڑکی بیاہ کر دوسرے خاندان میں آ جاتی ہے اور اسی خاندان کی نسل کو بڑھاتی ہے۔ خاندان اس کے نام سے آگے بڑھتا ہے۔ مجھے بتاؤ اس لڑکی کا خون کا رشتہ تو کوئی نہ ہوا۔ کیا اس کے خون کے تشکیل پانے والے اس خاندان کے افراد نہیں ہوتے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آدم کی اولاد ایک ہی خون سے تشکیل پائی۔ یہ خون کہیں بھی بکھر جائے، لیکن جب بھی یہ کہیں جمع ہو جائے اور دل اسے تسلیم کر لے تو شیری خون کے رشتے سے نہیں بلکہ آدم کے رشتے سے میری اور تمہاری عمروں میں اگر دادا اور پوتے کا تضاد ہے تو تم مجھے اپنا اصلی دادا ابو کیوں نہیں سمجھ لیتے۔"

"واہ دادا ابو واہ! کیا تو صحیح پیش کی ہے۔ ویسے دلی طور پر تو میں آپ کو اب بھی دادا ابو سمجھتا ہوں۔ یہ خیال کبھی کبھی ذہن میں آ جاتا ہے کہ میں اس گھر میں پیدا نہیں ہوا۔"

"بھئی اگر میں تمہیں دوبارہ پیدا کرا سکتا تو یقین کرو، اس میں کوتاہی نہ برتتا۔" دادا ابو بولے، شیری ہنسنے لگا۔

"آپ مجھے پسند کرتے ہیں دادا ابو! لیکن آپ یقین کریں آپ کی شخصیت بھی میرے لیے اس صفحہ اول میں ہے۔ میں آپ سے زیادہ اس روئے زمین پر کسی کو پسند نہیں کرتا۔"

"شکریہ، شکریہ شیری! ہم جذباتی گفتگو نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ غیروں کے درمیان ہوتی ہے۔ ان کے درمیان جنہیں اجنبیت کا احساس ہو۔ یہاں اس احساس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو ہم ایسی احمقانہ باتیں کیوں کریں۔ اس موضوع کو چھوڑو۔ اب بتاؤ نقشے کا مسئلہ کب تک حل ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں بیٹا! تم اس سلسلے میں فوری کوشش کر ڈالو۔ جب تک بھاگ دوڑ نہیں کرو گے، یہ کام نہیں بنے گا۔"

"یہ کوئی بات نہیں ہے دادا ابو! آج ہی لیں۔ میں تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے جاؤں گا اور اس کے بعد شام کو جب واپس آؤں گا تو نقشے کا مسئلہ حل کر کے ہی لوٹوں گا۔"

"ونڈرفل۔۔۔ ونڈرفل! مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس مضبوط لہجے میں کوئی بات کہہ دو تو وہ بات ضرور پوری ہو گی۔" دادا ابو نے کہا۔

"اچھا دادا ابو! اجازت؟"

"ہاں جاؤ نقشے کا معاملہ آج طے کر لو تاکہ سارے معاملات طے ہو جائیں۔"

"او کے دادا ابو۔" شیری نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ وہ دادا ابو کے کمرے سے نکل کر آگے بڑھ رہا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر عاقل نظر آیا۔ مسمسی سی شکل بنائے کھڑا تھا۔ شیری نے اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"یقیناً یہاں تمہیں کسی سزا کے طور پر نہیں کھڑا کیا گیا ہو گا۔ خیریت تو ہے۔"

"ہاں، آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔" عاقل نے جواب دیا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ فرمایئے۔۔۔ فرمایئے۔"

"آیئے ذرا میرے ساتھ، امی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"اوہ امی۔۔۔ کیوں خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔ بس یونہی کہہ رہی تھیں کہ شیری سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اوہ سوری بھئی! واقعی امی کے پاس نہیں پہنچ سکا، چلو۔" شیری نے کہا اور عاقل کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر آ گیا۔

عاقل کی والدہ کی حالت اب بہت بہتر تھی۔ بلکہ تقریباً صحت یاب ہو گئی تھیں۔ شیری کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ممنونیت کے تاثرات ابھر آتے تھے۔ شیری کئی بار اس پر اعتراض کر چکا تھا، لیکن

شریف النفس خاتون اپنی فطرت کا کیا کرتیں۔

اس وقت بھی شیری نے ان کے قریب جا کر گردن جھکالی اور عاقل کی والدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی بجائے اس کے سر کو سینے سے لگالیا۔

''میں رسمیات کی قائل نہیں ہوں بیٹے! دل نے اندر سے یہی کہا ہے کہ تم میرے عاقل سے کسی طور کم نہیں ہو۔''

''یقیناً کم نہیں ہوں امی جان! اگر آپ نے مجھے کم سمجھا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیسے کم سمجھ سکتی ہوں بیٹے! بالکل اسی کی مانند ہو تم میرے لیے حالانکہ یہ الفاظ ہیں، مگر خدا گواہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔''

''میں خود بھی گواہ ہوں امی جان! طبیعت کیسی ہے آپ کی؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹے! بس یہ عاقل ذرا پریشان ہے۔''

''اوہو ہوہو۔۔۔کوئی احمقانہ خیال آ گیا ہوگا ذہن میں، ورنہ پریشانی خود پر مسلط نہیں ہوتی۔''

''شیری بھائی! آج امی کے سامنے آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی جی فرمایئے اور دروازہ بند کر دیجیے۔ یقیناً آپ کی گفتگو خطرناک ہوگی۔'' شیری ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عاقل نے واقعی پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

''شیری بھائی! پھر وہی خیال ذہن پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ میں یہاں کس بات کی تنخواہ وصول کر رہا ہوں۔''

''یہاں ملازم ہو، مصوری سکھا رہے ہو بابر علی کی صاحبزادی کو۔ تنخواہ وصول نہیں کرو گے تو پھر کیا کرو گے؟''

''کیا میں مصور ہوں؟'' عاقل نے پوچھا۔

''ہاں ہو۔''

''کس طرح شیری بھائی! میں تو مصوری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں۔''

''احمق ہونا اس لیے یہ بات کہہ رہے ہو۔''

''کیوں۔۔؟''

''مصوری کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی مصور کی تخلیق خصوصی طور پر ہوتی ہے۔ اس روئے زمین پر جو آ... ہے عاقل اور جس کو خداوند قدوس نے بینائی دی ہے۔ میرے خیال میں وہ مصور ہے۔ وہ دیکھتا ہے... عکس اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور اسے کاغذ پر اتار لیتا ہے۔ چنانچہ مصور کی تخلیق خصوصی طور پر نہیں ہوتی۔ یہ تو انسانی فطرت کا ایک جز ہے۔''

''میں نے مان لیا شیری بھائی۔۔۔! اور میں کیا بابر علی صاحب بھی مان گئے تھے۔ کتنے حیران تھے وہ اس وقت آپ کی باتوں پر۔ آپ یقین کریں آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ بالکل ہی بے بس ہو کر رہ گئے تھے اور جب بابر علی صاحب جیسی چیز آپ کے سامنے بے بس ہو کر رہ جائے تو پھر بھلا عاقل کیا حیثیت رکھتا ہے۔''

''بھئی دیکھو یہ باتیں مت کرو عاقل! جب گفتگو کرنے پر آئے ہو تو یا تو قائل ہو جاؤ یا قائل کر دو۔''

''میں صرف ایک عرض کرنا چاہتا ہوں شیری بھائی! یہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے جائز نہیں ہے۔''

''دیکھو بیٹے۔۔۔! میرا مطلب ہے عاقل! منے سے بھائی! جائز و ناجائز کا تصور بلاشبہ ایک حقیقت رکھتا ہے اور ایک شریف النفس شخص کو ناجائز پیسہ حاصل نہیں کرنا چاہیے لیکن ہر دور کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ تم صرف مجھے ایک بات بتا دو، کیا تجریدی مصور، مصور ہوتا ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں شیری بھائی!''

''بھائی کہہ نہیں سکتے، سمجھ تو سکتے ہو نا۔ ایسا کرو میرے ساتھ کسی تجریدی آرٹس کی نمائش میں چلو۔ ایک بھی تصویر کے بارے میں مجھے صحیح طور پر بتا دو، مان جاؤں گا۔ جب لاکھوں افراد تجریدی آرٹس کو تسلیم کر چکے ہیں۔ اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اسے سمجھ نہیں پاتے تو پھر تم ان لاکھوں سے الگ ہو کر کیوں سوچ رہے ہو۔ جیسے وہ مصور، ایسے تم۔۔۔'' شیری نے کہا

...عاقل ہنس پڑا۔

''یہ منطق آپ تراش سکتے ہیں شیری صاحب، ...نہیں''

''تمہیں بھی یہ منطق تسلیم کرنا ہوگی عاقل! براہ کرم ان احمقانہ باتوں کو سوچنے میں وقت مت ضائع کرو۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔''

''میں زندگی کی آخری سانس تک آپ سے انحراف نہیں کر سکتا شیری بھائی! لیکن خوف زدہ ہوں۔''

''کس بات سے؟''

''اگر اس وقت آپ نہ آتے تو کیا ہوتا۔''

''کس وقت؟''

''جب بابر علی صاحب نگار خانے میں آ گئے ...'' عاقل نے ہنس کر کہا۔

''میں پھر وہی بات دوہراؤں گا۔ بات اگر تجریدی آرٹ کی نہ ہوتی تو تشویش کی بات تھی۔ اس ...میں یہی فائدہ ہے۔ منہ میں رنگ بھرو اور کینوس پر کلی کر دو۔ کائنات تشکیل ہو گئی۔ مجال ہے کوئی اس کی ...کر سکے۔ ہر چھینٹ کو زمانے کا نشیب و فراز ...ثابت کر سکتے ہو۔ بس سمجھانے کا فن آنا چاہیے۔''

عاقل قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''امی آپ سمجھایئے اسے۔ یہ بچہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔''

''بیٹے! ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ ...کر کے نہ نکالے جائیں اس گھر سے۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا امی! آپ مجھ پر بھروسہ ...یں۔''

''ایک اور بات بھی آتی ہے میرے ذہن میں شیری بھائی!''

''کیا۔۔۔''

''یہ بے تکی مصوری میں کب تک سکھاتا رہوں گا اس شریف لڑکی کو، ایک دن وہ بھی تو ایک کامیاب مصورہ بن جائے گی۔''

''صرف ایک دو ماہ۔'' شیری پھٹ سے بولا۔

''اور اس کے بعد۔۔۔؟''

''اپنا گھر تعمیر ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''بھئی اپنا گھر میں لوگوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے لیے ایک منیجر درکار ہوگا اور ہمیں عاقل سے عمدہ آدمی اور کون مل سکتا ہے؟''

''آپ نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔'' عاقل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے تو بہت کچھ سوچ رکھا ہے عاقل! دعا کرو کہ مجھے کامیابی نصیب ہو۔ اب مجھے اجازت۔ ایک ضروری کام سے نکلنا ہے۔ کر کے آنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔''

''بہتر۔'' عاقل نے کہا اور شیری یہاں سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ نقشے کے ساتھ اس نے کچھ اور بھی بندوبست کیا تھا دادا ابو کو خوش کرنے کے لیے۔ نقشہ تو کئی دن قبل ہی تیار ہو گیا تھا، لیکن شیری نے آرکیٹیکٹ سے درخواست کی تھی کہ اس نقشے کے مطابق پلاسٹر آف پیرس کا ایک خوب صورت ماڈل بھی تیار کرا دے۔ اسی کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی اور اب یہ ماڈل تیار ہو گیا تھا۔

پلاسٹر آف پیرس کا خوب صورت ماڈل جس کے صدر دروازے پر خوب صورت الفاظ میں ''اپنا گھر'' لکھا ہوا تھا۔ دادا ابو کے سامنے تھا اور وہ مسرت سے دیوانے ہو رہے تھے۔ تمام اہل خانہ جمع تھے ان کے کمرے میں، سوائے بابر علی صاحب کے۔ بابر علی صاحب گھر پر موجود نہ تھے ورنہ انہیں بھی طوعاً و کرہاً ہی سہی، آنا تو پڑتا۔ معاملہ حیدر علی صاحب کا تھا۔ ''اپنا گھر'' کا ماڈل اتنا خوب صورت تھا کہ جس نے دیکھا، دیکھتا رہ گیا۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ آج ''اپنا گھر'' کا نقشہ مل جانا چاہیے۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا۔''

''اس جادوگر کے لیے یہ بات مشکل نہیں تھی۔'' بیگم بابر علی صاحب نے پیاری بھری نگاہوں سے شیری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ذرا ان لوگوں کو اس کی تفصیل تو سمجھاؤ شیری!“ دادا ابو نے کہا۔

”بس یوں سمجھ لیں آپ لوگ، میں دور جہانگیری واپس لے آیا ہوں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دادا ابو کا دفتر ہوگا یہاں سے دور دور تک نگاہ رکھی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی ضرورت مند، کوئی بھی پریشان حال دادا ابو کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ ”اپنا گھر“ کے سربراہ تک پہنچنے کے لیے سیکریٹریوں، کلرکوں اور چپڑاسیوں کو رشوت دینے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ اس عمارت میں داخل ہونے والا شخص پہلے اس کے سربراہ سے ملے گا اور اس کی فوری دادرسی ہوگی۔ اس کا مشرقی حصہ جس میں سو کمرے ہوں گے، دارالامان ہوگا۔۔۔ جو بے سہارا خواتین کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں ایک شادی دفتر بھی ہوگا جس میں ان بے سہارا، کنوری، بیوہ اور طلاق شدہ لڑکیوں سے شادی کے خواہش مند حضرات اپنے کوائف بیان کرکے اپنے لیے رشتہ حاصل کرسکیں گے اور ادارہ اس شادی کے اخراجات برداشت کرے گا۔ بیرونی حصہ ایمپلائمنٹ ایکس چینج ہوگا۔ جس کے ذریعے بڑے بڑے صنعتی تجارتی اداروں سے رابطہ قائم کرکے نوجوانوں کے لیے ملازمتیں تلاش کی جائیں گی اور انہیں برسرروزگار بنایا جائے گا۔ جب تک وہ بے روزگار ہوں گے ان کی تمام جائز ضروریات کا خرچ ادارہ برداشت کرے گا۔

شیری تفصیلات بتاتا رہا اور لوگ عش عش کرتے رہے۔ دادا ابو کا سیروں خون بڑھ رہا تھا سب نے اس ادارے کے اغراض و مقاصد کو سراہا تھا۔

ماڈل دادا ابو کے کمرے میں ایک نمایاں جگہ سجادیا گیا اور شیری اس سلسلے میں آئندہ اقدامات کے پروگرام بنانے لگا۔ دادا ابو نے ابتدائی اخراجات کے لیے تیس لاکھ کا چیک اسے دیا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتے کے اندر اندر نقشہ پاس ہوکر آگیا اور کنسٹرکشن کمپنیوں سے اخبارات کے ذریعے ٹینڈر طلب کرلئے گئے۔ دوسرے ہفتے اخبار کے دو صفحات پر ”اپنا گھر“ کے بارے میں ایک ضمیمہ شائع ہوا جس میں سب سے اوپر حیدر علی صاحب کی تصویر تھی اور پھر اس ادارے کی تفصیلات تھیں۔

ملک کے دور دور کے علاقوں سے حیدر علی کے پاس مبارک باد کے فون موصول ہوئے۔ بہت سے مخیر حضرات نے اپنا گھر کی تعمیر میں اپنے حصے کی پیش کش بھی کی تھی۔ دادا ابو سخت مصروف ہوگئے۔ انہیں ہر وقت فون اٹینڈ کرنے ہوتے تھے۔ تب شیری نے انہیں مشورہ دیا۔

”اب آپ کو فوری طور پر ایک منیجر کا بندوبست کرلینا چاہیے دادا ابو!“

”مجھے۔۔۔“

”جی۔۔۔ آپ اتنا کام نہ کرسکیں گے۔ منیجر فی الحال آپ کا سیکریٹری ہوگا اور ادارہ قائم ہونے کے بعد اس ادارے کا منیجر۔۔۔ ابھی سے ہم کسی ایسے آدمی کو رکھ لیں گے تو اس کی تربیت بھی ہوجائے گی۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اس آدمی کا انتخاب تم کرو شیری!“

”میں نے انتخاب کرلیا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے اسے بلالو۔۔۔ کون ہے وہ۔۔۔“

”اپنا عاقل۔“

”کون عاقل؟“

”نفیسہ کا ماسٹر جو اسے مصوری سکھاتا ہے۔“

”وہ چلا سکے گا اس کام کو؟“

”قابل بھروسا اور ایمان دار آدمی ہے اور پھر ہم اسے اس قابل بنائیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے بات کرلو اس سے۔“

”اسے نفیسہ کی طرف سے دس ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔ دادا ابو ہمیں کم از کم بیس ہزار سے ابتدا کرنی ہوگی۔“

”تم اگر یہ سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھ سے کیوں مشورہ کررہے ہو۔“

”تو میں اس سے بات کرلوں۔“

”کمال ہے بھئی۔ یہ مجھ سے پوچھنے کی بات ہے۔“ دادا ابو نے برا مان کر کہا اور شیری نے گردن ہلادی۔

عاقل نے یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوا۔

”خدا کی قسم شیری بھائی! یہ نئی زندگی دے دی ہے آپ نے مجھے۔ یہاں رہ رہا تھا سکون سے زندگی گزار رہا تھا لیکن ایک خلش تھی دل میں کہ میں یہ تنخواہ ناجائز لے رہا ہوں۔ یہ احساس دل کو مردہ رکھتا تھا۔ اب ٹھیک ہے کوئی کام تو ہوگا۔“

اور عاقل نے منیجر کا چارج لے لیا۔ نفیسہ اس بات پر بری طرح بھڑک اٹھی تھی۔

”یہ کیسے ممکن ہے استاد صاحب! آپ دادا ابو کے منیجر ہوجائیں گے تو میرا فن مکمل کیسے ہوگا؟“

”بھئی بڑی منکسر المزاج ہیں آپ نفیسہ بیگم! لوگ جس فن کو حاصل کرنے میں صدیاں لگاتے ہیں، آپ نے اسے چند ماہ میں سیکھ کر اپنے استاد کو حیران کردیا ہے اور انکساری کا یہ عالم ہے کہ آپ ابھی تک خود کو نامکمل سمجھتی ہیں۔“ شیری نے یہ محاذ بھی سنبھال لیا۔ نفیسہ کے چہرے پر پھول کھل اٹھے تھے۔ اس نے حیرانی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو کیا۔۔۔ تو کیا۔۔۔“

”عاقل مجھے آپ کی ذہانت کی کہانی سناتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کی ذہانت پر انگشت بدنداں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رنگ اور برش آپ کے غلام ہیں جس لکیر کو آپ بنادیتی ہیں وہ اپنی جگہ مستحکم ہوتی ہے اور اب ان کے پاس آپ کو سکھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”کیوں استاد صاحب۔“ نفیسہ نے عاقل کی طرف دیکھ کر پوچھا اور عاقل نے کسی چابی کے گڈے کی طرح گردن ہلادی۔ نفیسہ مسرور ہوگئی تھی۔

”مگر مجھے کیوں لگتا ہے جیسے میں نے ابھی کچھ سیکھا ہی نہ ہو۔“

”فن تو ایک سمندر ہے نفیسہ! کون خود کو مکمل کہہ سکتا ہے۔ اس سمندر سے تو چند قطرے ہی مل سکتے ہیں۔ یہ بھی انسان کی خوش بختی ہے۔ تم خود کو فن کی دنیا میں جاننا چاہتی ہو۔“

”ہاں مجھے علم تو ہو کہ میں نے کیا سیکھا ہے۔“ نفیسہ نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔ اپنی تصاویر کی نمائش کرڈالو۔“

”نمائش۔۔۔“ نفیسہ کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

”ہاں نمائش۔۔۔“

”اللہ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔

”کمال ہے شیری سے یہ بات کہہ رہی ہو۔“

”شیری! آپ میری تصاویر کی نمائش کرادیں۔ میں تو خود کچھ بھی نہ کرسکوں گی۔“

”بسر و چشم یہ ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ تم اس نمائش میں رکھنے کے لیے تصاویر تیار کرنا شروع کرادو۔ عاقل اور میں تمہاری ان تصویروں پر نگاہ ڈالتے رہیں گے اور تمہیں مشورہ دیتے رہیں گے۔“

”میں۔۔۔ میں کل ہی سے تیاریاں شروع کردوں گی۔“ نفیسہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ عاقل کو وہاں سے نجات ملی تو اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

”یہ آپ نے کیا کرڈالا شیری بھائی!“

”کیوں بھائی! خیریت تو ہے۔“

”یہاں اس کوٹھی میں تو فن مصوری سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا ہے۔ یہ کھیل جاری تھا۔ لیکن آپ میری اس رسوائی کو کوٹھی سے نکال کر نمائش گاہ تک لے جارہے ہیں۔ وہاں تو فن کے جاننے والے مصور اور نقاد ہوں گے۔“

”ہاں ہوں گے پھر۔۔۔“

”نفیسہ کیا بتائے گی اور میں اسے کیا بتاؤں گا۔“

”وہی جو آج تک بتاتی رہی ہے اور وہی جو آج تک بتاتے رہے ہو۔“

”لیکن نمائش میں۔۔۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ نقاد مصور ہوتے ہیں۔ جو جس فن پر جتنا زیادہ بولتا ہے، وہ اس سے اتنا ہی ناواقف ہوتا ہے۔ فن کار اور نقاد میں بنیادی فرق یہی

ہوتا ہے عزیز من کہ نقاد فن کار نہیں ہوتا اسے صرف تنقید کا فن آتا ہے۔ کسی بھی فن سے متعلق نقادوں کی فہرست پر نظر ڈالو۔ گنے چنے نام سامنے آئیں گے۔ چند مفاد پرست کسی بھی شخص کو اپنے مفاد کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔ وہ مہمان خصوصی بن جاتا ہے۔ نقاد بن جاتا ہے اور نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہے۔ یہ مفاد پرست اپنے مفاد میں اس کی حیثیت قبول کر لیتے ہیں اور پھر اس نقاد کو دوسروں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ وہ نقاد یا مہمان خصوصی بھٹک جاتا ہے۔ وہ در حقیقت خود کو وی آئی پی سمجھنے لگتا ہے، طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ خود کو اس کی حیثیت میں برقرار رکھنے کے لیے اور سچ مانو تو عاقل! ایسے ہی لوگوں کے دم سے بہتوں کا بھرم قائم رہتا ہے اور لوگ نجانے کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ یہ نقاد ان فن کار لوگوں کو اپنی ذہانت سے ہینڈل کرتے ہیں، لیکن خود انہیں ہینڈل کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ تم دیکھتے رہو، نمائش ہونے دو، وہ کھیل دکھاؤں گا کہ ہمیشہ یاد رکھو گے۔"

عاقل عجیب سی نگاہوں سے شیری کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"ایک بات کا جواب اور دے دیں شیری بھائی!"

"جی جی ارشاد۔"

"آپ کیا ہیں؟"

"خدا حافظ۔ مجھے اور بھی کام ہیں اب سارے ہی سوالوں کے جواب دیتا پھروں۔" شیری نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ عاقل ہنس کر رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں دور تک شیری کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہ معمہ کبھی نہ حل ہونے کے لیے تھا۔

"اپنا گھر" کی بنیادیں کھدیں۔ پہلی کدال حیدر علی نے چلائی تھی۔ ملک بھر کے اخبارات نے اس رسم افتتاح کی تصویریں شائع کی تھیں۔ گھر کے تمام لوگ اس افتتاح میں شریک تھے سوائے بابر علی کے۔ بابر علی چالاک تھے۔ ایک ضروری کام نکال کر جاپان چلے گئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اس نقصان کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ "اپنا گھر" کے منصوبے کے بارے میں وہ آخر تک یہی سوچ رہے تھے کہ اس میں کوئی نہ کوئی پچ نکل آئے گی اور منصوبہ ناکام ہو جائے گا لیکن شیری کی ذہانت نے اس میں کوئی سقم نہیں چھوڑا تھا اور تمام مراحل نہ صرف بہ احسن و خوبی طے ہو گئے تھے بلکہ ادارے کے اغراض و مقاصد کو حکومت کی طرف سے بھی سراہا گیا تھا۔ نجی اور سرکاری شعبوں نے ہر طرح کی امداد کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ملک کے طول و عرض سے بہت سے افراد نے حسب توفیق مالی اعانت کی پیش کش بھی کی تھی۔

اگر معاملہ حیدر علی کا نہ ہوتا تو شاید بابر علی اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس ادارے کو کبھی تعمیر نہ ہونے دیتے، لیکن باپ کی مخالفت کس طرح کرتے تھے۔ جس سے بھی کسی کام کے لیے کہتے وہ حیرت کی نگاہ سے انہیں دیکھتا۔ ان کی پوزیشن بری طرح خراب ہو جاتی۔ اس سلسلے میں انہوں نے شیری کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی تھی لیکن شیری وہ بلا تھا کہ شیشے سے تیر کو توڑ دے۔ وہ تو اس ادارے کا روح رواں تھا۔ وہ بھلا ان کے جال میں کس طرح آتا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ شیری نے انہیں اس سلسلے میں شکست فاش دی تھی اور اب کچھ ان کے ہاتھ میں نہ رہا تو وہ چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ اس کی تقریبات میں شریک نہ ہوتے۔ یہ انہوں نے کر لیا تھا۔

لیکن کب تک جاپان میں بیٹھے رہتے۔ واپس آنا ہی تھا۔ واپس آ گئے۔ اخباری نمائندے "اپنا گھر" کے بارے میں ان کے خیالات کے خواہش مند بھی تھے اور اتفاق سے انہی دنوں میں حیدر علی صاحب سے انٹرویو بھی لینا تھا انہیں۔۔۔ چنانچہ حیدر علی صاحب کے ساتھ وہ بھی پکڑے گئے۔ انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ ایک اخباری نمائندے نے حیدر علی صاحب سے سوال کیا۔

"یہ تعمیر کب تک مکمل ہو جائے گی؟"

"انشاء اللہ ایک سال کے اندر اندر۔۔۔ دن رات کام ہوگا۔ کئی کنسٹرکشن کمپنیاں مصروف ہیں۔ خاص انداز سے تعمیر ہو رہی ہے اس کی۔" حیدر علی نے جواب دیا۔

"اس کے اخراجات کی موجودہ شکل کیا ہے؟"

"نوٹوں کی شکل میں ہو رہے ہیں۔" ایک طرف سے شیری کی آواز ابھری اور نمائندے مسکرانے لگے۔ سوال کرنے والا جھینپ گیا تھا۔

"میرا مطلب ہے دوسرے اور حضرات نے اس سلسلے میں مالی معاونت کی ہے؟"

"عزیزم۔۔۔ ابھی تو میرا بینک بیلنس چل رہا ہے اور امید ہے کافی عرصہ چل جائے گا۔ زمین اور ادارے نے عنایت کر دی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی خاموش ہیں۔ میں اس سلسلے میں سچے دل سے کر رہا ہوں۔ باقی اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اگر اس سلسلے میں بابر علی کوئی اطمینان دلا دیں تو ڈھارس بندھ جائے۔" حیدر علی نے کہا۔

بابر علی کی جان نکل گئی تھی۔ گھریلو بات نہیں تھی ایک اخبار کی ملکیت تھا۔ اس لیے جلدی سے بولے۔

"میرے والد محترم نے جس نیک کام کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس سے میری گردن بھی فخر سے بلند ہو گئی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے حاضر ہے۔ "اپنا گھر" کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔" بابر علی صاحب کے یہ الفاظ نوٹ کر لیے گئے۔ وہ اب گردن تک پھنس گئے تھے۔ اس وقت تو مسکراتے رہے لیکن رات کو خواب گاہ میں خاصا ہنگامہ کیا تھا انہوں نے۔

"ابا میاں ہم لوگوں کے تابوت تیار کر رہے ہیں اور اس کی بنیاد وہ منحوس بلا ہے جو ہمارے گھر میں گھسی ہے۔"

"کون۔۔۔ شیری؟"

"شیری اور صرف شیری۔۔۔"

"بال بچوں والے ہو بابر! دل پر ہاتھ رکھ کر بات کرو۔ وہ بھی کسی کا لخت جگر ہوگا۔ بھلا ابا میاں کو کون ان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"میں تو اس گھر پر تباہی کے بادل منڈلاتے دیکھ رہا ہوں۔ ہر فرد کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔"

"جو کچھ ہوگا ٹھیک ہوگا۔ تم فکر مت کرو۔"

"ہاں ہاں تمہیں اندازہ ہو رہا ہے جو پروجیکٹ ابا جان نے شروع کیا ہے وہ کروڑوں روپے سے تکمیل تک پہنچے گا۔ ابا میاں کا بینک بیلنس کتنا سا ہے۔ آج اخباری نمائندوں کے سامنے انہوں نے مجھے پھانس لیا ہے لیکن میں یہ سب کچھ ہونے نہیں دوں گا۔ بابر علی ہے میرا نام بھی۔ جو کچھ بنایا ہے اس کی حفاظت کرنا بھی جانتا ہوں۔ دیکھ لوں گا ایک ایک کو۔"

بیگم صاحبہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور بابر علی صاحب بک بک کر کے خاموش ہو گئے دوسری صبح ناشتے کی میز پر تھے کہ صفدر پر نگاہ جا پڑی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی، بال بھی الجھے الجھے اور بے ترتیب سے نظر آ رہے تھے۔ چونک پڑے۔

"صفدر!"

"جی ابو!"

"کچھ پریشان ہو؟"

"جی نہیں۔"

"پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟"

"ٹھیک ہو رہی ہے۔"

"بھئی پھر یہ داڑھی وغیرہ۔۔۔؟ شیو کیوں نہیں بنائی؟"

"وہ بس ابو! ایسے ہی۔۔۔"

"بھئی داڑھی بھی آج کل فیشن بن گئی ہے۔ یہ فیشن کی داڑھی ہے یا پھر طبیعت کچھ مذہب کی طرف راغب ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"جی ابو۔" صفدر نے کھیسیں نکال دیں۔۔۔ کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بابر علی صاحب کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے چند اور باتیں کیں لیکن صفدر کھلا نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد بابر علی اس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ بیٹے کی اس کیفیت کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

(جاری ہے)

ساتواں نقاب

جب اکائیاں منتشر ہونے لگیں اور بے اعترالیاں معاشی ناہمواریوں کو جنم دینے لگیں تو ایسے ہی المیے سامنے آتے ہیں

فوزیہ ناہید

عمران ڈائجسٹ کا خصوصی طویل ناول

لونیس کلب کے دروازے تک ایڈرین ہیون کو رخصت کرنے کے لیے آئی تھی۔ ایڈرین اسے خدا حافظ کہہ کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئی اور جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو ایڈرین ہیون دھیمے سروں میں گنگنانے لگی۔

نشے کی ترنگ میں اس وقت پوری دنیا اسے خوب صورت اشعار کا ایک مجموعہ لگ رہی تھی لیکن اپنے گھر کی مطالعہ گاہ میں داخل ہوتے ہی اسے ایک نہایت غیر شاعرانہ منظر کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس کا شوہر والٹر ہیون اس کے سامنے مردہ پڑا تھا۔ اس نے والٹر کی دھڑکن، نبض یا سانس کے سہارے اس کے زندہ ہونے کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ والٹر کے مردہ ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اس کا سر اس کی میز پر ٹکا ہوا تھا جو تڑخ چکا تھا اور اس سے خون بہہ بہہ کر میز پر جم چکا تھا۔ اس کے جھولتے ہوئے ہاتھ کے نیچے فرش پر ریوالور پڑا تھا جسے ایڈرین اچھی طرح پہچانتی تھی کہ یہ اس کے شوہر ہی کا ہے۔ فرش پر چاروں طرف کاغذ ہی کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔

میز پر پیپر ویٹ تلے ایک رقعہ دبا رکھا تھا جس پر صرف اتنا لکھا تھا۔

’’ایڈرین! مجھے معاف کر دینا۔۔۔‘‘

والٹر کی اپنی تحریر میں یہ الفاظ پڑھ کر اس کے جسم میں پہلی مرتبہ خوف کی لہر ابھری۔ وہ خوف زدہ سی کمرے سے نکلی اور پھٹی پھٹی آواز میں چلائی۔

’’جوکین! مسز میرو! جلدی آؤ۔‘‘ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ آج تو دونوں نوکرانیاں چھٹی پر ہیں۔

وہ راہ داری ہی میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر ڈھیر ہوگئی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ رونا تنہائی کے اس احساس سے آرہا تھا کہ اسے تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔ اچانک نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس کے آنسو یک لخت تھم گئے۔

اپنی اسی انجانی سوچ کے بوجھ تلے دبی وہ مشینی سے انداز میں اٹھی اور دوبارہ مطالعہ گاہ کی طرف ڑھی۔ لاش پر نظر ڈالے بغیر اس نے جھک کر فرش سے ریوالور اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پیپر ویٹ تلے دبا ہوا رقعہ کھینچ لیا۔۔۔ پھر وہ اسی مشینی انداز میں آتش دان کی طرف بڑھی جس میں ہنوز کوئلے دہک رہے تھے۔ رقعہ اس نے کوئلوں پر پھینک دیا اور اس وقت تک کھڑی دیکھتی رہی جب تک وہ جل کر راکھ نہ ہوگیا

☆☆☆

مائیک کارٹر الارم بجنے سے پہلے ہی بے دار ہوگیا۔ اس کے اعصاب پر تناؤ سا طاری تھا جیسے اس

نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ ذہن پر زور دینے سے اسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا بلکہ رات کو سونے سے پہلے ہی اس کے اعصاب پر بوجھ تھا۔ آج ایک ایسے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانا تھا جو اس کے لیے بے حد اہم تھا۔ مائیک اس مقدمے میں ملزم کا وکیل تھا اور اس کے خیال میں اس کی ساری شہرت اور ساکھ داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس نے آج تک کوئی مقدمہ نہیں ہارا تھا لیکن اس مقدمے کے بارے میں جیوری کا متفقہ فیصلہ سامنے آنے سے پہلے ہی افواہیں اڑنا شروع ہوگئی تھیں کہ اس کا موکل سزایاب ہوگا۔ آج جیوری کو اپنا فیصلہ سنانا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور پہلو میں لیٹی اپنی بیوی پر نظر ڈالی وہ اس سے پہلے ہی بے دار ہونے کے بعد نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا وقت ہوا ہے۔" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"سات بجنے والے ہیں۔" مائیک نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے نینسی! اب تم اٹھ جاؤ اور میرے لیے ناشتا تیار کرنا شروع کردو۔"

"ابھی سے۔۔۔" نینسی نے حیرت سے کہا پھر اچانک ہی جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ "اوہ! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ آج کا دن کتنا اہم ہے۔"

"ہاں۔ آج ہارے ہوئے جواری کو یادگار قسم کا ناشتا ملنا چاہیے۔" مائیک نے مسکرا کر کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔" نینسی بولی۔ "تم نے ابھی سے اپنے آپ کو شکست خوردہ سمجھنا شروع کردیا ہے۔ میں ہرگز پسند نہیں کروں گی کہ آج کمرا عدالت میں داخل ہوتے وقت تمہاری گردن پہلے ہی سے جھکی ہوئی ہو۔"

"گردن جھکانے یا اکڑانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل اہمیت تو جیوری کے فیصلے کی ہے۔" مائیک نے کہا۔

"میرے لیے تو فرق پڑتا ہے۔ وعدہ کرو کہ کم از کم میری خاطر ہی سر اٹھا کر کمرا عدالت میں داخل ہوں گے۔" نینسی نے اپنی خوشنما بانہیں اس کے گلے میں حمائل کردیں۔

"اچھا ڈارلنگ! میں وعدہ کرتا ہوں۔" مائیک نے جواب دیا۔ کمرا عدالت میں پہنچ کر اپنی میز پر بیٹھتے ہوئے مائیک نے اپنا وعدہ یاد رکھا اور اپنے کسی بھی انداز سے مایوسی و دل شکستگی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

ملزم ڈیوس کٹہرے میں موجود تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی مشینیں فروخت کرنے والا ایک معمولی سا ایجنٹ تھا اور لوگوں کو بجا طور پر حیرت تھی کہ مائیک جیسے معروف اور بڑے وکیل نے کس طرح اس کا مقدمہ لڑنا منظور کرلیا تھا۔ مائیک کا جواز اس ضمن میں صرف یہ تھا کہ اسے ڈیوس بے گناہ محسوس ہوا تھا اس لیے اس نے اس کا دفاع کرنے کی حامی بھرلی تھی۔

کمرا عدالت میں اخباری نمائندوں کی بھی فوج ظفر موج موجود تھی۔ کچھ ہی عرصے میں یہ مقدمہ شہرت حاصل کرگیا تھا اور آج اس کا فیصلہ کیا جانا تھا، گویا کوئی بم پھٹنے والا تھا۔ اخباری نمائندوں میں "مونٹیسیلو نیوز" کا رپورٹر بھی شامل تھا۔ اس اخبار کے چیف ایڈیٹر مائیک کے سسر تھے۔ مائیک نے جیوری کے ارکان کے چہروں سے ان کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی اور اسے وہاں کچھ اچھی علامات نظر نہ آئیں۔۔۔ پھر اس نے حاضرین کا جائزہ لیا۔ آج خلافِ معمول فل اور لوئیس کپری کے چہرے حاضرین میں نظر نہیں آرہے تھے۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی اور جیوری نے جیسے ہی اپنا تحریری فیصلہ جج کو پیش کیا، مائیک کو گویا الہام سا ہوگیا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ برسوں کی پیشہ وارانہ مہارت نے اس میں یہ صلاحیت پیدا کردی تھی کہ وہ چہروں کو دیکھ کر فیصلے پڑھ سکے۔ وہ تو وکیل تھا، خود ملزم ڈیوس نے آنے والے لمحوں کا عکس دیکھ لیا تھا۔ اس نے جھک کر مائیک کے کان میں کہا۔

"ضروری نہیں کہ انسان ہمیشہ جیتتا ہی رہے۔"

"شاید ہم جیت جاتے بشرط یہ کہ تم نے اصل حالات دیانت داری سے مجھے بتادی ہوتی۔" مائیک نے دل ہی دل میں کہا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کی مائیک کو توقع تھی۔ ملزم کے قصوروار ثابت ہونے کا فیصلہ دے دیا گیا کہ اس نے حقیقتاً ایک حسینہ کی خاطر ایک شخص کو قتل کیا تھا۔

کمرا عدالت میں بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ مائیک نے رسمی طور پر گورنر کے حضور اپیل کرنے کی درخواست پیش کی۔ ضابطے کی کارروائی ختم ہوئی تو وہ الجھا الجھا سا ذہن لیے باہر آگیا۔ دفعتاً عقب سے کسی نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مونٹیسیلو کا پولیس چیف جو آج عدالت میں موجود تھا، مائیک کی طرف لپکا آرہا تھا۔ مائیک سے اس کی بے تکلفانہ شناسائی تھی۔

"ہیلو۔ بل مارکیو!" مائیک نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "آخر تمہارا گرفتار کردہ ملزم، قصوروار قرار دے ہی دیا گیا۔"

"حالانکہ مجھے خود بھی اس کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ تھا۔" بل نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "آؤ۔۔۔ کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں اور تھوڑی سی گفتگو کرتے ہیں۔"

"اس وقت تو میں معذرت چاہوں گا۔" مائیک نے کہا۔ "میری ایک ملاقات طے ہے اور مجھے اپنے دفتر جانا ہے۔"

☆☆☆

مائیک کے دفتر میں لوئیس کپری اس کی منتظر تھی۔ مائیک کی سیکریٹری جین نے اسے انتظار گاہ میں بٹھا رکھا تھا۔ مائیک کو دیکھ کر لوئیس اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بلا تمہید بولی۔ "مائیک! میں تنگ آگئی ہوں۔ مجھے قانونی کارروائی کرنا ہی پڑے گی۔"

"کس کے خلاف۔۔۔؟" مائیک نے اس کے لیے اپنے دفتر کا دروازہ کھولتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "کیا کسی دکان دار نے کوئی ناقص کپڑا تمہارے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔"

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" لوئیس بدستور برہم تھی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ قانون کی زبان میں انہیں کیا کہا جاتا ہے۔"

"مگر کس پر ہو رہی ہے بہتان تراشی۔" مائیک نے پوچھا

"ایڈرین پر۔" لوئیس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمہیں شاید پتا ہو کہ وہ میری کتنی عزیز دوست ہے۔"

"بہتان تراشی کی نوعیت کیا ہے۔" مائیک نے پوچھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔"

مائیک کے چہرے پر پہلی مرتبہ دلچسپی کے آثار نظر آئے۔ "لیکن یہ ایڈرین ہے کون؟ میری اس سے غالباً کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"ایک بار ہوئی ہے۔" لوئیس نے یاد دلایا۔ "ہل ٹاپ کلب میں، ابھی گزشتہ دنوں ہی ایک تقریب میں تمہارا اس سے تعارف ہوا تھا، شاید تمہارے ذہن میں نہیں رہا۔ بہرحال، اگر تم اس عورت سے اچھی طرح واقف ہوتے تو اس قسم کی افواہوں پر ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہ کرتے۔"

"لیکن لوگ کیوں یقین کررہے ہیں؟"

"لوگوں کی تو فطرت ہوتی ہے کہ دوسروں کے بارے میں ہر بری بات پر فوراً یقین کرلیں۔" لوئیس نے جواب دیا۔

"لیکن اس ضمن میں بھلا کیا قانونی کارروائی ہوسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی کرسکتا ہوں کہ اگر ایڈرین باضابطہ طور پر میری خدمات حاصل کرے تو میں ان لوگوں کے نام ایک، رونگٹے کھڑے کردینے والا نوٹس جاری کرسکتا ہوں جو اس کے خیال میں یہ الزام تراشی کررہے ہیں۔"

"ایڈرین کے بجائے میں تمہاری خدمات حاصل نہیں کرسکتی؟"

"معاف کرنا، میں موکل در موکل والے طریقہ کار کا قائل نہیں۔ بہر حال، یہ بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے۔" مائیک نے کہا۔

"میرا تو خیال تھا کہ تمہیں پتا لگ چکا ہوگا۔" لوئیس بولی۔

"مجھے یہ تو علم ہے کہ ایڈرین نامی ایک عورت کا شوہر والٹر ہیون پچھلے دنوں قتل کردیا گیا ہے۔" مائیک نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن تفصیلی حالات کا مجھے علم نہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ میں ایک مقدمے کے سلسلے میں بے حد مصروف تھا۔"

"ہاں، اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج تمہارے موکل کے خلاف فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس فیصلے سے تمہیں ذہنی دھچکا لگا ہوگا۔" لوئیس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ بہر حال! ابھی امید کی کرن باقی ہے۔"

"تم والٹر ہیون کو جانتے ہو۔" لوئیس اصل موضوع کی طرف پلٹ آئی۔

"غالباً وہ کاریں تیار کرنے والی کسی کمپنی کا مالک تھا۔" مائیک نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ اس کے خاندان نے اسی صنعت سے دولت کمائی تھی لیکن میرا اندازہ ہے کہ اب اس کے پاس زیادہ دولت نہیں رہی تھی کیوں کہ اس کا موروثی کارخانہ عرصے سے بند پڑا ہے۔ تقریباً پندرہ برس سے "ہیون موٹر کمپنی" نے ایک بھی کار تیار نہیں کی۔"

"میری معلومات کے مطابق والٹر ہیون کو سیاست سے زیادہ دلچسپی تھی۔"

"ہاں۔ اس کے خاندان کے بیشتر افراد سیاست سے وابستہ رہے ہیں اور اسی راستے سے حکومتی نظام میں بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔ اس کے دادا اور چچا وغیرہ اسٹیٹ گورنر اور میئر رہ چکے ہیں۔ والٹر بھی قتل ہونے سے پہلے سیاست میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

"اخباری اطلاعات کے مطابق، پولیس کا خیال ہے کہ وہ کسی ڈاکو یا نقب زن کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

"حقیقت یہی ہے۔ کیوں کہ ایڈرین تو ٹاپ ہل کلب کی تقریب میں میرے ساتھ تھی۔ والٹر وہاں نہیں آیا تھا۔ وہ سماجی تقریبات میں میرے ساتھ تھی۔ والٹر وہاں نہیں آیا تھا۔ وہ سماجی تقریبات میں بہت کم جاتا تھا۔ البتہ ایڈرین کو خود اصرار کرکے ایسی تقریبات میں بھیجتا تھا۔"

"تب تو یہ ڈاکو یا نقب زن والا قیاس درست معلوم ہوتا ہے۔ ایڈرین اپنی فیملی کار میں کلب آنے کے لیے نکلی ہوگی۔ وہ لٹیرا جو موقع کی تاک میں تھا، یہی سمجھا ہوگا کہ گھر خالی ہے مگر اندر پہنچ کر اس کا سامنا والٹر سے ہوگیا ہوگا۔" مائیک نے کہا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔" لوئیس نے پُرجوش انداز میں تائید کی۔ "گھر میں صرف دو نوکرانیاں ہیں لیکن وہ بھی اس روز چھٹی پر تھیں۔"

"ضروری تو نہیں کہ جس طرح ہم سوچ رہے ہیں، حالات بھی اسی طرح پیش آئے ہوں۔" مائیک نے اطمینان سے خود اپنے ہی اندازوں کی تردید کردی۔

"پھر بھی ایڈرین پر تو اس قتل کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ساڑھے دس بجے تک ہمارے ساتھ تھی۔ میں نے اور فل نے خود اسے ٹیکسی میں سوار کرایا تھا کیوں کہ کار اس نے واپس بھیج دی تھی۔

"جائے واردات سے اس کی عدم موجودگی کا یہ جواز کام تو دے سکتا ہے، بشرطیکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں والٹر کی موت کا وقت صحیح متعین کرلیا جائے۔ بعض اوقات کسی وجہ سے وقت کا تعین نہیں ہوپاتا۔"

"لیکن جاسوسی کہانیوں میں تو ہمیشہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چل جاتا ہے کہ قتل اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر ہوا تھا۔" لوئیس بولی۔

"یہ محض کتابی باتیں ہیں۔ بہر حال قتل کے لیے کوئی نہ کوئی مقصد بھی ضروری ہوتا ہے۔ پولیس کو کسی پر قتل کا الزام لگانے کے لیے مقصد بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔" مائیک بولا۔

"مقصد بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کی شادی کو صرف دو برس ہوئے تھے اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ایڈرین اس سے اکتا چکی تھی۔ جہاں تک مالی مفادات کا تعلق ہے تو والٹر کی کمپنی پر قرضے زیادہ تھے اور اثاثے کم۔" لوئیس نے بتایا۔

"گویا کوئی مقصد نہ ہونے کے باوجود لوگ افواہیں اڑا رہے ہیں۔" مائیک نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"لعنت بھیجو لوگوں پر۔ ہم کس کس کی زبان پکڑ سکتے ہیں۔" لوئیس اٹھتے ہوئے بولی۔

"گویا تم نے ان کے خلاف قانونی کارروائی کا ارادہ ترک کردیا ہے۔"

"اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ یہ اقدام بڑا احمقانہ سا لگے گا۔ تم سے باتیں کرکے ہی میرے دل کا بوجھ خاصا ہلکا ہوگیا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ کل تم سے اور فل سے ملاقات ہورہی ہے۔" مائیک نے الوداعی انداز میں اٹھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً۔" لوئیس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ۔" اس کے رخصت ہوتے ہی مائیک کی سیکریٹری جین کوئی فائل لینے کے لیے اندر آئی اور کاغذات الٹتے پلٹتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ "بے چاری مسز والٹر ہیون!"

"کیا ہوا اسے۔" مائیک نے چونک کر پوچھا۔

"آپ کے آنے سے پہلے لوئیس مجھ سے اسی کے بارے میں باتیں کررہی تھی۔ میں نے کہا کہ میں تو ان افواہوں پر بالکل یقین نہیں رکھتی۔" جین نے کہا۔

"کون سی افواہیں؟"

"وہی مسز والٹر ہیون اور اس آدمی کے متعلق۔"

"کس آدمی کے متعلق۔" مائیک نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹونی جیرک۔" جین نے جواب دیا۔ "لوگ اسی شخص کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ ایڈرین اس کی محبت میں گرفتار تھی۔"

☆☆☆

"لیکن یہ ٹونی جیرک ہے کون؟" مائیک کی بیوی نینسی نے پوچھا۔

"تم نے کبھی مہاجر کیمپ کا نام سنا ہے؟" مائیک نے الٹا اسی سے سوال کردیا۔

"ہاں۔۔۔ غالباً یہ صنعتی علاقے کے قریب واقع ہے۔" نینسی نے جواب دیا۔

"لیکن اس وقت میری مراد مجرموں کے مہاجر کیمپ سے ہے۔ ٹونی جیرک ایسے ہی کسی کیمپ کی پیداوار ہے۔" مائیک نے بتایا

"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ایڈرین ہیون جیسی عورت۔۔۔" دفعتاً نینسی کو احساس ہوا کہ کھانے کی میز پر ان کے قریب ہی بیٹھی ان کی کم سن بیٹی لاری بڑے غور سے ساری باتیں سن رہی ہے، تو اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بہر حال، یہ ضروری نہیں کہ افواہیں بے بنیاد ہوں۔ ٹونی جیرک جرائم کی دنیا کی پیداوار ہے لیکن اس کی زندگی کا موجودہ دور خاصا خوش گوار ہے۔ صنعتی علاقے میں ایک چھوٹی سی سفید عمارت موجود ہے جس پر جیرک انجینئرنگ کارپوریشن کا بورڈ لگا ہے۔ یہ جیرک ہی کی ملکیت ہے۔"

لاری کھانا کھا چکی تھی۔ نینسی نے اسے اس کے کمرے میں بھیج دیا کہ وہ اسکول کا کام کرے۔ اس کے اٹھنے کے بعد وہ بولی۔ "لوئیس کی طرف سے دی گئی ایک پارٹی میں ایڈرین سے میری سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھے کسی گڑیا کی طرح نازک اندام دکھائی دی تھی جب کہ جیرک کے متعلق تمہاری

گفتگو سے اس شخص کا جو خاکہ ذہن میں آتا ہے، اس کے مطابق وہ ایک کھردرا، کرخت اور شاید تشدد پسند آدمی ہوگا۔ کیا ایڈرین، کسی ایسے شخص سے مراسم رکھ سکتی ہے۔‘‘

’’یہ کوئی مروجہ اصول نہیں۔ بہتیری نازک اندام عورتیں کھردرے، کرخت اور تشدد پسند مردوں کو اپنی عنایات سے فیض یاب کرتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جیرک میں یہ ساری خصوصیات موجود ہی ہوں۔ بے شک وہ جیل میں رہا ہے۔‘‘

’’جیل میں رہا ہے۔‘‘ نینسی نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا

’’ہاں۔ سولہ سال کی عمر میں وہ کاریں چرانے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ اسے اصلاحی اسکول میں بھیجا گیا لیکن وہاں سے نکلتے ہی اس نے مزید کاریں چوری کرلیں۔‘‘ مائیک نے بتایا۔

’’لگتا ہے کہ اسے کاروں سے بہت دلچسپی ہے۔‘‘ نینسی نے کہا۔

’’ہاں۔ اس ابتدائی مجرمانہ دلچسپی نے ہی اسے تعمیری راہ پر ڈال دیا۔ وہ کاروں کا بہترین مکینک بن گیا۔ مزید ترقی کرتے کرتے اس نے یہ کارپوریشن قائم کرلی۔ اب وہ کاروں کے نت نئے پرزے ایجاد کرنے کا کام کرتا ہے۔ اس کے ایجاد کردہ، نئی طرز کے کئی پرزے بے حد کامیاب ثابت ہوچکے ہیں اور ان سے جیرک نے خاصی دولت کمائی ہے۔‘‘

’’مگر ایڈرین سے اس کی ملاقات کیسے ہوگئی۔‘‘ نینسی نے پوچھا۔

’’جیرک کی ملاقات درحقیقت ایڈرین سے نہیں بلکہ اس کے شوہر سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک تعلق مشترک موجود تھا یعنی والٹر خاندانی طور پر موٹر سازی کی صنعت سے وابستہ تھا اور جیرک پرزوں کا بادشاہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ والٹر کا کاروبار ٹھپ پڑا تھا جب کہ جیرک اپنے پیشے میں کامیاب جارہا تھا۔ چنانچہ والٹر نے جیرک کی صلاحیتیں خریدنے کی کوشش کی تھی۔

’’جیرک اس پر رضامند ہوگیا؟‘‘ نینسی نے بے تابی سے پوچھا۔

’’ہاں۔ کئی ملاقاتوں، دعوتوں اور تبادلہ خیال کے بعد۔ اس طرح ایڈرین سے بھی اس کی راہ و رسم ہوئی جو اس وقت افواہوں کی بنیاد ہے۔‘‘

’’مائیک تمہیں اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوگئیں۔‘‘ نینسی نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

’’اس قسم کی معلومات رکھنا میرے پیشے کا ایک حصہ ہے۔‘‘ مائیک نے جواب دیا۔

جس وقت وہ دونوں میاں بیوی ایڈرین کے متعلق یہ باتیں کررہے تھے، ایڈرین بھی اپنے گھر میں کھانے کی میز پر موجود تھی۔ اس کے چہرے پر سوگواری اور جسم پر ماتمی لباس تھا لیکن اس کے کھانے کا انداز ان دونوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ کسی فاقہ زدہ بچے کی طرح کھانے میں مصروف تھی۔ دراصل اپنی بھوک پر اسے اختیار نہ تھا۔

اس کے سامنے ہی میز کے دوسری طرف اس کا باپ بیٹھا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھا لیکن اب پریکٹس ترک کرکے ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کررہا تھا اور آج کل ایڈرین کی دل جوئی کے لیے اس کے گھر آیا ہوا تھا۔

’’بیٹی!‘‘ اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم کچھ زیادہ ہی تیزی سے کھارہی ہو، اس طرح لقمے اچھی طرح چبائے نہیں جاسکتے۔‘‘

’’ڈیڈی! آپ نے پریکٹس چھوڑ دی لیکن طبی مشورے دینا نہیں چھوڑے۔‘‘ ایڈرین نے کھانے کی رفتار کچھ کم کرتے ہوئے کہا۔ ’’اب آپ میرے لیے کوئی نسخہ بھی تجویز فرمائیں گے کیا؟‘‘

’’ہاں۔۔۔ کھانا تم کھاؤ، شراب اس سے بھی کہیں کم پیو اور خوب آرام کرو۔ بلکہ میرا تو خیال ہے، کیوں نہ ہم دونوں کسی صحت افزا مقام کی طرف نکل چلیں۔‘‘

’’میں ابھی کیسے جاسکتی ہوں ڈیڈی!‘‘

’’رکاوٹ کیا ہے۔ پوچھ گچھ تو ختم ہوچکی ہے۔ اب کوئی تمہیں پریشان کرنے نہیں آئے گا۔‘‘

’’پولیس، انشورنس کمپنی والے اور اخباری لوگ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔‘‘ ایڈرین نے کہا۔

’’چلو دو چار دن کی بات اور ہے۔ آخرکار وہ قاتل جو بھی تھا، پکڑا ہی جائے گا جس نے والٹر کو قتل کیا تھا۔‘‘ ڈاکٹر ایلڈن نے کہا۔

’’کیا واقعی آپ کو یہ امید ہے۔‘‘ ایڈرین نے پوچھا۔

’’کیا کہا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی قاتلوں پر حماقت یا اخلاقیات کا دورہ پڑتا ہے یا پھر وہ نشے کے عالم میں ہی اعتراف جرم کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچ جاتے ہیں۔‘‘

’’مجھے تو امید نہیں کہ قاتل پکڑا جائے گا۔‘‘ ایڈرین بولی۔ ’’اور اگر پکڑا بھی گیا تو کیا فائدہ۔ اس کی گرفتاری سے والٹر تو زندہ نہیں ہوسکتا۔‘‘

دفعتاً ایڈرین کی خادمہ جولین نے کمرے میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ’’کافی لے آؤں، مسز ہیون!‘‘

’’ہاں، لے آؤ۔ ہم کھانا کھا چکے ہیں۔‘‘ ایڈرین نے جواب دیا اور پھر اپنے باپ سے مخاطب ہوئی۔ ’’ڈیڈی! آج رات آپ کلب چلیں گے۔‘‘

’’نہیں بھئی۔ بوڑھے لوگوں کے پاس وہاں سوائے سیاست اور ماضی کے، بات کرنے کو کوئی موضوع تو ہوتا نہیں۔‘‘

’’آپ کو ایک موضوع اور بھی مل سکتا ہے۔۔۔ یعنی ٹونی جیرک!‘‘ ایڈرین نے زیر لب کہا۔

☆☆☆

عین اسی وقت پولیس چیف بل مارکیو بھی اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ کھانے کی میز پر موجود تھا اور نہایت بے دھیانی سے کھانا کھارہا تھا۔

’’بل! تم کسی ذہنی الجھن میں گرفتار ہو۔‘‘ اس کی بیوی مارتھا نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’الجھنیں اور پولیس کی نوکری لازم و ملزوم ہیں۔‘‘ بل نے مسکرا کر جواب دیا۔

’’کیا والٹر ہیون والے معاملے میں الجھے ہوئے ہو۔‘‘ مارتھا نے جاننا چاہا۔

’’ہاں۔ میں ایک ٹیلی فون کال کا منتظر ہوں جو کسی وقت بھی آسکتی ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ معاملہ کچھ آگے بڑھا ہے۔‘‘ مارتھا نے اشتیاق سے کہا۔ ’’کیا انکشافات ہوئے ہیں۔‘‘

’’ڈارلنگ! تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپاتا لیکن اس معاملے میں تم سے معذرت چاہوں گا۔ دراصل اس کیس کے سلسلے میں پہلے ہی اتنی افواہیں پھیل چکی ہیں کہ حکام کی طرف سے ہمیں اب اس موضوع پر اپنے عزیزوں، دوستوں، حتیٰ کہ بیوی، بچوں کے سامنے بھی زبان کھولنے سے منع کردیا گیا ہے۔‘‘

’’اتنا تو بتا سکتے ہو کہ کوئی گرفتاری متوقع ہے یا نہیں۔‘‘

’’گرفتاری تو غالباً عمل میں آچکی ہوگی۔ میں اسی کی اطلاع کا انتظار کررہا ہوں۔‘‘ بل نے جواب دیا۔

تقریباً دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ بل سے زیادہ شدت کے ساتھ مارتھا چونکی۔

’’بل مارکیو بول رہا ہوں۔‘‘ بل نے ریسیور اٹھا کر کہا۔۔۔ پھر کچھ سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’ٹھیک ہے۔۔۔ اسے حراست میں رکھو۔‘‘

اتنی سی گفتگو کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ مارتھا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔ ’’اس گرفتاری کے لیے ہمارے آدمیوں کو ڈیٹرائٹ تک کا سفر کرنا پڑا ہے۔ گرفتاری وہیں عمل میں آئی ہے۔ قتل کے شبے میں

ایک شخص کو حراست میں لیا گیا ہے۔"
"کیا نام ہے اس کا۔۔۔" مارتھا نے پوچھا۔
"ٹونی جیرک!" بل نے جواب دیا

☆☆☆

"مسز ایڈرین ہیون آپ سے ملنے آئی ہیں۔" مائیک کی سیکریٹری نے انٹرکام پر اسے اطلاع دی۔ "آپ سے ان کی ملاقات طے نہیں تھی لیکن وہ کہتی ہیں کہ ان کا آپ سے ملنا نہایت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے اندر بھیج دو۔" مائیک نے کچھ سوچ کر کہا۔ ایڈرین اندر آئی تو مائیک کو اسے دیکھ کر احساس ہوا کہ اب تک اس نے لوگوں سے ایڈرین کے متعلق جو کچھ سنا تھا اس میں کہیں بھی اس کی خوب صورتی کا تذکرہ نہیں آیا تھا حالانکہ یہ اس کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ تاہم اس وقت اس نے اپنے چہرے کی زردی اور ہونٹوں کا پھیکا پن چھپانے کے لیے گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔

"مجھے لوئیس نے مشورہ دیا تھا۔۔۔" ایڈرین نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "کہ میں آپ سے بات کروں۔"

"کس سلسلے میں؟" مائیک نے پوچھا۔

"اس شخص کے سلسلے میں جسے میرے شوہر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کا نام ٹونی جیرک ہے۔" ایڈرین نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں نے اس کے متعلق سنا ہے۔ اسے غالباً ڈیٹرائٹ سے گرفتار کیا گیا ہے۔"

"جی ہاں! لیکن وہ فرار نہیں ہو رہا تھا بلکہ کاروبار کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔"

"اس سلسلے میں مجھے زیادہ علم نہیں۔" مائیک نے کہا۔

"لوئیس تو بتا رہی تھی کہ پولیس چیف بل مارکیو آپ کا قریبی دوست ہے۔"

"وہ میرا دوست ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے ہر کیس کے بارے میں مجھے سب کچھ بتاتا ہو۔ مجھے تو اپنے سسر سے پتا چلا تھا جو روزنامہ "مونٹی سلیونیوز" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔" مائیک نے کہا۔

"کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ٹونی۔۔۔ میرا مطلب ہے مسٹر ٹونی جیرک نے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" ایڈرین نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ اس بات کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال، اگر وہ مسلسل انکار کرتا رہا تو پھر سرکاری طور پر اسے وکیل مہیا کیا جائے گا۔ قانون یہی ہے۔"

"لیکن یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ اس پر قتل کا سنگین الزام ہے اور اپنے مؤثر دفاع کے لیے اسے کسی معروف اور ذہین وکیل کی ضرورت پڑے گی۔ آپ جیسے وکیل کی۔۔۔"

"مسز ایڈرین!" مائیک نے ایک پینسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ ٹونی جیرک کے لیے میری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ لیکن ٹونی جیرک نے خود مجھ سے یہ درخواست نہیں کی۔ میں اپنے طور پر لوئیس سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کے پاس آئی ہوں۔ بہرحال، میرا اندازہ ہے کہ جب ٹونی جیرک کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوگا تو وہ اس بات پر میرا شکر گزار ہوگا کہ میں نے اس کے لیے آپ سے رجوع کیا تھا۔"

"لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی مسز ایڈرین! پولیس نے جس شخص کو آپ کے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے، آپ اس کے لیے وکیل کیوں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔" مائیک نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"صرف اس لیے کہ میرے خیال میں وہ بے گناہ ہے۔" ایڈرین نے سکون سے کہا۔

"آپ کے پاس اس خیال کی کوئی معقول وجہ ہے۔" مائیک نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ایڈرین نے نظریں جھکا لیں اور چند لمحے تک [illegible] بولی۔ "بظاہر تو میرے پاس کوئی جواز نہیں۔" [illegible] اس نے جواب دیا۔

"کوئی ایسا نکتہ جسے جواز بنایا جا سکتا ہو۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے قانون کی [illegible] کا علم نہیں۔ بہرحال، مجھے صرف اتنا معلوم [illegible] کہ قتل اس نے نہیں کیا۔" ایڈرین نے فیصلہ کن [illegible] میں کہا۔

"گرفتاری کے بعد کیا آپ کی اس سے ملاقات ہوئی ہے۔" مائیک نے استفسار کیا۔

"میں اپنے شوہر کے قتل سے تقریباً ایک ماہ [illegible] اس سے آخری بار ملی تھی۔"

"ہوں۔" مائیک نے کچھ اس طرح ہنکارا بھرا [illegible] اس بے معنی سی آواز میں ہزاروں معانی پوشیدہ [illegible] ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نے ایڈرین کے ایک لفظ پر یقین نہ کیا ہو۔ اس تاثر کو محسوس کر کے ایڈرین کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔

"آپ کی جتنی شہرت سنی ہے، میں نے آپ کو [illegible] نہیں پایا۔ لوئیس نے تو کہا تھا کہ آپ انسان کے [illegible] سے حقائق پڑھ لیتے ہیں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں، مسز ایڈرین!"

"آپ ایسا سوچ تو رہے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اس [illegible] کے بارے میں یہ صرف آپ کی اپنی رائے [illegible] کیوں کہ آپ نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ آپ اس [illegible] متعلق سب کچھ جانتی ہیں۔ جب بھی کوئی شخص قتل کرتا ہے تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لوگوں کی یا اس کے اپنے کنبے کے کچھ افراد کی یہ رائے ضرور ہوتی ہے کہ نہیں، وہ قاتل نہیں ہو سکتا، وہ اس قسم کا آدمی ہی [illegible] ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

"لیکن میں نے ٹونی جیرک کے متعلق یہ نہیں کہا۔ میرے خیال میں تو وہ یقیناً اسی قسم کا آدمی ہے۔" ایڈرین نے کہا۔

"کیا کہا آپ نے۔۔۔" مائیک کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ٹونی ایک کرخت آدمی ہے۔ اس کا مزاج کافی حد تک تشدد کی طرف مائل ہے۔ لڑکپن ہی سے وہ اپنی اس فطرت کی بدولت مشکلات میں پھنستا رہا ہے لیکن وہ کبھی کسی کو قتل کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا کیوں کہ بقول اس کے یہ ایک ایسا گناہ ہے جسے خدا کبھی معاف نہیں کرتا۔"

"کیا وہ مذہبی قسم کا آدمی ہے۔" مائیک نے پوچھا۔

"مکمل طور پر نہیں۔ لیکن چند ایک مذہبی احکامات پر وہ اکثر کاربند رہتا ہے۔" ایڈرین نے گفتگو کے دوران میں اپنے پرس سے ایک شیشی نکالی، اسے ہتھیلی پر الٹ کر اس نے ایک ننھی سی سفید گولی نکالی اور بغیر پانی کے نگل گئی، شیشی اس نے واپس پرس میں رکھ لی۔ گولی کے بارے میں نہ تو اس نے خود کوئی وضاحت کی اور نہ ہی مائیک نے کچھ پوچھا۔

"گویا وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے کہ قتل کر سکے۔" مائیک نے پوچھا۔

"وہ غصہ ور ہے اور غصے کی انتہا میں اس سے قتل کی توقع بھی کی جا سکتی ہے لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بنا کر یا ارادتاً کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔"

"بالفرض اس نے یہ قتل کیا بھی ہو تو آپ کے خیال میں اس نے کسی جواز یا کسی مقصد کے تحت یہ قدم اٹھایا ہوگا۔" مائیک نے پوچھا۔

"اگر میں شہر میں اڑتی ہوئی افواہوں پر یقین کر لوں تو جواز اور مقصد بھی نظر آتا ہے۔ یہ افواہیں مجھ تک پہنچنے کا سب سے بڑا ذریعہ میرے والد ہیں۔"

"آپ کے والد۔" مائیک نے قدرے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ ریٹائرڈ ڈاکٹر ہیں اور ان کا بیشتر وقت کلب میں یا اِدھر اُدھر لوگوں سے گپ شپ

کرتے ہوئے گزرتا ہے۔ وہ جو کچھ سنتے ہیں آ کر مجھے بتادیتے ہیں۔"

"افواہیں تو میں نے بھی سنی ہیں، مسز ایڈرین!" مائیک بولا

"لیکن وہ افواہیں غلط ہیں۔" ایڈرین نے ان کی نوعیت جانے بغیر کہا۔ "ٹونی کے پاس والٹر کو قتل کرنے کا اگر کوئی مقصد ہوسکتا تھا تو وہ صرف کاروباری نوعیت کا ہوسکتا ہے۔"

"وہ کس طرح۔"

"میرے شوہر نے ٹونی کا کاروبار خرید لیا تھا۔"

"ہاں۔ میں نے سنا تھا کہ ان کے درمیان اس قسم کا کوئی معاہدہ ہوا تھا۔ کیا وہ معاہدہ تسلی بخش ثابت نہیں ہوا تھا۔"

"تنازعہ رقم کا نہیں، بلکہ شرائط کی نوعیت کا تھا۔" ایڈرین نے جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں۔" مائیک نے پلکیں جھپکائیں۔

"شاید آپ کو علم ہو کہ ٹونی ایک ذہین انجینئر ہے لیکن اسے کاروباری ہتھکنڈے نہیں آتے۔ جس طرح اس وقت وہ کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کررہا، اسی طرح میرے شوہر سے معاہدہ کرتے وقت بھی اس نے اپنا کوئی وکیل مقرر نہیں کیا تھا۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے تھے اور اس وقت اسے کوئی قباحت نظر نہیں آرہی تھی بعد میں اسے احساس ہوا کہ معاہدے کی رو سے وہ اپنی ایجادات والٹر کو فروخت کرچکا ہے اور اب ان میں کوئی ترمیم واضافہ کرکے اپنے طور پر انہیں کہیں اور فروخت نہیں کرسکتا۔ البتہ وہ دوسری کوئی بھی چیز ایجاد کرسکتا تھا اور اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا لیکن اسے یہی محسوس ہوا کہ جن ایجادات پر وہ اب تک تکیہ کیے ہوئے تھا وہ کسی دوسرے کے قبضے میں چلی جانے سے اس کے ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ حالانکہ اس نے معاہدے پر پوری رضامندی سے دستخط کیے تھے لیکن اس کے نتائج کا احساس اسے بعد میں ہوا۔ اس نے معاہدہ منسوخ کرنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے میرا شوہر اس پر رضامند نہیں ہوسکتا تھا۔ ہیون موٹر کمپنی مدتوں سے بند پڑی تھی۔ والٹر کو امید نظر آرہی تھی کہ ٹونی کی ایجادات کے سہارے وہ اسے دوبارہ فعال بنانے کی کوشش کرسکتا ہے۔ والٹر کے انکار پر ٹونی نے کئی مرتبہ غم وغصے کا اظہار کیا۔

"پولیس کے خیال میں یہی معاہدہ قتل کا محرک ہے۔" مائیک نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ پولیس کا نقطہ نظر کیا ہے۔"

"بہرحال، اسی معاہدے کی تکمیل کے دوران آپ کی ٹونی سے ملاقات ہوئی ہوگی۔" مائیک نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ ہم دوست بن گئے تھے۔ میرا مطلب ہے، ہم تینوں۔۔۔"

"افواہیں کہتی ہیں کہ اس مثلث میں ٹونی کا کردار آپ کے محبوب کا سا تھا۔"

"یہ غلط ہے۔" ایڈرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ٹونی کی مداح ضرور ہوں لیکن اس کی محبوبہ ہرگز نہیں ہوں۔ میں صرف اس لیے آپ کے پاس آئی تھی کہ مجھے اس کی بے گناہی کا یقین ہے۔ کیا آپ کسی کو بے گناہ سمجھتے ہوئے بھی اسے سزا بھگتتے دیکھ سکتے ہیں؟"

"چند روز پہلے تک میں ایک اور شخص کو بھی بے گناہ سمجھ کر اس کا کیس لڑتا رہا تھا لیکن اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ شاید میں غلطی پر تھا۔" مائیک نے کہا۔

"لیکن میں غلطی پر نہیں ہوں۔"

"اس یقین کی وجہ۔"

"میں نہیں بتاسکتی۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ یہ کیس لڑ سکتے ہیں یا نہیں۔ فیس جتنی آپ طلب کریں گے میں دوں گی۔"

"مسز ایڈرین! مائیک نے میز کے کنارے پر ٹکا ہوا اس کا سپید، نازک ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں موکل در موکل والے طریق کار کا قائل نہیں

ہوں۔ ٹونی جیرک کو اگر میری خدمات کی ضرورت ہے تو وہ خود مجھ سے کیوں بات نہیں کرتا۔"

"میں نے آپ کو بتایا ہے کہ۔۔۔"

"مسز ایڈرین! مائیک نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "جب سے آپ یہاں آئی ہیں، آپ نے درحقیقت مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

ایڈرین نے قدرے خم ہوکر مائیک کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "میں حیران ہوں کہ لوئیس کیوں اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ آپ چہروں سے حقائق پڑھ لیتے ہیں۔"

اس نے اپنا پرس اٹھایا اور دفتر سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد مائیک عجیب سی بے کلی میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی اگلی ملاقات کیفر نامی ایک موکل سے طے تھی لیکن مائیک پوری توجہ سے اس کے ساتھ گفتگو نہ کرسکا اور کیفر بھی اس کی بے توجہی کو محسوس کرتے ہوئے جلد رخصت ہوگیا۔

مائیک نے گھڑی دیکھی اور دفتر سے نکل آیا۔ اس کا رخ بھی مونٹی سیلو کلب کی طرف تھا جہاں اس کے خیال میں اس وقت لوئیس کے والد ونسٹن ہاورڈ کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ مائیک ان سے ملنا چاہتا تھا۔

ونسٹن ہاورڈ حسب معمول کھڑکی کے قریب اپنی مخصوص میز پر موجود تھے۔ جہاں سے باہر کا نظارا بھی کیا جاسکتا تھا۔ وہ بے حد تنہائی پسند انسان سمجھے جاتے تھے۔ تاہم اس وقت انہوں نے مائیک کا استقبال گرم جوشی سے کیا۔ انہوں نے اشارے سے ہیڈ ویٹر کو قریب بلایا اور مائیک سے اس کا تعارف کراتے ہوئے بولے۔ "اس نوجوان کا نام والڈ ہے اور اس کا حافظہ بڑے غضب کا ہے، ابھی اس کا عملی مظاہرہ دیکھنا۔" پھر وہ والڈ سے مخاطب ہوکر بولے۔ "کیوں بھئی، یہ مسٹر مائیک پچھلی مرتبہ کب اس کلب میں آئے تھے۔"

والڈ نے آنکھیں بند کرکے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "غالباً گزشتہ سال اگست میں، میں نے انہیں یہاں دیکھا تھا۔"

"دیکھ لو۔ یہ حال ہے تمہاری بے مروتی کا۔" ونسٹن نے مسکرا کر مائیک کی طرف دیکھا۔۔۔ پھر ہیڈ ویٹر کو اس کے لیے بھی کھانا بھجوانے کا آرڈر دیا۔

"دراصل فرصت ہی نہیں ملتی کہیں آنے جانے کی۔" مائیک نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم صرف ضرورت کے تحت ہی یہاں آتے ہو۔" مسٹر ونسٹن نے کہا۔ سناؤ، آج کون سا مسئلہ درپیش ہے۔"

"میں آپ سے والٹر ہیون کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

مائیک نے نادم ہوئے بغیر کہا۔ "آپ اس کے متعلق جو کچھ بھی جانتے ہوں، مجھے بتا ڈالیے۔"

"دیکھا۔۔۔" مسٹر ونسٹن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔" پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "میں والٹر ہیون سے خاصی حد تک واقف تھا بلکہ اس نے بصد اصرار مجھے اپنی نام نہاد کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بھی شامل کرلیا تھا۔ یہ ایک طرح کی اعزازی رکنیت تھی، مجھے اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ دراصل والٹر اپنے سر پر کسی سیانے کا سایہ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ میں نے بھی اس کا دل رکھنے کو حامی بھر لی تھی۔ اس کا دھیان ویسے کاروبار سے زیادہ سیاست کی طرف تھا۔ بہرحال، جب ٹونی جیرک سے اس کی ایجادات کا سودا کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو سارے ڈائریکٹروں نے زور شور سے اس کی تائید کی تھی۔

"یہاں تک تو مجھے بھی معلوم ہے۔" مائیک نے کہا۔ "میں وہ جاننا چاہتا ہوں جو کچھ آپ نے بل مارکیو کو بتایا ہے۔"

"تم نے بل مارکیو سے اس بارے میں پوچھا تھا کیا" مسٹر ونسٹن چونک کر بولے۔

"نہیں۔۔۔ میں اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور یہ ضروری بھی نہیں کہ وہ بتا دے۔" مائیک نے جواب دیا۔

"ہاں اگر تم نے ٹونی جیرک کی وکالت کا ارادہ کرلیا ہے پھر تو وہ بالکل ہی کچھ نہیں بتائے گا۔" مسٹر ونسٹن بولے۔

"میں ٹونی کی وکالت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" مائیک نے کہا۔

"تو پھر تم کیا اس کی حالت زندگی پر کوئی کہانی لکھنا چاہتے ہو۔" مسٹر ونسٹن نے پوچھا۔

مائیک نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "مسٹر ونسٹن! جو کچھ آپ نے بل مارکیو کو بتایا ہے اگر وہ آپ مجھے نہیں بتا سکتے تو پھر ہمیں اس فضول موضوع کے بجائے دوسرے دلچسپی کے موضوعات مثلاً گولف، بیس بال اور نئی پود کی بے راہ روی پر گفتگو کرنا چاہیے۔"

مسٹر ونسٹن نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔ "بذاتِ خود تم بھی نئی نسل کے ایک گمراہ نوجوان ہو۔۔۔ بہرحال، میں تمہیں اصل واقعات بتاتا ہوں۔" اس نے گلا صاف کر کے کہا۔ "والٹر ہیون چونکہ شروع ہی سے سیاست میں دلچسپی رکھتا تھا چنانچہ ٹونی جیرک سے سودے بازی کرتے وقت بھی اس نے سیاست ہی سے کام لیا۔ کاروباری گفتگو کے دوران میں اس نے ٹونی جیرک کو دعوتیں دیں تحائف دیے اور اپنی بیوی کے حسن کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ میری بات کا کوئی غلط مطلب مت لینا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اس کاروباری گفتگو کے دوران میں ہر ملاقات پر والٹر کی بیوی ایڈرین بھی موجود ہوتی تھی ایڈرین کے ہونٹوں پر ہمہ وقت ایسی مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے جیسی کہ تم نے ٹوتھ پیسٹ کے اشتہارات میں دیکھی ہوگی۔۔۔ ٹونی جیرک بہرحال ایک نوجوان شخص ہے۔ اس کو ہاں کرتے ہی بنی۔ اس نے نہ صرف کمپنی بلکہ اپنی ایجادات کا سودا بھی کرلیا۔ والٹر نے اس موقع پر سیاست سے کام لیتے ہوئے معاہدے میں یہ شق شامل کردی کہ وہ آئندہ کمپنی سے مقابلہ بازی نہیں کرے گا اور کوئی ایجاد نہیں کرے گا۔ ٹونی جیرک اس شق کو ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں سکا۔ اس نے معاہدے پر دستخط کردیے مگر جب اسے پتا چلا کہ اب وہ معاہدے کی رو سے کوئی نئی چیز نہیں بنا سکے گا تو اس نے والٹر سے احتجاج کیا اور معاہدہ تبدیل کرنے کو کہا۔ والٹر نے معاہدہ تبدیل کرنے یا وہ مخصوص شق نکالنے سے انکار کردیا۔ یہ گفتگو والٹر کے گھر میں ہورہی تھی۔۔۔ ایڈرین بھی اس موقع پر موجود تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ بات بڑھ گئی اور ٹونی نے والٹر کے منہ پر مکہ جڑدیا۔ اس کے بعد والٹر ایک ہفتے تک دکھائی نہیں دیا۔ پتا چلا کہ وہ اپنے زخموں کا علاج کرا رہا ہے۔ یا ہوسکتا ہے وہ ٹونی کے ڈر سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہو۔ کیوں کہ ٹونی نے ہاتھا پائی کرنے کے بعد یہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ والٹر نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ وہ واقعی ٹونی سے خوف زدہ ہے۔"

"آپ نے بل مارکیو کو یہی کچھ بتایا ہے۔" مائیک نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔" مسٹر ونسٹن بولے۔ "اس لیے کہ اس نے درخواست کی تھی کہ اگر مجھے اس کیس کی کوئی خاص بات معلوم ہو تو میں اسے اطلاع دے دوں۔"

☆☆☆

پولیس چیف بل مارکیو نے مائیک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ "کیا تم اس کیس کو لے رہے ہو؟"

"نہیں۔" مائیک نے جواب دیا۔

"تو پھر تم سے اس کیس پر تحقیق کرنے کو کس نے کہا ہے۔" بل مارکیو نے پوچھا۔

مائیک نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بل! میں تو اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے ڈیٹرائٹ جا کر ٹونی کو کیوں گرفتار کیا ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی ناقابل تردید ثبوت ہے؟"

"تم نے بزرگوں کی وہ نصیحت سنی ہے جو انہوں نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بارے میں کی ہے۔" بل مارکیو نے اصل بات اڑا کر ایک نئی بات کہی۔

"کیسا گھوڑا؟" مائیک نے سوال کیا۔

"بزرگوں کا کہنا ہے کہ اگر تم گھوڑے کی پیٹھ سے پھسل کر گر جاؤ تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ جاؤ اور ایک بار پھر اس کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کرو۔ گھوڑے سے شکست کھانے کی ضرورت نہیں۔ تم کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہوجاؤ گے۔ مگر میرا اس بارے میں دوسرا خیال ہے گھوڑا اگر اڑیل اور سرکش ہو تو اس پر سوار ہونے کا ارادہ ترک کر کے سواری کے لیے کسی دوسرے گھوڑے کا انتخاب کرلینا چاہیے۔"

مائیک نے منہ بنا کر کہا۔ "اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اس کیس کی تحقیق نہ کروں اور تم سے کوئی سوال بھی نہ کروں تو ناممکن ہے۔ تمہیں اس سوال کا جواب دینا ہوگا۔"

"پتا نہیں تم کس انداز سے سوچ رہے ہو۔" بل مارکیو نے جھلا کر کہا۔ "یہ کیس روز روشن کی طرح صاف ہے۔ سترہ اپریل کی رات والٹر اپنے گھر میں تنہا تھا اور اسے ایک ملاقاتی کا انتظار تھا۔"

"اور اس ملاقاتی نے آ کر اسے ہلاک کردیا۔" مائیک اچانک بول پڑا۔

"ہاں۔۔۔" بل نے جواب دیا۔ "قاتل کمرا مطالعہ کی کھڑکی سے اندر گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس لیے اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مگر اس کے پاؤں گندے تھے اس لیے اس کے جوتے کا نشان قالین پر بن گیا۔ دروازے پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے۔ اندر جا کر اس نے والٹر کو گولی ماری اور چلتا بنا۔ نہایت سادہ سا کیس ہے۔ تم خواہ مخواہ اس میں الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہو۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ملاقاتی ٹونی ہی تھا۔" مائیک نے سوال کیا۔ "ہاں۔" بل بولا۔ "ٹونی غصے سے پاگل ہورہا تھا۔ اس نے پہلے بھی جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ بہرحال اس رات جب وہ مطالعے کے کمرے میں پہنچا تو والٹر وہاں تنہا تھا۔ اس نے پرانی بات دوہرائی اور اس سے معاہدہ تبدیل کرنے کو کہا۔ والٹر نے انکار کیا تو ٹونی نے اسے ہلاک کردیا۔"

"اس سلسلے میں تمہیں کوئی ثبوت ملا؟"

"ہاں۔۔۔ ٹونی کی انگلیوں اور ہاتھوں کے نشانات وہاں کئی جگہ پائے گئے ہیں۔" بل مارکیو نے جواب دیا۔

"اور آلۂ قتل کہاں گیا۔" مائیک نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ شاید ٹونی نے اسے کہیں دفن کردیا ہے۔"

"ٹونی نے اقبال جرم کیا۔" مائیک نے استفسار کیا۔

"نہیں۔۔۔ مگر اس نے یہ اعتراف ضرور کیا ہے کہ وہ اس رات والٹر کے گھر گیا تھا۔ ہمارے لیے ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ دوسرے اعترافات بھی کرے گا۔"

"ٹونی، والٹر کے گھر کیوں گیا تھا۔" مائیک نے سوال کیا۔

"اس کا کہنا ہے کہ وہ کاروباری گفتگو کرنے گیا تھا اور مجھے اس پر یقین ہے۔" بل نے جواب دیا۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔ "مائیک! کیا تم ٹونی کے وکیل ہو؟"

"میں پہلے بتا چکا ہوں کہ نہیں۔" مائیک نے جواب دیا۔ "تو پھر سراغ رسانوں کی طرح سوال و جواب کیوں کررہے ہو۔"

"مجھے اس کیس سے دلچسپی ہوگئی ہے۔" مائیک نے جواب دیا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم اس کیس سے دور رہو۔" بل مارکیو نے ناصحانہ انداز سے کہا۔ "ابھی ابھی تم ایک مقدمہ ہار چکے ہو۔۔۔ اگر تم نے ٹونی کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی تو تمہارے ماتھے پر بدنامی کا ایک اور داغ لگ جائے گا۔"

مائیک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ٹونی کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کررہا ہوں بلکہ محض اپنی دلچسپی کے لیے اصل واقعات معلوم کرنا

چاہتا ہوں۔"

اس دوپہر اس کی بیوی نے اسے جلدی بلایا تھا اس لیے وہ گھر چلا گیا۔ وہ خوش تھا کہ نینسی حسب وعدہ آج اس کی پسندیدہ ڈش تیار کرے گی مگر۔۔۔ اب بھی کوئی بات اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔۔۔ کوئی ایسی بات جو واضح طور پر اس کے تخیل میں تشکیل نہیں پا سکی تھی۔

☆☆☆

نینسی اسے دروازے ہی پر مل گئی۔ اس نے سرگوشی میں اطلاع دی۔ "معاف کرنا مائیک! میں نے اس سے کہا تھا کہ تم واپس آتے ہی کھانا کھاؤ گے مگر وہ بضد تھا کہ۔۔۔"

"کون۔" مائیک نے سوال کیا۔ "تم کس کی بات کر رہی ہو۔"

"انشورنس کمپنی کے مسٹر ریڈ کی۔" نیلسی نے جواب دیا۔

"وہ اس وقت مطالعے کے کمرے میں بیٹھا ہے اور اسی نے کہا ہے کہ وہ کھانے میں مخل نہیں ہوگا۔۔۔ صرف دس منٹ گفتگو کرے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ انشورنس کمپنی کا کوئی نمائندہ میری مطالعہ گاہ میں اس لیے بیٹھا ہے تاکہ میرے ہاتھ کوئی پالیسی فروخت کر سکے۔"

"نہیں مائیک۔۔" نینسی نے جواب دیا۔ "یہ کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے"

"دوسرا معاملہ۔۔۔؟" مائیک نے تعجب سے دوہرایا۔

"اگر وہ اس مقصد سے نہیں آیا تو پھر مجھ سے کیا چاہتا ہے۔۔۔ ٹھہرو، میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔" اس نے مطالعہ گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ہیرالڈ ریڈ سب سے پہلے مائیک سے مصافحہ کرنا چاہتا تھا۔ مائیک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ کسی شکنجے میں دب گیا ہو۔

ہیرالڈ کی طرف دیکھتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ پہلوان ہے اور اس نے اپنا جسم بنانے میں خا[illegible] محنت کی ہے۔ وہ مائیک کی طرف دیکھ کر خا[illegible] کاروباری انداز میں مسکرایا تھا۔ اس کی مسکرا[illegible] ہشت پہلو تھی اور چہرہ ہر زاویے سے مسکراتا معلو[illegible] ہوتا تھا۔ مائیک جانتا تھا کہ یہ خالصتاً کاروبا[illegible] مسکراہٹ ہے جو انشورنس ایجنٹ اپنے شکار کو پھا[illegible] وقت ہونٹوں پر سجا لیتے ہیں۔

ہیرالڈ نے کہا۔ "مسٹر مائیک! آپ غلط [illegible] میں ملٹی فوڈ لائف انشورنس کمپنی کی کوئی پالیسی فرو[illegible] کرنے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں تو آج کل [illegible] ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا ہوں۔"

"لیکن میں نے تو تمہاری کمپنی سے کسی [illegible] کلیم نہیں کیا ہے۔" مائیک بولا۔

"آپ نے نہیں مگر والٹر ہیون نے تو [illegible] ہے۔" اس نے کہا۔ مائیک کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس [illegible] سادہ سے لہجے میں کہا۔ "میں والٹر نامی کسی شخص [illegible] واقف نہیں ہوں۔"

"میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جس کا [illegible] گزشتہ دنوں ہوا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جس کا کاروں کا کاروبا[illegible] ہے۔" مائیک نے بھنویں سکیڑ کر دریافت کیا۔

ہیرالڈ نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں مذاق ختم کر دینا چاہیے۔ آپ وا[illegible] کو جانتے ہیں اور اس کی بیوہ سے بھی واقف ہیں۔۔۔ آپ کی پیاری بیوی کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔۔۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں اصل مدعا بیان کروں۔"

مائیک نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ایڈرین ہیون آج دوپہر آپ کے پاس کیوں آئی تھی۔" اس نے براہ راست ایک غیر متو[illegible] سوال کیا۔

"کیا۔۔۔؟" مائیک نے چونک کر کہا۔

"آج دوپہر وہ آپ کے دفتر گئی تھی جہاں ا[illegible]

[illegible] کافی وقت گزارا ہے۔ ہم ایک خاص مقصد سے [illegible] کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا [illegible]ہوں کہ وہ آپ سے کیوں ملنے گئی تھی؟"

"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے۔" مائیک نے [illegible]اری سے کہا۔ "برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔" [illegible]الڈ مسکرایا۔ "اچھا یہ بتا دیجیے کہ آپ کس کی طرف [illegible]یں۔"

"میں کسی کی طرف بھی نہیں ہوں۔" مائیک [illegible]ولا۔

"بہت خوب۔ پھر تو آپ ہماری بات سنیں [illegible]۔ دراصل یہ پالیسی بہت لمبی ہے اور ہمیں کافی [illegible] پھونک کر قدم اٹھانا پڑ رہا ہے۔"

"کس کی پالیسی؟" مائیک نے پوچھا۔

"والٹر ہیون کی پالیسی جو اس کی بیوہ ایڈرین [illegible]کے نام ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "قاتلوں کو رقم ادا [illegible]کرتے وقت ہمیں بہت کوفت ہوتی ہے۔ اس [illegible]صورت میں تو کچھ زیادہ ہی محتاط ہونا چاہیے جب کہ [illegible]معاملہ پچاس لاکھ ڈالر کا ہو۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایڈرین اپنے شوہر [illegible] قاتل ہے۔" مائیک نے استفسار کیا۔

"اس صورت میں اور کیا سوچا جا سکتا ہے جب کہ وہ پالیسی اسی کے نام ہے۔" ہیرالڈ بولا۔ "مزید [illegible] کہ ٹونی جیرک کا معاملہ ہے۔ اس پر شبہ کرنے کی [illegible]ت سی وجوہات ہیں، مثال کے طور پر ایڈرین کو [illegible]نے شوہر سے قطعاً محبت نہیں تھی۔ وہ ایک مفلوک [illegible]ال لڑکی تھی اور اس نے والٹر سے محض اس کی دولت [illegible]کے لیے شادی کی تھی۔"

مائیک نے کہا۔ "مسٹر ہیرالڈ! تم خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ ایڈرین میری موکلہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اس کیس سے کوئی دلچسپی ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس وقت بہت بھوکا ہوں اور مجھ میں مزید کوئی بات سننے کی بھی تاب نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔"

ہیرالڈ بولا۔ "آپ کے اس دوست۔۔۔ جو کہ محکمہ پولیس میں ہے، اس نے یہ اطلاع دی ہوگی کہ والٹر کا قتل اس کی بیوی نے نہیں کیا ہے کیوں کہ وہ واردات کے وقت وہاں موجود نہیں تھی۔۔۔ مگر یقین کیجیے جب یہ کیس عدالت میں جائے گا تو ان چیزوں کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔"

مائیک اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری اطلاعات کا بہت شکریہ مسٹر ہیرالڈ! میں اب مزید وقت نہیں دے سکتا۔"

"اگر یہ بات کسی طرح ثابت ہو جائے کہ قاتل والٹر کی بیوہ ہے تو ہماری کمپنی کو پچاس لاکھ ڈالر ادا نہیں کرنا پڑیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ بات میں ثابت کروں۔" مائیک نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ خوامخواہ برہم ہو رہے ہیں۔" ہیرالڈ پھر مسکرایا۔ "اسے آپ رشوت یا غیر قانونی کام کیوں تصور کرتے ہیں۔ یہ تو سراسر ایک عدالتی داؤ پیچ ہے۔ اگر آپ اس میں جیت گئے تو ہم آپ کو انعام دیں گے۔ پورے بیس ہزار ڈالر۔"

مائیک نے تیوریاں چڑھائیں تو ہیرالڈ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے گھر کا فرنیچر پرانا ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے وقتاً فوقتاً تبدیل کرتے رہنا چاہیے۔"

مائیک جب کھانے کی میز پر بیٹھا تو صبح سے چبھنے والا سوال پوری وضاحت سے اس کے ذہن میں آ گیا۔۔۔ ایڈرین ہیون اس پر بضد کیوں تھی کہ ٹونی جیرک بے گناہ ہے۔

☆☆☆

لوئیس اور فل نے اس بار مائیک اور اس کی بیوی نینسی کے علاوہ ایڈرین اور اس کے والد ایلڈن کائل کو بھی مدعو کیا تھا۔ کھانے کی بعد لوئیس عمدہ سا بہانا بنا کر مائیک کو اپنی مطالعہ گاہ میں لے گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایڈرین بھی وہیں آ گئی۔ مائیک کو علم تھا کہ لوئیس

نے یہ منصوبہ پہلے سے ترتیب دے رکھا ہوگا۔ ایڈرین سے اس کی ملاقات اتفاقیہ نہیں ہوسکتی۔

"حسن اتفاق سے آج ہم پھر اکٹھا ہوگئے ہیں۔" مائیک نے ایڈرین سے کہا۔

"ہاں۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" ایڈرین بولی۔

"ٹونی جیرک وکیل کرنے پر تیار ہوگیا؟" مائیک نے سوال کیا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے اپنی پرواہی نہیں ہے یا ہوسکتا ہے، اسی لیے بے فکر ہو کہ وہ بے گناہ ہے۔"

"تمہیں اب بھی اس کی بے گناہی پر یقین ہے۔" مائیک نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔" ایڈرین نے جواب دیا۔

"تو پھر وہ میری خدمات کیوں نہیں حاصل کرتا۔ اسے یہ حق ہے کہ وہ کسی بھی وکیل کی خدمات حاصل کرسکتا ہے۔"

"اگر تم اس سے گفتگو کرو تو مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری خدمات ضرور حاصل کرے گا۔" ایڈرین بولی۔

مائیک کو دفعتاً بل مارکیو کی بات یاد آئی تو اس نے کہا۔ معاف کرنا ایڈرین میں اس معاملے میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"کیوں؟" ایڈرین نے بھنویں سکیڑیں۔ "شاید تم خوف زدہ ہو کہ تم ہار جاؤ گے۔"

"دنیا میں کوئی شخص اپنی شکست کو پسند نہیں کرتا۔"

"لوئیس نے کہا تھا کہ تم بہت اچھے آدمی ہو۔" ایڈرین چیخ کر بولی۔ "مگر انصاف اور قانون کی سربلندی کے بجائے تمہیں اپنی جیت اور ہار کی پڑی ہوئی ہے۔"

"ہوسکتا ہے ٹونی کے بارے میں جو افواہیں گردش کر رہی ہیں، وہ صحیح ہوں۔" مائیک نے کہا۔ "ممکن ہے، وہی مجرم ہو۔"

"وہ مجرم نہیں ہے۔ یہ قتل اس نے نہیں کیا ہے۔" ایڈرین نے روہانسی آواز میں کہا۔ "والٹر نے خودکشی کی ہے۔"

"کیا واقعی۔" مائیک نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" ایڈرین بولی۔ "میں نے اسے مطالعے کے کمرے میں مردہ دیکھا تھا۔"

"مگر وہاں سے کوئی ایسا ثبوت حاصل نہیں ہوا جس کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا جاسکے۔"

"ایسے ثبوت وہاں سے ہٹا دیے گئے تھے۔" ایڈرین بولی۔ "اور یہ کام میں نے کیا تھا۔"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ مائیک کو گھڑی کی ٹک ٹک واضح طور پر سنائی دینے لگی۔

"ایڈرین۔۔۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ مائیک نے مڑ کر دیکھا۔ ایڈرین کا باپ ایلڈن کائل کھڑا کہہ رہا تھا۔ "تم ٹھیک ہو نا بے بی!"

"ہاں۔ ڈیڈی!"

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔" ایلڈن نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ایڈرین کے شانے پر رکھ دیا۔

"میں ٹھیک ہوں، ڈیڈی!" ایڈرین نے دوبارہ کہا

مائیک نے اس کے چہرے پر پسینہ دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ "پینے کے لیے کوئی چیز لاؤں ایڈرین۔" مائیک نے پوچھا۔

"میں اس کا علاج جانتا ہوں۔" ایلڈن نے کہا۔ "ٹھہرو، زحمت نہ کرو۔" اس نے ایڈرین سے پوچھا۔ "ڈارلنگ! تم اپنی پلز تو لائی ہو، نا؟"

ایڈرین نے سر اثبات میں ہلایا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی اور چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا تھا

☆☆☆

اتوار کی صبح مائیک نے ملٹی فورڈ لائف انشورنس کمپنی کو فون کیا اور ان سے ہیرالڈ کا نمبر مانگا۔ ہیرالڈ کا نمبر ملانے پر اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک بستر پر

...ا اٹھا۔ "ہیلو۔" اس نے غنودہ آواز میں کہا تھا۔

"میں مائیک بول رہا ہوں۔"

ہیرالڈ نے چوکنا آواز میں پوچھا۔ "اس وقت ...رنے کا کیا مقصد ہے۔ کیا تمہیں میری پیش کش ...ور ہے۔"

"میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی ...لٹر نے پچاس لاکھ کی پالیسی لے رکھی تھی اور کب ...؟"

"جب سے اس نے ایڈرین سے شادی کی ...ی۔" ہیرالڈ نے جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے اس ...ہ پہلے اپنا بیمہ کرا کے اس نے پالیسی اپنی بیوی ...دی تھی۔"

"اس وقت والٹر کی صحت کیسی تھی۔" مائیک ...سوال کیا۔

"بالکل ٹھیک۔" ہیرالڈ نے جواب دیا۔ "...ین مسٹر مائیک! آپ کس بات کی تفتیش کر رہے ...یں۔"

"وہ شخص جس نے پالیسی لی ہے اگر خودکشی ...لے تو۔" مائیک نے اس کا سوال نظر انداز کر کے ...پوچھا۔

"اگر اس نے دو سال کے اندر اندر یہ حرکت کی تو ہم اس کے جمع شدہ پریمیم کی رقم ادا کریں ...گے۔"

"یہ صورت اگر والٹر کے ساتھ ہو تو۔" مائیک ...سوال کیا۔

"کیا آپ کے دماغ میں کچھ خلل واقع ہوگیا ...ہے مائیک!" ہیرالڈ نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کے متعلق تو یہ مشہور ہے کہ آپ بے حد ...روشن دماغ اور ذہین ہیں۔"

"چھٹی کے دن عموماً میرا دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔" مائیک نے کہا۔ "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"اس صورت میں ہم اسے پچاس لاکھ ڈالر کی ...بجائے محض چند ہزار ڈالر ادا کریں گے۔" ہیرالڈ نے جواب دیا۔

مائیک نے مزید کوئی سوال کیے بغیر ریسیور رکھ دیا اس کے دماغ میں ایک نیا سوال برچھی کی مانند چبھ رہا تھا کہ والٹر نے خودکشی کیوں کی۔ اپنی موت سے اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

اس روز مائیک نے ایڈرین سے ملاقات کی تو اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ ایڈرین نے گہرا میک اپ کر رکھا تھا اور اس کے ہونٹوں سے ایک شگفتہ مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ "مسٹر مائیک! میں صحیح کہہ رہی ہوں کہ اس رات جب میں گھر میں داخل ہوئی تو میں نے والٹر کو مردہ پایا تھا اس نے خودکشی کی تھی مطالعہ گاہ میں روشنی تھی اور اس کا ریوالور قریب ہی پڑا تھا نیز اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔"

"مگر ریوالور کی موجودگی اس بات کا ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ والٹر نے خودکشی کی تھی۔" مائیک نے کہا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے خودکشی کی تھی کیونکہ اس نے میرے نام ایک معذرتی خط بھی تحریر کیا تھا۔" ایڈرین بولی۔ "وہ تحریر میں نے آتش دان میں ڈال دی اور کاغذ راکھ ہوجانے کے بعد اسے سلاخ سے برابر کردیا۔ پھر میں نے ریوالور اٹھا کر اپنی خواب گاہ میں رکھ لیا پہلے مجھے ڈر تھا کہ کہیں پولیس گھر کی تلاشی نہ لینے لگے۔ مگر شاید انہوں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔"

"وہ ریوالور اب کہاں ہے؟" مائیک نے پوچھا۔

"میں نے اسے ایک نالے میں پھینک دیا تھا۔"

"کون سے نالے میں اور کس جگہ؟"

"یہ تو مجھے یاد نہیں رہا۔" ایڈرین نے جواب دیا۔

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا۔"

"تاکہ پولیس یہ فرض کرلے کہ یہ کسی معمولی چور کا کارنامہ ہے میں نے دونوں ثبوت ضائع

کردیے اور کمرے کی چیزوں کو الٹ پلٹ کردیا ہمارے گھر میں اس سے پہلے بھی دو بار چوری ہو چکی تھی چنانچہ پولیس کو یہ مفروضہ قائم کرتے دیر نہ لگی کہ یہ کسی چور ہی کی حرکت ہے۔"

"مگر پولیس نے ٹونی کو پکڑ لیا کیوں کہ اس رات وہ بھی تمہارے گھر آیا تھا۔" مائیک بولا۔ "جب کہ بیمہ کمپنی کا خیال ہے کہ یہ قتل تم نے کیا ہے تاکہ تم پچاس لاکھ ڈالر حاصل کرسکو۔"

ایڈرین نے اتنے زور سے سانس کھینچی کہ مائیک کو اس کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "یہ قتل میں نے نہیں کیا۔"

"مگر تمہیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ والٹر کی خودکشی کو تم نے قتل کا رنگ اسی لیے دیا تھا کہ تم بیمے کی رقم حاصل کرلو۔"

ایڈرین کچھ نہ بولی اور پاؤں کے انگوٹھے کو قالین پر رگڑنے لگی۔

"میرا خیال ہے تم معاملات کو یونہی رہنے دو۔ مائیک بولا۔ "ٹونی کو پھانسی ہو جائے گی اور تمہیں بیمے کی رقم مل جائے گی۔"

"میں ایک بے گناہ شخص کو پھانسی کے پھندے پر نہیں دیکھ سکتی۔"

"اگر تمہیں ٹونی کا اتنا ہی خیال تھا تو تم نے اس کے گرفتار ہوتے ہی پولیس کو یہ کیوں نہیں بتا دیا کہ والٹر نے خودکشی کی ہے۔"

"میں بیمے کی رقم حاصل کرنا چاہتی ہوں اور ٹونی کی رہائی بھی چاہتی ہوں۔" ایڈرین نے کہا۔ "اسی لیے میں تمہارے پاس آئی تھی کہ شاید تم کوئی راہ نکال لو۔" گفتگو کے دوران میں اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں اور ہاتھ میں رعشہ سا پیدا ہونے لگا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، ایڈرین۔" مائیک نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں کوئی چیز دوں۔"

"نہیں۔" ایڈرین بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ میرے لیے اس وقت کون سی چیز فائدہ مند ہے۔"

"وہی پلز۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے بے جان مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ میں گولی کھالوں گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔"

☆☆☆

پولیس چیف بل مارکیو سے جب مائیک نے خیال ظاہر کیا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ والٹر نے خودکشی کی ہے۔"

"ہاں۔" مائیک نے جواب دیا۔

"کیا اس لیے کہ یہ بات ایڈرین نے کہی ہے۔" بل نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"تمہیں شاید ابھی تک یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔" بل بولا۔ "وہ چاہتی ہے کہ ٹونی کی کھال محفوظ رہے۔"

"مگر ٹونی بے گناہ ہے اگر اسے بچا لیا جائے تو کیا حرج ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔" بل غرایا۔

"پھر۔۔۔" مائیک نے سوال کیا۔ "تم ابھی تک اس بات پر جمے ہوئے ہو کہ ایڈرین اور ٹونی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"ایک میں ہی کیا شہر میں تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں۔" بل نے کہا۔ "جب کہ تمہاری سوچ سب سے نرالی ہے۔"

"بہر حال، مجھے اس کی بات پر یقین ہے۔" مائیک کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"مگر کیوں۔۔۔؟" بل نے چڑ کر سوال کیا۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے۔ ایڈرین نے کوئی ثبوت پیش کیا۔"

"نہیں۔" مائیک نے جواب دیا۔

"وہ ریوالور کہاں ہے جس سے والٹر نے خودکشی کی تھی۔"

"میں، تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایڈرین نے اسے کسی نالے میں پھینک دیا تھا۔"

"اور والٹر نے خودکشی سے پہلے جو تحریر چھوڑی تھی اسے ایڈرین نے جلا دیا۔" بل نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "اس کہانی پر کیسے یقین آسکتا ہے۔ مائیک! اچھا یہ بتاؤ کہ والٹر نے خودکشی کیوں کرلی۔ کیا وہ بیمار تھا؟ اس کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا؟ ذہنی طور پر کسی اذیت میں مبتلا تھا یا کسی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔"

"میں اس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں۔" مائیک بے بسی سے بولا۔ "ہوسکتا ہے اس نے اس لیے خودکشی کی ہو کہ اس کی ازدواجی زندگی۔۔۔"

"تم نے لوگوں کو اس سے بھی خراب ازدواجی زندگی گزارتے دیکھا ہوگا مائیک!" بل نے کہا۔

"کیا ایسے لوگ خودکشی کر لیتے ہیں؟" اس نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ کہا۔ "پولیس آنکھیں بند نہیں بیٹھی ہے مائیک! ہم نے والٹر ہیون کی زندگی کی ہر بات کا سراغ لگالیا ہے۔ ایسے افراد خودکشی نہیں کرسکتے۔ والٹر کے پاس اتنی دولت۔۔۔ حتیٰ کہ وہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے کافی عرصے تک زندگی گزار سکتا تھا۔

اس نے نیا کاروباری معاہدہ کیا تھا جس پر عمل کر کے وہ مزید دولت پیدا کرسکتا تھا اس کی زندگی ہر طرح سے امنگوں اور امیدوں سے پُر تھی۔ گزشتہ چند سالوں سے وہ سیاست میں بھی حصہ لینے لگا تھا اور لوگوں سے مزاحاً کہا کرتا تھا کہ وہ مونٹی سیلو کا آئندہ گورنر بننے جا رہا ہے۔ اسے خودکشی کرنے کی کیا ضرورت تھی مائیک!"

یہ اچھا سوال تھا اور مائیک کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

ٹونی جیرک نے مائیک کو ملاقاتیوں کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو کہا۔ "مسٹر قانون داں، میں نے تو تمہیں یہاں نہیں بلایا تھا۔"

"میں خود یہاں آیا ہوں۔" مائیک بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ ایڈرین نے تمہیں یہاں بھیجا ہے حالانکہ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں یہ حماقت ہے۔" مائیک بولا۔ "اگر تم کسی وکیل کی خدمات حاصل کر کے یہاں سے رہائی پالو تو کیا حرج ہے؟"

"مجھے جیل میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔" ٹونی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

مائیک نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک خوبرو نوجوان ہے صف نازک اس پر جان دیتی ہوں گی۔ اس نے کہا۔ "ٹونی اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بتاؤ کہ اس رات کیا ہوا تھا؟"

"میں عدالت کی طرف سے مقرر کیے گئے وکیل کو تمام باتیں بتا چکا ہوں۔" ٹونی جیرک بولا۔ "بہر حال تم بھی سن لو کہ اس رات کیا ہوا تھا۔ ایڈرین تمہاری بہت تعریفیں کرتی ہے اس لیے میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا مگر ماچس کی تلاش میں اپنی جیبوں کو مایوسی سے تھپ تھپا کر رہ گیا۔ جیل کے قوانین کی رو سے اسے ماچس رکھنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی مگر اسے سگریٹ ہونٹوں سے لگائے دیکھ کر ایک محافظ نے بڑھ کر ماچس جلائی اور اس کا سگریٹ سلگا دیا۔ ٹونی نے ایک طویل کش لے کر منہ سے دھواں خارج کیا اور مائیک کو نیم باز نگاہ سے دیکھتا ہوا بولا۔ "تم نے دیکھا یہاں میری کتنی خدمت ہو رہی ہے۔ میں یہ جگہ چھوڑ کر کیوں جاؤں؟"

"اس رات کیا ہوا تھا ٹونی!" مائیک نے اپنا سوال دوہرایا۔

"ہاں۔۔۔ اس رات تم اسے میری بدقسمتی کہہ لو، تمہیں اس سودے بازی کا تو علم ہو گیا ہوگا جو میرے اور اس۔۔۔" اس نے والٹر کو مغلظات سے

نوازا۔ ”معاہدہ کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی بیوی کو بھی۔۔۔“ ٹونی نے والٹر کی ماں کی شان میں گستاخی کی۔

”تم ایڈرین کو پسند کرتے ہو ٹونی!“ مائیک نے سوال کیا۔

”پسند۔۔۔؟“ ٹونی حلق پھاڑ کر ہنسا۔ ”سارا شہر جانتا ہے کہ میں اس پر جان دیتا ہوں۔ والٹر اگر یوں نہ مرتا تو شاید ایڈرین کے سلسلے میں یہ میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”مگر میں یہ کام نہایت ہوشیاری سے کرتا۔ ایسے نہیں جیسے کہ پولیس سمجھتی ہے۔ میں نے والٹر کے گھر پہنچ کر اس کی کنپٹی میں گولی ماری اور پھر ہر جگہ اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ کر چلا آیا تا کہ پولیس مجھے گرفتار کر لے۔ مسٹر قانون داں کیا میں صورت سے ایسا احمق دکھائی دیتا ہوں۔“

”تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم وہاں کیوں گئے تھے۔“

”میں اس سے کاروباری گفتگو کرنے گیا تھا۔“ ٹونی بولا۔

”اس نے معاہدے میں ایسی شق شامل کر دی تھی جس کی رو سے میں نئی ایجادات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں والٹر ہی کی کمپنی میں کام کروں۔ وہ بلاشبہ مجھے اچھی تنخواہ دیتا۔“

”کیا مطلب؟“ مائیک حیرت سے اچھل پڑا۔

”میں اپنا کام کرنے کے بجائے والٹر کا کام کرنا چاہتا تھا۔“ ٹونی نے جواب دیا۔ ”میں نے والٹر کو اطلاع دی کہ میں اس سے گفتگو کرنے آ رہا ہوں۔ میں تقریباً ساڑھے آٹھ، نو بجے اس کے گھر پہنچا چونکہ مطالعے کے کمرے میں روشنی تھی اس لیے میں سمجھ گیا کہ وہ موجود ہے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے دروازے کو کھولا تو اسے یوں پڑے پایا۔“ ٹونی نے آنکھیں بند کر کے سر جھکایا تو محافظ اس کی طرف بڑھا۔ ٹونی نے آنکھیں کھول کر اسے اشارہ کیا۔ ”ٹھہرو۔۔۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں قانون داں کو ذرا تفصیل سے سمجھا رہا تھا۔“

محافظ پیچھے چلا گیا۔

ٹونی دوبارہ بولا۔ ”اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ مر چکا تھا اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور ریوالور اس کی انگلیوں کے پاس پڑا تھا۔ کمرے میں کاغذ ہی کاغذ بکھرے ہوئے تھے اور اس کے ایک ہاتھ کے نیچے بھی کاغذ دبا ہوا تھا۔ شاید خودکشی کرنے سے پہلے وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا۔“

”تم نے دیکھا، اس کاغذ پر کیا لکھا تھا؟“ مائیک نے سوال کیا۔

”نہیں۔۔۔“

”آتش دان اس وقت جل رہا تھا؟“ مائیک نے پوچھا۔

”ہاں اس میں سے لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔“

”پھر تم نے کیا کیا ٹونی؟“ مائیک نے استفسار کیا۔

”میں کیا کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ اٹھا۔“ ٹونی نے جواب دیا۔

”کیوں۔۔۔؟ تم وہاں رہ کر پولیس کو اطلاع بھی تو دے سکتے تھے۔“ مائیک بولا۔

”بالکل یہی بات عدالت کے وکیل نے بھی کہی تھی مگر میں وہاں کیوں رکتا؟ کیا پولیس مجھے گولڈ میڈل دیتی؟“

”گولڈ میڈل سے نہ نوازتی مگر تم آج جیل میں نہ ہوتے۔“

ٹونی نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ”تم جانتے ہو اب تک میرا کتنے پولیس والوں سے سابقہ پڑا ہے۔ سینکڑوں سے۔ میں نے ان کے قریب رہ کر ایک ہی بات سیکھی ہے جہاں تک ممکن ہو ان سے دور رہو۔ ان کا داؤ چلتا ہے تو یہ اپنے باپ کو بھی نہیں

بخشتے بس میں اسی لیے وہاں سے فرار ہو گیا تھا اور حتی الامکان اپنے ہاتھ صاف رکھنا چاہتا تھا۔“

”مگر اس کے بجائے تمہارے ہاتھ اس کیس میں آلودہ ہو گئے۔“

”ہاں۔ میں اتنی جلدی میں تھا کہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے نشانات بھی نہ مٹا سکا تم خود سوچو اگر میں والٹر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا کر اس کے گھر جاتا تو کیا ایسے تمام ثبوت ضائع کرنے کی کوشش نہ کرتا جن سے پولیس میری موجودگی وہاں ثابت کر رہی ہے۔“

”لیکن وہاں سے بھاگ کر تم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔“ مائیک بولا۔

”دوسری سب سے بڑی غلطی۔۔۔“ ٹونی نے تصحیح کی۔ ”پہلی غلطی والٹر سے معاہدہ کرنا ہے۔“

”تو تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ والٹر نے خودکشی کی ہے۔“ مائیک نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر میں نے وہ رقعہ نہیں دیکھا جو والٹر نے لکھا تھا۔“

”تم کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہو کہ والٹر نے خودکشی کیوں کی؟ کیا وہ اپنی زندگی سے عاجز تھا۔“

”وکیل صاحب! آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔“ ٹونی مضحکہ خیز لہجے میں بولا۔ ”والٹر اور اپنی زندگی سے ناخوش۔۔۔؟ اس کے پاس موٹروں کی کمپنی تھی اور آئندہ اس کے گورنر بننے کے امکانات تھے۔ وہ اپنی زندگی سے ناخوش کیوں ہونے لگا۔۔۔ نہیں۔“

☆☆☆

فل تھکے تھکے سے انداز مائیک کے آفس میں داخل ہوا اور ایک صوفے پر گر گیا۔

”والٹر نے خودکشی کیوں کی۔“ اس نے توقف سے کہا۔ ”اور جب تک اس کے محرکات معلوم نہ ہوں ہم کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

”تو خیال ہے کہ ایڈرین ہمیں غلط راہ پر ڈال رہی ہے۔“

”بعض افراد بہت لیے دیے رہتے ہیں اور اپنے حالات دوسروں پر ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔“ مائیک بولا۔ ”ہو سکتا ہے والٹر بھی اس قسم کا آدمی ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ فل بولا۔ ”مگر بظاہر والٹر کسی مصیبت میں گھرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔“

دفعتاً انٹر کام پر مائیک کی سیکریٹری جین نے اطلاع دی کہ ایڈرین اس سے گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ مائیک نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔

”میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق اپنے شوہر کے تمام کاغذات اکٹھا کر لیے ہیں۔“ دوسری طرف سے ایڈرین بولی۔ ”مگر مجھے ان میں ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی جس سے اس کے قتل ہونے میں مدد مل سکے۔“ اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔ ”تم چاہو تو خود انہیں ایک نظر دیکھ لو۔ تمام کاغذات کاروبار اور سیاست سے متعلق ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ مائیک بولا۔ ”میں اور فل ایک گھنٹے بعد تمہارے پاس آ رہے ہیں۔“ اس نے ریسیور رکھا اور فل سے بولا۔ ”اپنے جوتے دوبارہ پہن لو۔۔۔ ہم ایڈرین سے ملنے جا رہے ہیں۔“

ایڈرین کا گھر پہلے کی طرح بے ترتیب نہیں تھا۔ اس وقت ہر چیز صاف ستھری اور گرد سے مبرا دکھائی دی۔ ایڈرین نے ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد کہا۔ ”مجھے یہ کاغذات اور فائلیں اس کی الماری کی نچلی دراز سے ملی ہیں انہیں دیکھ لو، شاید کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔“

مائیک نے میز پر پڑا ہوا پلندہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”یہ کاغذات تو تقریباً چار یا پانچ سال پرانے لگ رہے ہیں۔ بہر حال ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کاغذات والٹر کی سیاسی سرگرمیوں سے متعلق ہیں اور ہمیں اس کی زندگی کے اس پہلو سے بھی واقف ہونا چاہیے۔“

مائیک کاغذات الٹنے پلٹنے لگا تو فل نے ایڈرین سے پوچھا۔ ”والٹر سے تمہاری شادی کیسے ہوئی تھی؟ کیا وہ اس سلسلے میں تم سے خود ملا تھا۔“

”نہیں۔“ ایڈرین بولی۔ ”میرے والد نے والٹر سے میرا تعارف ایک دعوت میں کرایا تھا اور شادی کی پیش کش بھی والٹر نے خود ہی کی تھی۔“

مائیک نے کاغذات کے درمیان سے ایک دعوتی کارڈز نکال کر کہا۔ ”یہ جو کے دوست کون ہیں۔“

ایڈرین نے شانے ہلا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

فل نے کارڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کارڈ پر آنے والے دن کی تاریخ پڑی ہے اور یہ ابھی کارآمد ہے شاید اسی لیے والٹر نے اسے حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔

”یہ موسیقی کی تقریب کا دعوت نامہ ہے۔“ مائیک بولا اس پر تحریر ہے کہ اگر آپ پیانو سننے کا ذوق رکھتے ہوں تو اس تقریب میں شرکت کیجیے۔ ہم بیتھوون کی موسیقی پیش کریں گے۔ ۲۴ اگست، رات ساڑھے آٹھ بجے برائے مہربانی شرکت کے وقت یہ کارڈ اپنے ساتھ ضرور لائیں۔ آپ کے گلے میں سیاہ ٹائی اور جیب میں عطیہ بھی ہونا ضروری ہے ۹۹۔ سینٹ اینڈریو ایونیو جو کے دوست۔

فل نے ایڈرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”والٹر کو موسیقی کا شوق کب سے تھا۔ میرا خیال ہے وہ ایسی کسی تقریب میں شرکت نہیں کرتا تھا۔“

ایڈرین نے جواب دیا۔ ”والٹر کبھی کبھار ایسی تقریبات میں شرکت کرتا تھا مگر اسے موسیقی سے زیادہ شغف نہیں تھا۔“

”لیکن اس نے کارڈ کو اتنی احتیاط سے رکھا ہوا ہے جیسے وہ اس تقریب میں شرکت کا متمنی تھا اس تقریب کی ضرور کوئی اہمیت ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں اس تقریب میں شرکت کر کے دیکھے لیتا ہوں۔“ فل بولا۔ ”تمہارا تجسس بھی ختم ہو جائے گا۔“

”لیکن کارڈ صرف ایک شخص کے لیے ہے اس میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ اپنے دوستوں کو بھی ہمراہ لایے۔“ مائیک بولا۔

”میں اس تقریب میں تنہا شرکت کروں گا۔“ فل بولا۔

”مگر کارڈ تو میرے شوہر کے لیے تھا آپ اس تقریب میں کیسے شرکت کریں گے۔“ ایڈرین بولی۔

”اس دعوت نامے پر والٹر کا نام نہیں لکھا ہے۔“ فل نے دعوت نامہ الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ ”اور میں اپنے ساتھ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں لے جاؤں گا جس سے میری شخصیت پر روشنی پڑ سکے۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”میں اس تقریب میں والٹر کی حیثیت سے شرکت کروں گا۔“

سینٹ اینڈریو ایونیو میں تمام مکانات پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ مکان نمبر ۹۹ دومنزلہ تھا اس کی نچلی منزل کی کھڑکیاں اوپری منزل کے مقابلے میں لمبی تھیں۔ عمارت کی طرف دیکھتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ پُراسرار سی عمارت ہے۔ تمام کھڑکیوں پر سرخ پردے پڑے تھے اور ان کے عقب میں بے حد دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔

عمارت کے دروازے پر جہاں اطلاعی گھنٹی لگی تھی ایک تختی پر خوب صورت سا پیانو بنا تھا اور ”فیری جو“ لکھا تھا۔

فل نے رین کوٹ کے نیچے ابھری ہوئی سیاہ ٹائی کو چھوا۔ اپنے بالوں پر مضطربانہ ہاتھ پھیرا اور پھر گھنٹی کے پش بٹن پر انگلی رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور فل جیسے ایک شخص نے شکل دکھائی۔ اس شخص نے تقریباً فل جیسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دراز قد آدمی تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھوس معلوم ہوتے تھے اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے اور ناک توتے کی چونچ کی مانند مڑی ہوئی تھی۔

فل کا خیال تھا کہ وہ فیری جو کے پاس کام کرنے سے پہلے ضرور باکسنگ کرتا ہوگا۔

”جناب آپ کا دعوت نامہ؟“ اس شخص نے نرم اور شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ رہا۔“ فل نے اس کی طرف کارڈ بڑھایا۔

”معاف کرنا مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ دراصل یہاں کی تمام عمارتیں ایک جیسی ہیں اس لیے یہ مکان تلاش کرنے میں۔۔۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے جملہ قطع کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ سب سے بعد میں آئے ہیں مگر تردد کا شکار نہ ہوں۔ مسٹر فیری نے ابھی اپنا پروگرام شروع نہیں کیا ہے۔ اندر تشریف لایے۔“ وہ ایک طرف ہٹتا ہوا بولا۔

فل چھوٹے سے ہال میں پہنچا تو خادم نے دروازہ بند کر دیا۔ اس ہال میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ خادم اسے وہاں سے کلرک روم میں لے گیا اور پھر اس نے نہایت ادب سے اس کا کوٹ اتارا۔

”برائے مہربانی اپنا نقاب پہن لیجیے، جناب!“ خادم نے کہا۔

”کیا۔“ فل نے حیرت سے سوال کیا۔

”نقاب۔۔۔ کیا آپ اپنا نقاب نہیں لائے؟“

فل مسکرایا اور کوئی عمدہ اور دلچسپ سی بات کہنے والا تھا کہ اس کی نگاہ خادم پر پڑی۔ خادم انتہائی سنجیدہ تھا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”نہیں۔“ فل بولا۔ ”میں اپنا نقاب نہیں لایا ہوں۔“

خادم کی آنکھیں بھینچ گئیں اور وہ کچھ سوچنے لگا۔

”آپ یقیناً مسٹر فیری کے پرانے کرم فرما ہوں گے۔“ خادم نے سوال کیا۔

”آہ۔۔۔ ہاں۔“ فل نے مختصراً کہا۔

”مسٹر فیری نے آپ کو نقاب لانے کی ہدایت نہیں کی تھی۔“ خادم نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں کہا تو تھا مگر میری حماقت کہ میں ان کی یہ ہدایت بھلا بیٹھا۔

وہ آدمی دھیرے سے غرایا پھر مشرقی جانب رکھی ہوئی الماری کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک سیاہ نقاب لیے واپس آ گیا۔

”یہ لیجیے۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اور آئندہ اسے ہمیشہ ساتھ لے کر آیے گا۔“

فل نے نقاب اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کپڑے کے اس بڑے نقاب کو پہننے کے بعد اس کا سر، منہ، ناک اور آنکھیں چھپ گئیں۔ آنکھوں کی جگہ صرف دو سوراخ تھے جن سے تھوڑا بہت دکھائی بھی دے رہا تھا۔

”اندر جایے۔“ خادم نے کہا۔ اس کے لہجے کی شگفتگی رخصت ہو چکی تھی۔

فل ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تو خادم نے ایک طرف اشارا کیا اور غرایا۔ ”اس طرف۔۔۔“

فل اس طرف گیا۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال تھا جس کی چھت بہت بلند تھی۔ وہاں پہنچ کر فل کو سکتہ سا ہو گیا۔ اسے شبہ تھا کہ شاید وہ عالم خواب میں ہے۔

اس ہال کے اختتامی سرے پر ایک بڑا پیانو رکھا تھا جس کی بنچ خالی تھی۔ ابھی وہ شخص نہیں آیا تھا، جسے وہ محفل سجانا تھی۔

تاہم سامعین حاضر تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی اور وہ سب ایوننگ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ اینڈریو ایونیو کی عمارتوں کی طرح ان میں بھی یکسانیت تھی۔ سب کے جسموں پر سوٹ اور چہروں پر سیاہ نقاب تھا۔ فل پر اس قدر حیرت طاری تھی کہ وہ آگے نہیں بڑھا اور وہیں کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ اس کی آمد پر انہوں نے مڑ کر دیکھا تھا مگر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاید فل وہاں ساری رات کھڑا رہ جاتا مگر خادم نے جب عقب سے اسے ٹہوکا دیا تو وہ آگے بڑھا۔ تین چار کرسیاں ابھی خالی تھیں۔ اس نے خوابیدہ انداز میں ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا۔ تو یہ ہیں ”جو کے دوست“ اور اب میں بھی ان میں شامل ہو چکا ہوں۔“

اس ہال میں کشیدگی سی تھی اور ہر شخص اضطراب کا شکار تھا۔ فل نے محسوس کیا تھا کہ وہ سب اس

بھاری پردے کو تک رہے ہیں جس کے پیچھے سے کسی موسیقار کو آنا تھا پھر پردہ ہلا اور فیری جو بھی آ گیا۔ فل کو یقین تھا کہ اس کے چہرے پر بھی نقاب ہوگا مگر اس وقت اسے حیرت ہوئی جب اس نے فیری کو عام حالت میں دیکھا۔ فیری کے نقوش تیکھے تھے اور آنکھیں چمک دار اس کی مونچھیں گہری سیاہ تھیں اور بھورے بالوں سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں جو پیچھے کھنچے ہوئے تھے حالانکہ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ کے لگ بھاگ تھا مگر وہ سامعین کے سامنے یوں جھک رہا تھا جیسے اس کا قد سات فٹ کے قریب ہو۔

"دوستو!" اس نے گونج دار آواز میں کہا۔ "آپ کی تشریف آوری کا شکریہ! میں نے آج مشہور موسیقاروں کی دھنوں سے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گا۔"

اس نے پیانو کے قریب نشست جمائی اور جب کی بورڈ پر انگلیاں رکھیں تو فل اس کے سحر میں کھو گیا۔ فیری کی انگلیاں برق رفتاری سے حرکت کر رہی تھیں اور پیانو سے ایک لاہوتی نغمہ بلند ہو رہا تھا۔ وہ عظیم موسیقار بیتھون کے نغمے کی ایک دھن تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نغمہ شروع ہوا تو سامعین نے پہلو بدلنا شروع کر دیے۔ فل نے محسوس کیا تھا کہ جو کے دوست موسیقی کے اس پروگرام میں قطعاً دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جو اپنا پانچواں پروگرام پیش کرنے جا رہا تھا کہ ان میں سے کسی نے آواز لگائی۔ "فیری۔۔۔!"

فیری جو جیسے ٹھٹک گیا اس کی انگلیاں کی بورڈ پر ساکت ہو گئیں۔ اس نے مستفسرانہ انداز میں اس طرف دیکھا۔

"فیری! اب اسے بند کرو۔" وہی شخص بولا۔

ایک اور شخص نے اس کی تائید کی اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا۔ "خدا کے لیے اسے ختم کرو۔"

فیری کے ہونٹ کانپے اور اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ فل کا خیال تھا کہ وہ اب رو دے گا مگر جب فیری نے سر اٹھایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ اس نے حیرت انگیز طور پر اپنے اوپر قابو پالیا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ آخری آئٹم ہے میں چوپن کی دھنیں پیش کرنا چاہتا ہوں، اجازت ہے۔"

معترض اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ہال کے دروازے پر وہ خادم اپنے ہاتھ سیمسن کی مانند پھیلائے کھڑا تھا۔ پتا نہیں وہ ضرورتاً وہاں کھڑا تھا یا اسے بھی موسیقی سے شغف تھا۔ فیری جو نے چوپن کی دھنیں بجائیں اور پھر پیانو پر سے ہٹ گیا۔ حسب سابقہ وہ حاضرین کے سامنے جھکا اور پھر کہنے لگا۔ "میں آپ کی تشریف آوری کا ایک بار پھر احسان مند ہوں امید ہے کہ آپ اس موسیقی کے پروگرام سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔ مجھے اب آپ کے عطیات وصول کرتے ہوئے خوشی ہوگی۔ مسٹر سائر۔۔۔!" اس نے خادم کو آواز دی پھر چھت سے آویزاں پردوں کے عقب میں غائب ہو گیا۔ دروازے پر کھڑا ہوا خادم ہال میں آ گیا اور سب سے پہلی کرسی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھاری تن و توش والے ایک شخص نے اپنی جیب سے لمبا سا لفافہ نکالا اور خادم کے ہاتھ میں دے مارا پھر وہ بغیر کچھ کہے دروازے سے نکل گیا۔ خادم سائر دوسرے شخص کی طرف گیا تو اس نے بھی ایک لفافہ نکال کر اسے تھما دیا۔ دفعتاً فل پر انکشاف ہوا کہ وہاں پر موجود ہر شخص لفافہ لے کر آیا ہے بلاشبہ اس میں کچھ رقم ہوگی جسے بطور عطیہ پیش کیا جا رہا ہے فل کا نمبر سب سے آخر میں آیا جب سائر اس کے قریب پہنچا تو ہال سے باقی چھ آدمی جا چکے تھے۔ سائر نے اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ "جناب عطیہ دیجیے۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔

"ہوں۔۔۔ عموماً یہاں کتنا دینا پڑتا ہے۔" فل نے سوال کیا۔

"میں سمجھا نہیں جناب!" سائر بولا۔

"میں آج یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ عطیہ وغیرہ بھی۔۔۔"

سائر کا ہاتھ گر گیا اور وہ غرایا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟"

"یہی کہ آج میرا پہلا اتفاق ہے۔"

"تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔" سائر کا لہجہ بدل گیا۔

فل نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ "نہیں۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔"

"اچھا اس نقاب کو اتارو۔" وہ بولا۔

فل نے سیاہ نقاب اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس وقت اس نے سکون سے لمبا سانس کھینچا تھا۔

"فیری!" سائر چیخا جب تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہ ہوا تو اس نے موسیقار کو دوبارہ پکارا۔ موسیقار انہی پردوں کے پیچھے سے نکلا اور قریب آ کر بولا۔ "کیا بات ہے سائر! کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"ساری گڑبڑ یہ شخص ہے۔" وہ فل کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

"میں نے تو اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" فیری بولا۔ "یہ کون ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔" فل نے اپنا گلا صاف کر کے کہا۔ "میں آج رات یہاں مدعو نہیں تھا۔ دوسرے کسی شخص کے کارڈ کے۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" سائر دہاڑا۔ "میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔"

"تم نے اسے اندر کیوں آنے دیا۔" فیری جو نے سائر سے پوچھا۔

"اس شخص کے پاس دعوت نامہ تھا۔" سائر نے جواب دیا۔

"یہ ایک ذاتی نوعیت کی تقریب تھی۔" فیری نے فل سے کہا۔ "تمہیں اندر آنے کی جرات کیسے ہوئی۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" فل نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی قمیص کا کالر سائر نے پکڑ لیا تھا۔ "تم پولیس کو بلا لو تا کہ میں اس کے سامنے وضاحت کر سکوں۔۔۔ سائر میری قمیص چھوڑو۔"

"وہ دعوت نامہ تم نے کیسے حاصل کیا اور تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے۔" فیری نے سوال کیا۔ فل نے کوئی جواب نہ دیا تو سائر نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکال لیا۔ اس میں موجود کارڈ پر "جے جے واٹسن" لکھا تھا۔ فل نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "میں سیلز مین ہوں۔"

"تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے۔" فیری نے اپنا سوال دوہرایا۔

"وہ دعوت نامہ مجھے سڑک پر پڑا ملا تھا۔" فل بولا۔ ان کے سوال و جواب اور سائر کی غیر دوستانہ گرفت سے اب وہ پریشان ہو گیا تھا۔ فل چاروں جانب نگاہ دوڑا کر منصوبہ بنانے لگا کہ سائر کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے بعد اسے کس طرف سے فرار ہونا ہے لیکن اس کی منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی کیوں کہ سائر نے اسی وقت غرا کر کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو اور اس کے جبڑے پر مکہ مار۔" افل نے بدک کر بھاگنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

سائر کا دوسرا مکہ اس کی کنپٹی پر پڑا اور اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ فل نے مدافعت کے لیے ہاتھ پیر مارے مگر پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

نینسی نے ایڈرین اور اس کے باپ ایلڈن کو دعوت میں مدعو کیا۔ اس روز اس نے بہترین ڈشوں کا اہتمام کیا تھا۔ وہ سب ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایڈرین پر دورہ پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ مائیک نے بڑھ کر اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو یقیناً وہ فرش پر گر پڑتی۔ دعوت جہاں کی تہاں رہ گئی۔ ایلڈن نے کہا کہ مائیک انہیں گھر چھوڑ آئے مائیک نے گاڑی نکالی اور ایلڈن نے اپنی بیٹی کو سہارا دے کر اس میں سوار کرایا

ایڈرین کواس کے گھر چھوڑ کر مائیک واپس آنا چاہتا تھا مگر ایلڈن نے اسے روک لیا اور مطالعہ گاہ میں ایک پیگ پینے کی دعوت دی۔ مائیک نے مطالعہ گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ایلڈن! آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ یہ درست ہے کہ آپ نے اب اپنی پریکٹس چھوڑ دی ہے مگر یہ بات تو آپ کے علم میں ہوگی کہ ایڈرین کو کیا بیماری ہے۔ اسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں۔''

''ایڈرین کو کوئی بیماری نہیں ہے۔'' ایلڈن بولا۔ مائیک کے ذہن میں پلز کی وہ شیشی ناچنے لگی جو وہ ایڈرین کو بارہا استعمال کرتے دیکھ چکا تھا تاہم اس کا حوالہ دے کر اس نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

''اس کے ذہن پر زبردست دباؤ ہے۔''

''اس کا شوہر پراسرار طریقے سے مر گیا اور پھر ٹونی جیرک کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا ان دونوں چیزوں نے یقیناً اس کے ذہن پر۔۔۔''

ایلڈن نے بھنویں سکیڑیں اور ایک جام میں برانڈی انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''ایڈرین کے ذہنی دباؤ کی وجہ والٹر کی موت نہیں ہے تم غلط انداز سے سوچ رہے ہو۔۔۔''

''پھر۔'' مائیک نے سوال کیا

''اس کی ذہنی بیماری کی اصل وجہ میں ہوں۔'' ایلڈن نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کیسے۔۔۔؟'' مائیک حیرت سے بولا۔

''غلطیوں پر غلطیاں ہوئی ہیں کچھ مجھ سے، کچھ میرے والدین سے اس کا اثر کسی نہ کسی نسل کو تو بھگتنا ہی تھا سو ایڈرین اسے بھگت رہی ہے۔''

''آپ سے اور آپ کے والدین سے کیا غلطیاں ہوئی تھیں۔'' مائیک نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ایڈرین کی پیدائش کے بعد میں نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس سے محض اس بنا پر کنارہ کشی کر لی تھی کہ میں کسی اور عورت کے سنہری جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اس عورت کو مجھ سے اور مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔''

''پھر۔۔۔؟'' مائیک نے سوال کیا۔

''ایڈرین کی ماں کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ جاں بر نہ ہو سکی۔ میں نے اس وقت اس کی موت کا کوئی اثر نہ لیا اور ایڈرین کی پرورش اپنے ذمے لے لی لیکن میں جب ایک اچھا شوہر نہ بن سکا تھا تو ایک اچھا باپ کیسے بن جاتا۔ مجھ سے اس سلسلے میں بے پناہ کوتاہیاں ہوئیں۔''

''کس قسم کی کوتاہیاں۔۔۔؟'' مائیک نے استفسار کیا۔

''اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے میں اسے بہتر معاشی تحفظ نہیں دے سکا تاہم یقین کرو اپنی اس نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے میں نے اس کی شادی والٹر ہیون سے کرادی۔''

''اس شادی کے بعد تو میرا خیال ہے معاشی ناہمواریاں دور ہو گئی ہوں گی۔'' مائیک نے اظہار خیال کیا۔ ''آپ کا یہ قدم تو صحیح تھا۔''

''نہیں۔'' ایلڈن نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ میری ایک اور بڑی ٹھوکر تھی۔ معاشی ناہمواری تو دور ہو گئی مگر یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی تم نے بھی والٹر اور ایڈرین کی ازدواجی زندگی کے افسانے سن رکھے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد لالچ پر رکھی گئی تھی، یہ کیسے کامیاب ہوتی۔''

مائیک کچھ نہ بولا۔ باپ بیٹی کی اس کہانی میں جدید عہد کا المیہ پوری آب و تاب سے جھلک رہا تھا۔ بے اصولی اور بے ضابطگی نے جس نئے معاشرے کو جنم دیا تھا اس میں فرد اپنے کنبے سے جدا ہو رہا تھا۔ ساری اکائیاں منتشر ہو رہی تھیں۔ بے اعتدالیوں نے معاشی ناہمواریوں کو بھی جنم دیا تھا اور یہ عظیم امریکا کا عظیم المیہ کہا جا سکتا تھا۔ ایلڈن نے اپنی روداد غم سنانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور پھر اسے مائیک کی طرف بڑھا دیا۔ ''تمہارا فون ہے۔'' اس نے کہا۔ مائیک نے ریسیور سے کان لگایا تو اسے نینسی کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہی تھی۔ ''مائیک مونٹیسلو

اسپتال سے فون آیا تھا۔''

''اسپتال سے۔ کیوں۔۔۔؟'' مائیک نے پوچھا۔

''انہوں نے وضاحت سے تو کچھ نہیں بتایا مگر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ فل کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔''

''فل کو حادثہ۔'' مائیک نے سراسیمگی سے دہرایا۔ ''اچھا میں اسپتال پہنچتا ہوں۔''

مائیک نے ایلڈن سے معذرت چاہی اور وہاں سے نکل آیا یوں ایلڈن کی کہانی ادھوری رہ گئی۔

فل کے چہرے کا بھرتہ بنا ہوا تھا۔ مائیک نے اسے پٹیوں سے ڈھکا دیکھ کر استفسار کیا تو فل نے اپنی کہانی سنائی۔ اس نے کہا۔ ''اگر تم اجازت دو تو میں اس سائز کے بچے کو مزا چکھاؤں گا۔''

''نہیں۔'' مائیک بولا۔ ''اس طرح وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے مجھے اس واقعے میں ایک بہت بڑے جرم کی بو آ رہی ہے۔''

''جرم۔۔۔ کیسا جرم۔۔۔؟'' فل نے سوال کیا۔

''بلیک میلنگ!'' مائیک نے جواب دیا۔ ''تم نے اس واقعے سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ آخر اتنے معزز آدمیوں کو منہ چھپا کر عطیات دینے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے بتایا ہے کہ وہ سب وہاں بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سب وہاں بحالت مجبوری بیٹھے تھے۔ فیری سے کوئی ...س نہیں تھا۔''

''مگر بلیک میلنگ کے لیے اتنا بڑا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔'' فل نے سوال کیا۔

''تاکہ اس گھناؤنے کاروبار پر پردہ ڈالا جا سکے کوئی ان پر انگلی نہ اٹھا سکے لوگ موسیقی کے پروگرام میں شریک ہوئے پھر انہوں نے عطیات دیے اور چلے گئے اس میں قانونی گرفت کہاں ہوتی۔؟''

''مگر لوگوں کو نقاب لگانے کی کیا ضرورت تھی۔'' فل نے پوچھا۔

''اگر تمہیں کوئی شخص بلیک میل کر رہا ہو تو کیا تم چاہو گے کہ کوئی اس سے واقف ہو۔''

''نہیں۔'' فل نے جواب دیا۔

''بس اسی لیے فیری جو نے یہ طریقہ نکالا ہے تاکہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔'' مائیک بولا۔ ''مگر تم یہ باتیں کسی اور کو نہ بتانا۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والٹر ہیون کو کسی وجہ سے بلیک میل کیا جا رہا تھا۔''

''اوہ!'' فل کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ ''مگر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' مائیک بولا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اسے کس وجہ سے بلیک میل کیا جا رہا تھا تو اس کی خودکشی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔''

☆☆☆

مائیک، بل مارکیو کے کمرے میں داخل ہوا تو بل نے اپنی بیوی مارتھا سے کہا کہ وہ اس طرف کسی کو نہ آنے دے۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تو مائیک نے پوچھا۔ ''تم نے اس شخص فیری جو کو پولیس ریکارڈ پر تلاش کیا؟''

''ہاں۔'' بل نے جواب دیا۔ ''اور تمہیں یہ سن کر مایوسی ہوگی کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ ریکارڈ کی رو سے وہ نہایت معصوم ثابت ہوتا ہے۔'' اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔ ''کم از کم وہ ایسا شخص تو ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی سے ہاتھا پائی کرے۔''

مائیک نے اس شخص فیری کا ریکارڈ دیکھا تو ایک بات سامنے آئی کہ وہ مونٹیسلو کے دماغی اسپتال میں چار سال تک زیر علاج رہا ہے اس نے بل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے ریکارڈ کی یہ بات سب سے زیادہ کارآمد ہے۔''

اسی سہ پہر فل کو بھی تھوڑی دیر کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر کے ریکارڈ روم میں لے جایا گیا جہاں بل

جود تھے۔ فل نامی گرامی ہ البم دیکھنے لگا۔ بل مار کیو تھوڑی ں بیٹھا رہا پھر اکتا کر چلا گیا اس نے یف نائب کو وہاں مقرر کر دیا تھا کہ جوں ہی فل یری جو یا سائر کو شناخت کر لے وہ تصویر لے کر اس کے پاس آ جائے۔

فل نے ایک ایک کر کے تمام البم پلٹ ڈالے مگر اس کا مطلوبہ شخص کہیں دکھائی نہیں دیا اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا اس ریکارڈ میں تو ان کی تصاویر کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ عادی مجرم نہ ہوں۔“

”ممکن ہے۔“ نائب نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ فل اور مائیک نے نائب سے مصافحہ کیا اور ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے باہر آ گئے جبکہ وہ کار میں بیٹھ رہے تھے تو فل بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے یہ بات چھپا کر دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔“

”کون سی بات۔“ مائیک نے چونک کر پوچھا۔

”یہی کہ سائر کی تصویر پولیس ریکارڈ میں موجود نہیں۔“ فل بولا۔ ”فیری اس شخص کو سائر کہہ کر پکار رہا تھا مگر اصل میں اس کا نام جان گیسل ہے۔“

”تمہیں یہ حرکت نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ مائیک نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”جب پولیس نے ہمیں اتنی سہولتیں فراہم کی ہیں تو ہمیں بھی چاہیے تھا کہ پولیس کی راہ نمائی کریں۔ بہر حال اب تو اس بات کا موقع نہیں رہا۔“

”تصویر کے نیچے لکھا تھا کہ وہ وفاقی حکومت کو کافی عرصے سے مطلوب ہے اور وہ منشیات کا کاروبار کرتا ہے۔“

”منشیات!“ مائیک جیسے سانس لینا بھول گیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ معاملہ تو کافی لمبا معلوم ہوتا ہے۔“

”تو پھر۔۔۔“

”کسی طرح سے فیری جو پر ہاتھ ڈال دیا جائے اور اسے قابو میں کر لیا جائے تو اس راز سے پردہ اٹھ سکتا ہے کہ وہ والٹر ہیون کو کیوں بلیک میل کر رہے تھے۔“ اس نے قدرے توقف سے دوبارہ کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ سائر یا جان کیسل منشیات کا کاروبار کر رہا ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو جو اس عادت بد میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کے نام فیری کے سپرد کرتا جا رہا ہے تا کہ وہ انہیں بلیک میل کر سکے۔“

”مگر اب ہم اس معاملے کی تہ تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔“ فل بولا۔ ”کم از کم میں تو اس سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔“

”میں اور لوئیس اس معاملے کو دیکھیں گے۔“ مائیک پرسوچ انداز میں بولا۔ ”تمہارا اب اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

اس بار کا نام ویسٹرن تھا۔ شاید جب اس کی سنگ بنیاد ڈالی گئی ہو اس وقت وہ کسی اعتبار سے ویسٹرن رہا ہو یا اس میں ویسٹرن علاقے کے لوگ آ کر بیٹھتے ہوں۔ فی الوقت تو اس بار کے دروازے پر لگا ہوا بھینسے کا سر باقی بچا تھا جو اس بار کے ویسٹرن ہونے کی دلیل تھا۔ بھینسے کا سر بھی ہیئت کے اعتبار سے کہن رسیدہ تھا کیوں کہ اس کا ایک سینگ ندارد تھا۔ لوئیس کہری ایک کیبن میں بیٹھی ہوئی بڑی دیر تک بارٹینڈر اور بھینسے کے سر کو دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں چیزوں میں اسے کافی مماثلت دکھائی دی تھی۔ لوئس نے وہاں داخل ہوتے وقت متعدد دوسری عورتوں کو دیکھ لیا تھا اور اسی وجہ سے اسے قدرے اطمینان سا تھا کہ وہ وہاں اکیلی عورت نہیں ہے۔ بار روم میں بیٹھا ہوا ایک شخص بڑی دیر سے اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ لوئیس اس کی نگاہ کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی مگر اس پر اپنے غم و غصے کا اظہار کر کے یا اشتعال ظاہر کر کے وہ معاملے کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مائیک نے اپنے ایک دوست پولیس والے سے پوچھ کر اسے وہاں بھیجا تھا کہ سائر یا جان کیسل کا کھوج لگائے اور اس سے ملاقات کی کوشش کرے۔ مائیک

کی تحقیق کے مطابق سائر وہاں تقریباً روزانہ آتا تھا اور ڈھکے چھپے انداز میں منشیات کا کاروبار کرتا تھا۔ والٹر بار میں اس سے ہر قسم کے مرد اور عورتیں ملاقات کرتی تھیں۔ وقت گزاری کے لیے لوئیس سستی قسم کی شراب سے شغل کر رہی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے پرسکون تھی مگر جب صدر دروازے سے سائر اندر آیا تو اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ سائر کو لوئیس نے اس کے حلیے سے شناخت کیا تھا۔ اس کا حلیہ اور شباہت فل نے اتنی بار بتائی تھی کہ لوئیس کو وہ سب ازبر ہو گیا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ناک اور چہرے کو دیکھ کر لوئیس کو جھرجھری سی آ گئی تھی۔ سائر کے چہرے پر زخموں کے لاتعداد نشانات تھے جو یقیناً اسے مختلف معرکہ آرائیوں میں حاصل ہوئے تھے۔ سائر سیدھا بارٹینڈر کے پاس گیا۔ اس نے کاؤنٹر کے قریب پڑا ہوا ایک اسٹول کھینچا اور بارٹینڈر کو بیئر کا آرڈر دیا۔ بارٹینڈر نے جام کاؤنٹر پر رکھا تو سائر نے اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر اس نے اپنی آستین سے ہونٹ صاف کیے اور شراب خانے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ بالکل اتفاقیہ اس کی نگاہ لوئیس سے چار ہوئی۔ سائر پر اس کا ردعمل ہوا اس کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیں دکھائی دیں۔ لوئیس نے جواباً اسے بے خوفی سے گھورنا شروع کر دیا اور اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ ”اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“ اس نے ایک اور اسٹول کھینچتے ہوئے پوچھا۔ سائر نے اپنے شانے اچکا کر بے پروائی کا اظہار کیا جیسے اسے لوئیس کے بیٹھنے یا نہ بیٹھنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ لوئیس اسٹول پر بیٹھ گئی اس نے اپنے دستانے اور پرس کاؤنٹر پر رکھ دیے تھے۔ ”اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں تم سے گفتگو کر لوں۔“ لوئیس نے اسے مخاطب کیا۔

”کس کے بارے میں۔“ سائر نے بھنویں سکیڑیں۔

”ایسے ہی۔۔۔ کچھ چیزوں کے بارے میں۔“ لوئیس اٹکتے ہوئے بولی۔

”میں فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

”یہ تمہارے کام کی باتیں ہیں۔“ لوئیس بولی۔ ”میری ایک سہیلی مصیبت میں پھنس گئی ہے میرا خیال ہے کہ تم اس کی مدد کر سکتے ہو۔“

”میں ہی کیوں۔“ اس نے سوال کیا۔

”تم مجھے قابل اعتبار دکھائی دیتے ہو۔“ لوئیس بولی۔ سائر نے اپنا جام بارٹینڈر کی طرف سرکاتے ہوئے اسے دوبارہ بھرنے کا اشارا کیا۔ پھر لوئیس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”اوکے، بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تمہاری دوست کو کس قسم کی مدد درکار ہے۔“

”وہ مصیبت میں گرفتار ہے۔۔۔ اور تمہاری مدد چاہتی ہے میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں تم اسے بخوبی سمجھ رہے ہو گے۔“

”نہیں۔۔۔ میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ سائر بولا۔

”اس کو طبی امداد چاہیے۔ وہ بیمار ہے صرف تم ہی اسے مخصوص قسم کی ”دوائیں“ فراہم کر سکتے ہو۔ وہ کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں ہے اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے۔۔۔“

سائر نے دوسرا جام خالی کر کے کہا۔ ”آؤ چل کر تمہارے کیبن میں بیٹھتے ہیں یہ جگہ ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔“

وہ دونوں کیبن میں جا کر بیٹھے تو سائر نے سرگوشی میں کہا۔ ”تمہیں مال چاہیے۔“

”کیا۔۔۔؟“ لوئیس نے آنکھیں پھاڑیں۔

”مجھ سے گھما پھرا کر گفتگو مت کرو۔ اپنی دوست کا تذکرہ کرنے کے بجائے تم یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں ”مال“ کی ضرورت ہے۔“

لوئیس نے شکست خوردہ انداز میں اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھیکے انداز میں مسکرائی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”چلو یوں ہی سہی۔“

سائر منہ چلانے لگا۔ دفعتاً اس کی نگاہ لوئیس کے پرس پر پڑی۔ اس نے چیل کی مانند جھپٹا مار کر پرس اٹھالیا اور اسے کھول کر جائزہ لینے لگا اس میں موجود رقم کو اس نے گنا، لپ اسٹک اور کنگھے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر لوئیس سے بولا۔ ''اب تم واپس جاسکتی ہو۔''

''کیا۔'' لوئیس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہاں سے چلتی پھرتی نظر آؤ۔'' سائر بولا۔ ''سمجھ لو کہ تم نے کسی غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ میں اس قسم کے معاملوں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔''

''مم۔۔۔ مگر مجھے تو پتا چلا تھا کہ تم ایسے معاملوں میں۔۔۔''

''کس سے پتا چلا تھا۔ وہ سانپ کی مانند پھنکارا۔۔۔''

''اپنے دوستوں سے۔'' لوئیس نے جواب دیا۔

''تمہارے دوستوں کے ذرائع کافی وسیع معلوم ہوتے ہیں۔'' سائر طنزیہ بولا۔

''تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔'' لوئیس بولی۔ ''میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔''

''خاتون! تم سے ایک فاش غلطی ہوئی ہے بہتر ہوگا کہ جہاں سے آئی ہو وہیں لوٹ جاؤ۔''

''مگر تمہیں میری مدد کرنا پڑے گی۔ میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گی۔'' سائر نے اس کی بات پر قطعاً کان نہیں دھرے اور کرسی سے کھڑا ہوگیا جب وہ بوتھ سے نکل گیا تو لوئیس دیر تک وہاں بیٹھی سوچتی رہی کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے۔''

''تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔'' مائیک نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اس نے یہ بات محض اس لیے کہی تھی کہ اگر تم واقعی پولیس انفارمر ہو تو گڑبڑا کر حقیقت بتادو۔''

''تو پھر اسے میری صداقت پر یقین نہیں آیا۔'' لوئیس نے پوچھا۔

''اسے تمہاری صداقت پر یقین آ گیا ہے مگر اس نے پولیس کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے ایک لمبا راستہ اختیار کیا ہے۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

مائیک نے اس کے پرس میں سے بٹوہ نکال کر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اس پر تمہارا نام اور پتا لکھا ہے اگر اسے تم سے رابطہ قائم کرنا ہو تو وہ اس پتے پر تم سے خط و کتاب کرے گا۔''

انہیں سائر کے پیغام کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دوسرے روز دوپہر اس کا فون آیا۔ ''مسز فل۔'' اس نے کہا۔

''یس۔۔۔'' لوئیس بولی۔

''ہم گزشتہ روز ویسٹرن بار میں ملے تھے۔'' دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''میرا نام سائر ہے۔''

''اوہ۔۔۔ اچھا۔'' لوئیس کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔

''خاتون میں آپ کی سہیلی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' سائر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم اس موضوع پر کہیں بیٹھ کر گفتگو کریں۔''

''کیا میں وہیں آجاؤں۔'' لوئیس نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' سائر بولا۔ ''ویسٹرن بار جیسی جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے گھر پر آجاؤں۔''

''نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے۔'' لوئیس بولی۔

''کیوں۔ آپ کے شوہر کو آپ کی سہیلی کی بیماری کا علم نہیں ہے۔''

''اسے معلوم ہے مگر۔۔۔''

''مگر آپ پڑوسیوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔ ٹھیک ہے، میں جگہ کا انتظام کرتا ہوں، مسز فل!''

اس نے ایک جگہ کا نام پتا بتایا اور وقت کا تعین کیا۔ پھر سلسلہ منقطع کردیا۔ لوئیس نے اپنے شوہر کو اس گفتگو سے مطلع کیا تو اس نے کہا۔ ''اب تم وہاں نہیں جاؤ گی اس میں خطرہ ہے۔''

لوئیس کسمسا کر رہ گئی۔ وہ ہر ممکن طریقے پر اپنی سہیلی ایڈرین کی مدد کرنا چاہتی تھی مگر فل اس پر پابندی عائد کر رہا تھا شام کو جب مائیک آیا تو اس کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا اس نے کچھ سوچ کر گھمبیر آواز میں کہا۔ ''فل صحیح کہتا ہے۔ وہاں جانے میں خطرہ ہے۔''

''تو پھر۔۔۔''

''تم ویسٹرن بار فون کر کے سائر سے انکار کر دو۔ مجھے امید ہے کہ وہ وہاں مل جائے گا۔'' لوئیس نے ویسٹرن بار کا نمبر ڈائریکٹری میں تلاش کر کے فون کیا تو سائر وہاں مل گیا لوئیس نے اس سے معذرت طلب کی تو اس نے کہا۔ ''یہ تو بہت غلط فیصلہ کیا ہے خاتون آپ نے۔''

''وہ کیسے۔'' لوئیس نے سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ کے خاندان کی مونٹیسیلو میں کافی عزت ہے آپ کے شوہر بہت نیک نام ہیں۔''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر جب لوگوں تک آپ کی بیماری کی خبریں پہنچیں گی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' سائر بولا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' لوئیس نے کہا۔

''میرا مطلب ہے آپ منشیات کی عادی ہیں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' لوئیس بولی۔

''کیوں نہیں کرسکتا۔'' سائر نے کہا۔ ''قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اگر آپ کا تعلق ارفع طبقے سے ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ غیر قانونی کام کر کے بچ جائیں گی۔ قانون آپ پر بھی گرفت کرسکتا ہے۔''

''مگر میرے جرم سے تمہارا جرم بڑا ہے تم تو منشیات کا کاروبار کرتے ہو۔''

''کون میں۔'' سائر نے چونک کر معصومیت سے کہا۔ ''آپ مجھ پر یہ الزام کیسے عائد کرسکتی ہیں۔ میں نے نہ تو اس موضوع پر آپ سے گفتگو کی اور نہ ہی آپ کے ہاتھ ایسی کوئی غیر قانونی چیز فروخت کی۔۔۔ اب البتہ آپ پولیس سے اپنا دامن بچانا چاہتی ہیں تو آپ کو کچھ عطیات دینا ہوں گے۔''

''گویا تم مجھے بلیک میل کرو گے۔'' لوئیس نے سوال کیا۔

''اس کے لیے اتنا خراب لفظ استعمال مت کیجیے۔'' سائر بولا۔

''آپ ثقافت کے نام پر عطیہ دیجیے اس سے ثقافت اور کلچر ترقی پائیں گے۔ میں آپ کے شوہر کو جلد ہی ایک دعوت نامہ ارسال کروں گا۔ وہ موسیقی تو پسند کرتے ہیں نا۔''

کارڈ اسی قسم کا تھا جیسا کہ والٹر کی مطالعہ گاہ میں دیکھ چکے تھے اسی کے ذریعے فل نے محفل موسیقی میں شرکت کی تھی، مگر اس بار دعوت نامے چند سطریں زائد تحریر تھیں۔

''ڈیئر مسٹر فل

مجھے معلوم ہے کہ آپ کو موسیقی سے گہرا شغف ہے۔ امید ہے کہ آپ اس تقریب میں ضرور شرکت کریں گے۔ چوں کہ مجھے آپ سے ذاتی نوعیت کی چند باتیں کرنا ہیں چنانچہ آپ تقریب شروع ہونے سے نصف گھنٹہ پہلے تشریف لے آئیں۔

احقر فیری جو''

فل نے دعوت نامہ دیکھ کر کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا مچھلی نے چارے پر منہ مار دیا ہے اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''تم اب وہاں نہیں جاسکتے کیوں کہ سائر تمہیں فوراً پہچان لے گا۔'' لوئیس بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' مائیک بولا۔ ''فل کی حیثیت سے اب میں وہاں جاؤں گا۔''

☆☆☆

مائیک نے اپنی سیاہ ٹائی، چھوٹی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کو تھپ تھپا کر اطمینان کیا اور پھر

اطلاعی گھنٹی بجادی۔ سائر نے دروازہ کھولا اور اسے سرتاپا تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ جسموں کے پار دیکھنے کی قوت رکھتا ہے۔ مائیک کو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ اس کی تصاویر اخبارات کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ قوی امکان تھا کہ سائر اس کو پہچان لے گا مگر جب اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک لمبی سی مسکراہٹ سجا کر کہا۔

''اندر تشریف لایئے مسٹر فل۔۔۔! مسٹر فیری آپ کا انتظار کررہے ہیں۔'' تو مائیک کی جان میں جان آئی۔ ایک چھوٹے سے ہال سے گزر کر وہ بائیں جانب واقع کمرے میں پہنچے۔ وہاں مدھم روشنی ہورہی تھی اور ایک شخص بیٹھا تھا۔ مائیک کو دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''مسٹر فل۔۔۔!'' اس نے تعظیمانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے فیری جو کہتے ہیں۔ معاف کیجیے گا یہاں روشنی کم ہے، مگر میں مجبور ہوں میری بینائی تیز روشنی سے متاثر ہوتی ہے۔''

''کوئی بات ہیں۔'' مائیک خوش خلقی سے بولا۔

''اگر آپ موسیقی سے لگاؤ رکھتے ہیں تو اس بات سے واقف ہوں گے کہ پیانو بجاتے وقت توجہ اور ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''مجھے موسیقی سے لگاؤ نہیں ہے۔'' مائیک بولا۔

''آہ۔۔۔! یہ میری بدقسمتی ہے میرے تمام دوست اعلا طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر موسیقی سے کسی کو دلچسپی نہیں۔'' فیری بولا۔

''تاہم میں مہینے میں ان کے لیے ایک بار تقریب ضرور منعقد کرتا ہوں اور اگر کوئی نیا ممبر شامل ہوتا ہے تو۔۔۔''

''جیسے میں۔۔۔'' مائیک نے سوال کیا۔

''ہاں۔۔۔ سائر نے آپ کے اور آپ کی بیوی کے متعلق سب کچھ بتادیا ہے۔ آپ ہمارے ممبر بن سکتے ہیں۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' مائیک بولا۔

''میں کسی سائر کو بھی نہیں جانتا۔ اس … بتایا تھا کہ کوئی شخص اسے پریشان کررہا ہے اس … میں یہاں آگیا کہ۔۔۔''

''جی ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ سائر بعض او… بہت حیف دہ ہوجاتا ہے۔ میں نے اس سے کہا … کہ وہ لوگوں سے تمیز سے گفتگو کیا کرے۔ بہر … اگر آپ اس تنظیم کی سرپرستی فرمائیں گے اور … باقاعدہ سے چندہ یا عطیات وغیرہ دیتے۔''

''عطیات۔۔۔؟ میرا خیال ہے کہ تمہیں … میلنگ کی رقم کہنا چاہیے۔'' مائیک بول پڑا۔

''پلیز مسٹر فل۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''… تنظیم سراسر قانونی ہے۔ کوئی اس پر انگلی نہیں … سکتا۔ ہاں۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ کی ما… حالت بہتر ہے تو۔۔۔ اور جیسا کہ میں جانتا ہو… یقیناً ہے۔ آپ کو ہر ماہ صرف ایک ہزار … عطیہ۔''

''ایک ہزار ڈالر۔'' مائیک نے اس کا جملہ … کیا۔ ''کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔''

''کیش دینے میں کوئی حرج ہو تو آپ … کے ذریعے اسے ادا کردیں کیونکہ یہ کام … قانونی۔۔۔''

''اور اگر میں یہ قانونی کھیل نہ کھیلنا چاہوں … تو؟'' مائیک بولا۔ ''مثال کے طور پر اگر میں اس … کا دشمن بن جاؤں تو۔۔۔؟''

''اوہ ڈیئر!'' فیری دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مسٹر فل آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس انداز سے گفتگو مت کریں۔''

''مگر میں اس قسم کی گفتگو کروں گا۔ میں تمہیں عطیات یا نذرانے کیوں دوں، جبکہ مجھے موسیقی سے رتی برابر بھی لگاؤ نہیں ہے۔'' مائیک بولا۔

''سائر نے آپ کو کچھ نہیں بتایا تھا؟''

''بتایا تھا۔'' مائیک نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ میری بیوی کو منشیا… ہماری مشہور کر کے بدنام کردے گا، پولیس کو اطلاع … دے گا۔ اخباری نمائندوں کو ہمارے پیچھے … ے گا اور شہر بھر میں ہمارا نام اچھال دے۔''

فیری کے چہرے پر ایسے آثار دکھائی دیے … اسے یہ تذکرہ سن کر روحانی کوفت ہورہی ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' مائیک غرایا۔ ''مجھے معلوم ہے … اس کے علاوہ میرے لیے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ … کہ والٹر ہیون کے لیے۔'' فیری نے ناک سکوڑ … کر کہا۔ ''کون؟''

''تم اس طرح سے انجان بن کر پیچھا نہیں … ۔'' مائیک بولا۔ ''میرا اشارہ اس شخص کی … ہے جو قتل ہوچکا ہے۔''

''یہ درست نہیں ہے۔''

''میں والٹر سے واقف ہوں۔ وہ تمہاری تنظیم کا رکن تھا۔'' مائیک بولا۔ ''تمہارا ایک دعوت نامہ … میں نے اس کے گھر میں بھی دیکھا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' فیری چلایا۔

''اگر یہ بات تمہیں معلوم ہوگئی ہے تو اس سے … کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم اس کا مکمل خیال رکھتے ہیں کہ … ممبر کو دوسرے کے بارے میں کوئی علم نہ ہونے … پائے۔۔۔''

''سائر!'' فیری نے آواز دی۔ سائر تھوڑی دیر بعد نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ نقاب تھا۔ اس نے مائیک کی طرف اسے بڑھایا اور بولا۔ ''یہ … آپ کا ہے۔ جب بھی یہاں تشریف لائیں اسے ساتھ رکھیں۔''

مائیک نے نقاب لے کر الٹنا پلٹنا شروع کردیا تو فیری بولا۔ ''اسے پہن لیجیے اور ہال میں پہلے جایئے۔ میں تھوڑی دیر بعد موسیقی کا پروگرام شروع کرنے والا ہوں۔''

''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' مائیک نے کہا۔

''باتوں میں زیادہ وقت مت ضائع کیجیے مسٹر فل!'' سائر اس کی کہنی پکڑتا ہوا بولا اور اس ہال میں جا کر بیٹھ گیا جہاں پیانو رکھا تھا۔ اس ہال میں تین آدمی نقاب لگائے بیٹھے تھے۔ بیس منٹ کے اندر اندر چار آدمی مزید آگئے پھر بھاری پردوں کے عقب سے فیری جو نکل کر سب کے سامنے مودبانہ جھکا اور چند جملے کہہ کر پیانو پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کی بورڈ پر انگلیاں رکھیں اور پیانو سے ایک خوب صورت نغمہ ابلنے لگا۔ پہلا نغمہ ختم ہوا تو مائیک نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ مائیک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کا دستہ پکڑلیا اور بے آواز اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔

''فیری! اس بکواس بازی کو بند کرو یہاں کسی کو موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے۔''

فیری کی انگلیاں ساکت ہوگئیں اور ہال میں سکوت چھا گیا۔ اس نے چونک کر مائیک کی طرف دیکھا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''آپ اس پروگرام میں دخل اندازی کیوں کررہے ہیں؟''

''معاف کرنا تم پیانو تو بہت اچھا بجا لیتے ہو مگر میں محسوس کررہا ہوں کہ یہاں اس سے کوئی محظوظ نہیں ہورہا ہے۔'' مائیک نے کہا۔

''یہ بالکل درست ہے۔'' ایک اور شخص بڑبڑایا۔

''اپنی جگہ پر بیٹھ جایئے۔'' فیری دانت پیس کر بولا۔ ''ورنہ میں۔۔۔''

''ورنہ تم کیا کروگے؟'' مائیک نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ فیری غصے میں کھڑا ہوگیا اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ''تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں۔۔۔''

''مجھے معلوم ہے کہ تم میری بیوی پر کیچڑ اچھالنا شروع کردوگے اور ہم شہر بھر میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ مگر میری بلا سے تمہاری سمجھ میں جو کچھ آئے وہ کرو۔'' مائیک نے یہ کہہ کر اپنے چہرے سے نقاب اتاردیا۔ اس ڈرامائی عمل سے لوگ ششدر رہ گئے۔ مائیک نے تیز تیز سانسوں کی آواز سنی تھی۔ اس نے ان سب کی طرف مڑ کر کہا۔ ''آپ

سب لوگ میرا چہرہ اچھی طرح سے دیکھ لیں میں اسے نقاب میں لپیٹنا پسند نہیں کرتا میرا خیال ہے کہ آپ لوگ بھی اپنے نقاب اتار پھینکیں یہ مسخرہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"سائر۔۔۔!" فیری جو چیخا۔ سائر ہال میں داخل ہوا اور بھیانک انداز میں غرایا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس طرف آتا مائیک نے ریوالور نکال لیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "خبردار! آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

"پولیس!" فیری نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سائر! تم کتنے احمق ہو تم نے ایک پولیس والے کو اندر۔۔۔"

"نہیں مسٹر فیری! میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" مائیک بولا۔ "میں تو محض تمہارا ایک شکار ہوں شاید تم مجھے بلیک میل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاؤ مگر میں اس کا انتظام کر کے آیا تھا یہ لوگ بھی اگر اپنے نقاب اتار پھینکیں تو تمہارے چنگل سے آزاد ہو سکتے ہیں۔" اس نے ان لوگوں کی طرف رخ کر کے کہا۔ "برائے مہربانی اپنے نقاب اتار دیجیے۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔" ان میں سے ایک چیخا۔

"آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔" مائیک نے سوال کیا۔ "اگر میں آپ کا چہرہ دیکھ لوں گا تو اس سے کیا فرق پڑے گا مجھے اس کی کیا پروا کہ آپ کون ہیں۔"

مائیک کے عقب میں بیٹھا ہوا ایک شخص اتنی تیزی سے اٹھا کہ اس کی کرسی الٹ گئی اس نے تیز آواز میں کہا۔ "یہ آدمی درست کہتا ہے خدا کی قسم ہم سب احمق ہیں مسخرہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا نقاب نوچ کر پھینک دیا۔

"میں آپ لوگوں سے بھی درخواست کروں گا کہ۔۔۔" مائیک نے باقی پانچ آدمیوں سے کہا۔

"سائر۔۔۔ اسے روکو۔۔۔ یہ سارا کھیل بگاڑ دے گا۔" فیری ہاتھ اٹھا کر دوبارہ چیخا۔ سائر کے حلق سے بھیڑیوں جیسی غراہٹ نکلی مگر وہ سینہ پھلانے اور پچکانے کے سوا کچھ نہ کر سکا کیونکہ مائیک کے ریوالور کی نال اس کی طرف مڑی ہوئی تھی۔

"اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا۔" مائیک نے سخت لہجے میں کہا۔ ایک ایک کر کے سب لوگوں نے اپنے نقاب اُتار دیے اور اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک شخص جس کا ڈیل ڈول وتوش بھاری تھا فیری کی طرف بڑھا اس نے کرخت آواز میں کہا۔ "جب تک یہ خبیث زندہ رہے گا ہمیں اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونا پڑے گا۔"

"ٹھہرو۔" مائیک نے اسے حکم دیا۔ "تم اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔" مگر وہ آدمی اس کی پروا کیے بغیر کہ مائیک کے ہاتھ میں ریوالور ہے بدستور فیری کی طرف بڑھتا رہا۔ "اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔" اس نے جنونیوں کی طرح کہا اور فیری کا گریبان پکڑ کر اسے فرش سے اٹھا لیا۔ فیری نے عورتوں کی طرح چیخ ماری۔

"اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ یہ کیا مذاق ہے۔" وہ کانپتے لہجے میں بولا۔

مائیک نے بھی اسے وارننگ دی۔ "مسٹر یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔ میں کہتا ہوں۔۔۔"

مگر اس شخص نے مائیک کے کہنے کی پروا نہیں کی اور فیری کو گلے سے پکڑ لیا۔ فیری اونٹ کی طرح بلبلایا وہ روہانسی آواز میں بولا۔ "مجھے مت مارو۔۔۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو۔۔۔ تم جو کچھ کہو گے میں کروں گا۔ میں تمہاری رقم لوٹا دوں گا۔"

"شٹ اپ۔۔۔" سائر دہاڑا۔

دوسرے آدمیوں نے ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر فیری کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

"اس کے پاس سے ہٹ جاؤ۔" مائیک بلند آواز میں بولا۔

"ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" فیری گھگھیایا۔ سائر کی تمام تر توجہ فیری اور اس آدمی کی طرف تھی جو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس لیے سائر نے موقع غنیمت خیال کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی اور ریوالور پر ہاتھ مارا۔ مائیک کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا۔ سائر کا گھونسہ اس کے پیٹ میں پڑا تو اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بے پناہ طاقت ور تھا۔ سائر کا دوسرا ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا اور اس کا ذہن تاریکی میں جا سویا۔ جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو اس نے ہال خالی دیکھا تمام کرسیاں الٹی پڑی تھیں اور ہال میں ایسی ابتری پھیلی ہوئی تھی جیسے کچھ دیر پہلے وہاں ہاتھیوں کا جھنڈ تباہی مچا کر گیا ہو۔

فیری جو پیانو کے قریب ہاتھ پھیلائے پڑا تھا اس کی گردن ایک خاص زاویے پر مڑی ہوئی تھی۔ مائیک کو یقین تھا کہ وہ اب تک دار فانی سے کوچ کر چکا ہوگا۔ مائیک فیری کے قریب گیا تو اس نے فیری کو گہری گہری سانسیں لیتے دیکھا اس کے سینے سے خون ابل ابل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ مائیک نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا نام پکارا اور اس کے چہرے کو تھپتھپایا تو فیری نے اٹک اٹک کر کہا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔ سائر نے ہلاک۔۔۔ کیا۔۔۔ ہے۔۔۔ گولی ماری ہے۔"

"تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" مائیک نے اسے تسلی دی۔ "میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

اس کا خیال تھا کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔" فیری بڑبڑایا پھر اس نے آنکھیں پھاڑ کر مائیک کو دیکھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

مائیک بولا۔ "فیری خدا کے لیے میری بات سنو میں اس وقت تمہیں پوری کہانی نہیں سنا سکتا بس یوں سمجھ لو کہ ایک بے گناہ آدمی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" فیری ڈوبتی آواز میں بولا۔ سینے کے علاوہ اس کے منہ سے بھی خون بہتا دکھائی دیا۔ اس نے کہا۔ "میں۔۔۔ نے کوئی۔۔۔ جرم نہیں کیا ہے۔۔۔ وہ لوگ تو عطیات۔۔۔ میری موسیقی سن کر۔۔۔"

مائیک نے مایوسی سے ٹھنڈی سانس لی۔ فیری اپنی زندگی ہار رہا تھا اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔

"میں تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں فیری!" وہ بولا۔ "میں تو ٹونی جیرک کی بات کر رہا ہوں جسے والٹر ہیون کے قتل کے الزام میں پولیس نے پکڑ لیا ہے والٹر ہیون تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا تھا نا۔"

"نہیں۔" فیری نے سرگوشی کی۔

"کیا والٹر منشیات کا عادی تھا۔ تم اسے اس وجہ سے بلیک میل کر رہے تھے۔"

"موسیقی۔۔۔" فیری بولا اس کی ذہنی رو بہک رہی تھی۔

"میں پیانو بجا رہا ہوں۔۔۔ سائر! تم عطیات۔۔۔ جمع کر لو۔۔۔ حاضرین۔۔۔!"

مائیک نے اس وقت بہت بے بسی محسوس کی۔ موت فیری کو اتنی مہلت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اس کے سوالوں کا جواب دے سکے۔ اس نے اپنا سوال دو تین بار کیا اور پھر وضاحت سے بولا۔ "میں والٹر کی بات کر رہا ہوں جو گورنر کا انتخاب لڑنے والا تھا۔ سائر اس کے ہاتھ منشیات فروخت کر رہا تھا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" فیری نے آخری سانسوں کے درمیان کہا۔ "وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ عورت"

☆☆☆

"مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" ایڈرین نے برانڈی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

مائیک اس وقت اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور مطالعہ گاہ کی طرف کا دروازہ بند تھا وہ رات گئے اس سے ملاقات کرنے پہنچا تھا اور اس وقت تمام ملازمین وہاں سے جا چکے تھے۔

"یہ معاملہ دیر تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔" مائیک بولا۔ "مگر جب منشیات فروش سائر کا کردار بیچ

میں آیا تو سارا کیس حل ہو گیا۔"

"مگر تم نے غلط اندازہ لگایا ہے۔" ایڈرین نے شراب کا گلاس درمیانی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں ایسی کوئی عورت دکھائی دیتی ہوں۔"

"پہلے میرا خیال تھا کہ والٹر اس عادت بد میں مبتلا ہوگا۔" مائیک بولا۔ "چوں کہ وہ گورنر کی حیثیت سے انتخاب لڑنے جا رہا جا رہا تھا اس لیے سائز کے دھمکانے پر ڈر گیا ہوگا مگر یہ میری خام خیالی تھی ایڈرین والٹر منشیات استعمال نہیں کرتا تھا۔"

"تم اس بارے میں اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو جب کہ اس کی لاش قبر میں۔۔۔" ایڈرین بولی۔

"فیری جو کے اس ہلکے سے اشارے کے بعد مجھے تمہاری بیماری یاد آئی اچانک تمہارے ہاتھ پیر کانپنا اور آنکھیں چڑھ جانا وغیرہ تم مخصوص قسم کے پلو استعمال کرتی ہو اور پوری آستین کا لباس پہنتی ہو۔"

"مجھے پوری آستین کی فراکیں پسند ہیں اور جہاں تک پلز کا تعلق ہے تو میں نے کب یہ دعوا کیا ہے کہ میں صحت مند عورت ہوں۔" ایڈرین بولی۔

"ایڈرین کیا تم مجھے اپنے بازو دکھا سکتی ہو۔ کیا تمہارے بازوؤں پر انجکشنوں کے نشانات نہیں ہیں؟"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے مائیک! میرے بازوؤں پر ایسے نشانات ہیں مگر تم نے یہ نتیجہ کیوں کر اخذ کر لیا کہ میں منشیات کی عادی ہوں۔ تم میرے والد سے پوچھ سکتے ہو میں تو وٹامنز کے انجکشن لے رہی ہوں۔" اس نے کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "اگر کسی پن کش کی مانند میرے بازو سوراخ دار ہیں تو تم نے یہ کیوں کر۔۔۔"

"ایڈرین تم بظاہر اس لیے نارمل دکھائی دیتی ہو کہ تمہیں ایسی ادویات مسلسل ملتی رہی ہیں ان میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" ایڈرین برہم ہو کر بولی۔ "میں نے تمہاری خدمات اس لیے حاصل نہیں کی تھیں کہ تم میرے ہی پیچھے پڑ جاؤ اور مجھ پر ہی الزامات عائد کرنا شروع کر دو۔"

"میں تمہارا وکیل ضرور ہوں۔" مائیک بولا۔ "مگر میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں، میں تمہیں تو کیا نینسی کو بھی معاف نہیں کر سکتا اگر اس نے بھی کوئی غیر قانونی کام کیا تو میں ان پر بھی گرفت کروں گا۔ میں وکیل ہوں اور ہر حالت میں قانون کی سربلندی چاہتا ہوں۔"

"مائیک تم نے بہت بکواس کر لی۔" ایڈرین بولی۔ "اب تم یہاں سے جا سکتے ہو۔"

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ٹونی جیرک پھانسی پر لٹک جائے۔" مائیک نے سوال کیا۔ ایڈرین کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔" وہ چیخی۔ "میں تمہاری خدمات حاصل نہیں کرنا چاہتی۔"

"میں صرف اپنے لیے کام کر رہا ہوں ایڈرین!" مائیک بولا۔ "صرف اپنے لیے۔۔۔ اپنے تجسس کو دور کرنے کے لیے، تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔"

"اگر تم یہاں سے نہیں جانا چاہتے تو میں خود چلی جاتی ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی مگر مائیک اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ "میں تمہیں یہاں سے حقیقت حال معلوم کیے بغیر نہیں جانے دوں گا، تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ یہ لت تمہیں پہلے کہاں لگی تھی۔ کیا نیویارک میں؟"

"مائیک! پلیز مجھے جانے دو۔" ایڈرین بولی۔

"تم کیا استعمال کرتی ہو؟ ہیروئن۔۔۔؟ تم نے اس کا آخری ڈوز کب لیا تھا۔؟"

"مجھے جانے دو مائیک! تم میرے ہی گھر میں مجھے قیدی نہیں بنا سکتے۔"

"تم جب تک میرے سوالوں کے جوابات نہیں دوگی، میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" مائیک بولا۔

ایڈرین نے کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"اس کا ابھی فیصلہ ہو جائے گا ایڈرین! جب تمہیں منشیات کی اگلی خوراک نہیں ملے گی تو تم خود ہی اپنی بوٹیاں نوچ لوگی۔"

"اوہ! تم بہت احمق ہو۔" ایڈرین دانت پیس کر بولی۔ "کیا میں اس کمرے میں ساری رات گزاروں گی۔ کیا میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر نہیں جا سکتی۔ کیا میں پولیس کو نہیں بلا سکتی اور پھر میرے والد۔۔۔! وہ بھی بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

"میں بھی ان کا منتظر ہوں۔" مائیک بولا۔ "وہ تو ڈاکٹر رہ چکے ہیں انہیں بہ خوبی تمہارے بارے میں علم ہوگا۔"

ایڈرین کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ اس کی سانس بتدریج پھول رہی تھی۔

"تمہارے والد کو بھی تمہاری حالت کا علم ہے، ہے نا۔" مائیک نے کہا۔ "منشیات فراہم کرنے میں انہوں نے تمہاری مدد کی ہوگی۔"

"تم بہت خبیث آدمی ہو مائیک!"

"وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور تمہارے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔" مائیک بولا۔

ایڈرین نے چھلانگ لگا کر دروازے تک پہنچنے کی کوشش کی مگر مائیک نے اسے دھکا دے کر صوفے پر گرا دیا۔

ایڈرین نے روہانسی آواز میں کہا۔ "والٹر نے خودکشی کی ہے میں بے قصور ہوں۔"

"وہ جانتا تھا کہ تم نشے کی عادی ہو اسی وجہ سے اسے بلیک میل کیا گیا اس نے عزت پر حرف آنے کے ڈر سے خودکشی کر لی۔"

"تم یوں نہیں مانو گے۔" ایڈرین پاگلوں کی طرح چیخی۔ اس نے کمرے میں موجود چیزیں ایک ایک کر کے اس کی طرف اچھالنا شروع کر دیں۔ مائیک اچھل اچھل کر اپنے آپ کو زخمی ہونے سے بچا رہا تھا۔

"ایڈرین تمہیں خوراک نہیں ملی تو تم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔" مائیک بولا۔ "دیکھو تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔"

"قاتل۔۔۔ قاتل۔۔۔ تو مجھے مارنا چاہتا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا اور آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی اور ایلڈن نے بلند آواز سے کہا۔ "ایڈرین۔۔۔ ایڈرین! دروازہ کھولو۔"

"ڈیڈی!" ایڈرین بچوں کی طرح چلائی اور بے تحاشا دروازے کی طرف بڑھی۔

مائیک اس بار اس کی راہ سے ہٹ گیا۔ ایڈرین نے دروازہ کھولا اور اپنے باپ کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"اوہ ڈیڈی!" اس نے سسکی لے کر کہا۔ "مائیک کو میرے بارے میں پتا چل گیا ہے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ پتا چل گیا۔۔۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو مائیک!" ایلڈن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی تباہ کر لی اور گھر برباد کر لیا۔ ایڈرین پر اس کا بہت برا ردعمل ہوا وہ اس خراب عادت میں مبتلا ہو گئی۔"

"آپ کا مطلب ہے منشیات وغیرہ۔" مائیک نے سوال کیا۔

"ہاں میں ایک ڈاکٹر ہوں اور بہ خوبی جانتا ہوں کہ ایسے عادی نشے بازوں کا کیا انجام ہوتا ہے مگر نیویارک کی جہنمی زندگی نے اسے بھی کھا لیا۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے اس نے ان چیزوں کا سہارا لینا شروع کر دیا جو انسان کو تباہی اور بربادی بلکہ بعض اوقات موت کے دہانے تک لے جاتی ہیں۔"

"آپ نے اس کا علاج کرنے کی کوشش نہیں کی۔" مائیک نے سوال کیا۔

"کیا تھا۔۔۔ مگر جب بات میرے علم میں آئی تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ نشے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ میں اس کا علاج کرنے سے قاصر رہا۔"

"آپ نے پھر محبت میں اسے یہ چیزیں خود فراہم کرنا شروع کر دیں۔" مائیک بولا۔

"ہاں۔" ایلڈن نے اعتراف کیا۔ "چوں کہ میں ان دنوں پریکٹس کر رہا تھا اس لیے میرے لیے ایسی دوائیں فراہم کرنا دشوار نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ تباہی کے راستے پر گامزن ہے اور لحظہ بہ لحظہ

موت سے قریب ہوتی جارہی ہے مگر اسے نارمل رکھنے کے لیے میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے زہر دیتا رہا مگر یہ عمل زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ میڈیکل بورڈ نے اپنی تحقیقات شروع کر دیں انہیں بھنک مل گئی تھی کہ ڈاکٹر صاحبان بھی چوری چھپے ہیروئن اور مارفیا سپلائی کررہے ہیں۔"

"آپ کا لائسنس چھین لیا گیا ہوگا۔" مائیک نے استفسار کیا۔

"اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی میں نے استعفا دے دیا تھا۔" ڈاکٹر ایلڈن بولا۔ "میں نہیں چاہتا تھا کہ میں بورڈ کی گرفت میں آؤں۔"

"اس کے بعد آپ نے ان چیزوں کو حاصل کرنے کی غیر قانونی کوششیں کی ہوں گی۔" مائیک نے سوال کیا۔ "اور اس سلسلے میں سائر جیسے بدقماش لوگوں سے رابطہ پیدا کیا ہوگا۔"

"ہاں، یہی ہوا تھا۔"

"پھر ایڈرین کی شادی والٹر ہیون سے ہوئی تو وہ منشیات اسے فراہم کرنا پڑی ہوں گی۔" مائیک نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ والٹر کو ایڈرین کی اس عادت کا علم نہیں تھا۔ میں ایڈرین کو یہ چیزیں مسلسل فراہم کرتا رہا اور نوبت دیوالیے تک آ گئی کیوں کہ سائر نے مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں فیری جو کے پھندے میں پھنس گیا۔"

"گویا آپ بھی اس کے ہاں پیانو سننے جاتے تھے۔" مائیک نے پوچھا۔

"ہاں۔ فیری نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ ساری دنیا اور خصوصاً والٹر کو سب کچھ بتا دے گا۔ میں اسے ہر ماہ خوف زدہ ہو کر ایک ہزار ڈالر ادا کرتا رہا۔"

"مگر مجھے ایک دعوت نامہ والٹر کے مطالعہ گاہ سے بھی ملا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس کی خبر ہو گئی تھی۔"

"ہاں، کیونکہ والٹر کو میں نے بتایا تھا۔" ایلڈن بولا۔ "میں منشیات فراہم کرنے اور بلیک میلنگ کی رقم ادا کرنے میں قلاش ہو چکا تھا۔ اگر میں فیری عطیات نہ دیتا تو وہ ساری دنیا میں اس بات کی تشہیر کر دیتا اس لیے میں نے اپنے داماد کو یہ باتیں بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ اسے یہ باتیں سن کر صدمہ پہنچے گا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ایڈرین کی محبت سے مجبور ہو کر اسے بچا لے گا۔ وہ اسے بدنامی کے گڑھے میں نہیں گرنے دے گا مگر میرا خیال غلط نکلا۔ گورنر کی نشست کے لیے انتخاب لڑنے جارہا تھا اسے اندیشہ ہوا کہ اگر یہ باتیں منظر عام پر آ گئیں تو اس کی شہرت اور ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا مسٹر مائیک! اس نے مجھ سے ایک بہت ہولناک بات کہی۔"

"وہ کیا۔۔۔؟"

"اس نے کہا کہ وہ ایڈرین کو طلاق دے دے گا۔ وہ ایڈرین کی مدد کرنے پر تیار نہیں تھا اور اس سے صاف طور پر دامن بچانا چاہتا تھا۔ یہ جواب سن کر مجھے طیش آ گیا میری بچی کی زندگی کا سوال تھا۔ وہ اسے زندہ درگور کرنے جارہا تھا۔ میں نے سوچا میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا اس نے اپنی میز سے قلم اور کاغذ نکالا اور اس پر لکھا۔"

"ایڈرین۔۔۔! مجھے معاف کر دینا۔۔۔"

میں غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھپٹ کر والٹر ہیون کی ڈیسک کی دراز کھولی اور ریوالور نکال لیا۔ اس کو ڈرانے دھمکانے پر بھی کام نہ بنا تو میں نے جنونیوں کی طرح بغیر سوچے سمجھے گولی چلا دی۔ پھر میں نے ریوالور کو اس کے ہاتھ کے پاس پھینکا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ یہ میری زندگی کی ایک اور بڑی غلطی تھی مگر مائیک یہ سب میں نے اپنے لیے نہیں اپنی بچی کو خوش رکھنے کے لیے کیا تھا۔

بوڑھا ڈاکٹر ایلڈن خاموش ہو کر سسکیاں لینے لگا۔ مائیک کو سارا نیویارک بلکہ سارا امریکا سسکیاں بھرتا محسوس ہوا۔ نئے عہد کا انسان خود چل کر تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔

عظیم امریکا کے عظیم المیے کا انجام یہی ہے۔

چارہ ساز

سلطان جمیل نسیم

زندگی دینے اور لینے والی بے شک خدا کی ہی ذات ہے۔۔ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل موت سے لڑتے ایک بزنس مین کی کہانی

مختصر مگر سبق آموز کہانی

سیٹھ عباس کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کر دیا گیا اور گھنٹہ بھر کے اندر شہر کے وہ تمام ڈاکٹر معائنہ کر گئے جو اپنے شعبہ کے ماہر تھے۔ معائنہ کیا کر گئے، سب اسپتال میں جمع ہو گئے اور سب اس بات پر متفق بھی تھے کہ متعلقین نے نہایت بروقت فیصلہ کیا۔ جو وقت ضائع کیے بغیر اسپتال لے آئے یوں فوری طبی امداد مل جانے سے وہ خطرہ ٹل گیا جو ایک ناگہانی آفت کی طرح گھر میں گھس آیا تھا۔

وہ چار دن آئی سی یو میں رہیں گے اور جیسے ہی طبیعت سنبھل جائے گی، اسپیشل کمرا میں منتقل کر دیا جائے گا۔ فی الحال احتیاط اور مستقل نگرانی کی ضرورت ہے

"What do you mean by NIGRANI" بڑے بیٹے کو انگریزی بولنے کا شوق تھا۔ اس نے فوراً ڈاکٹر سے سوال کر ڈالا۔

"ڈاکٹر صاحب کا مطلب ہے Medical Supervision، میں ابھی ابا جی کو رہنا ہے۔"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا اور تائید میں تقریباً سب ہی ڈاکٹروں نے گردن ہلادی۔

دس پانچ منٹ ٹھہرنے کے بعد سب سے نامور ڈاکٹر سیٹھ عباس کے بیٹوں کے پاس آیا۔

''اللہ کا شکر ہے اب کسی قسم کی تشویش کی بات نہیں ہے ۔ڈاکٹر منصور یہاں موجود رہیں گے۔ ہم سب کے contact number ان کے پاس ہیں۔ ان شاء اللہ اب ضرورت تو نہیں رہے گی پھر بھی آپ جب ضرورت محسوس کریں۔ ڈاکٹر منصور! ہم میں سے کسی کو بھی کال کرلیں گے۔''

نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ ڈاکٹر کی بات مان لی گئی۔

ڈاکٹر منصور جب اکیلے رہ گئے تو سیٹھ عباس کے گھر والے ان کے چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔

''کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک بیٹھے بٹھائے اندر ہی اندر ایک ایسا انقلاب اٹھ کھڑا ہوگا کہ ہمیں اپنی دنیا تلپٹ ہوتی ہوئی نظر آنے لگے گی۔'' بڑے بیٹے نے کہا جو لاڈ پیار اور حالات کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کرسکا تھا۔ اس لیے وہ ثقافتی اور ادبی انجمنوں کی صدارت کے لیے بلایا جاتا اور سیٹھ عباس کی ہدایت کے مطابق لاکھ پچاس ہزار کی امداد نہیں بلکہ ''گرانٹ'' کا ضرور اعلان کرتا۔''

''آپ نے تو دیکھا ہے ڈاکٹر صاحب! ظاہری کوئی علامت ایسی نہیں۔ کھلاڑیوں کی طرح چھریرا بدن ہے، کھانے پینے سے زیادہ دوسروں کو کھلا پلا کے خوش ہونے والے مرغن غذاؤں کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے تھے۔ بس زندہ رہنے کے لیے ہلکے پھلکے کھانے۔ کہتے تھے، میرا بس چلے تو گاندھی جی کی طرح ایک بکری پال لوں۔'' بیگم نے اتنا کہنے کے بعد دوپٹا کے پلو کو آنکھوں پر اس طرح رکھا کہ چہرہ چھپ گیا۔ ''جی ہاں ڈیڈی کے لیے کھانا کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ اصول، صحت کے اصولوں پر ہمیشہ چلے۔ صبح سویرے گھنٹہ بھر کی سیر پابندی کے ساتھ۔''

''مارننگ واک تو چھوڑتے ہی نہیں تھے اپنے ملک میں ہوں یا باہر Early to bed early to rise کا اصول رہا۔''

''ایک بار میں نے کہا ڈیڈی! آج کل اغوا برائے تاوان کا موسم زوروں پر ہے اور آپ تڑکے ہی نکل جاتے ہیں۔۔۔ تو یہ سن کر ہنسے۔۔۔ اور پہلی بار ہم سے کہا۔۔۔ میں ہر مہینے تاوان پابندی سے دیتا ہوں۔۔۔ تم سب کی طرف سے بھی۔۔۔ میرے گھر کا کوئی فرد اغوا نہیں ہوسکتا بلکہ ایک طرح وہی لوگ گھر سے نکلتے ہی میرے باڈی گارڈ بن جاتے ہیں۔''

''He is genius ---'' ''شراب تو دور کی چیز ہے انہوں نے کبھی پان سگریٹ کو منہ نہیں لگایا۔

شوق ایک ہی رکھا۔۔۔ بزنس۔۔۔ مگر بزنس کو بھی کبھی جی کا جنجال نہیں بنایا۔''

''شطرنج کی طرح بہت سوچ سمجھ کر چال چلتے۔۔۔ اور مہارت اس بلا کی کہ کیا کہوں۔۔۔ کیمیا گر سمجھیے۔۔۔ مٹی کو بھی ہاتھ لگایا تو وہ سونا ہوگئی۔''

I think you can say, it, luck and judgement

''لیکن یہ اچانک۔۔۔ عقل کام نہیں کرتی کہ ایسا کیوں ہوا۔'' کاروبار میں اعلا سوجھ بوجھ رکھنے والے بیٹے اور وفاق میں تجارت کی وزارت پر فائز داماد اپنی اپنی کہنے کے بعد دم بھر کے لیے رکے تو بیگم نے بات کا سرا تھام لیا۔

''جب سے بچے بڑے ہوئے ہیں سارا کام ان کے سپرد کردیا ہے۔ ہر ایک کو اس کا حصہ دے دیا۔۔۔ بچوں نے پوچھا۔۔۔ ڈیڈی! آپ کیا کریں گے۔ تو جواب دیا۔ پہلے میں چھٹیاں مناؤں گا۔۔۔ تمہاری ماں کے ساتھ ورلڈ ٹور پہ جاؤں گا، پھر سوچوں گا کہ کیا کیا جائے۔۔۔ کل ہی تو ہمارے ٹکٹ آئے تھے۔۔۔'' یہ کہتے کہتے ماں روہانسی ہوئیں تو پاس بیٹھے چھوٹے بیٹے نے اپنے بازوؤں میں بھرلیا اور کہا۔

"Dont worry Mom you will go with Dad according to your plan ان شاء اللہ۔''

منجھلے بیٹے نے ماں کا دھیان بٹانے یا باتوں میں اپنا حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک بار ڈیڈی ہانگ کانگ اور سنگاپور گئے تھے، چار دن کا ٹور تھا، چار کام کی باتیں بتا گئے۔ مجھے یاد ہے ایک بات یہ تھی کہ آدمی دھوکا اسی سے کھاتا ہے جس پر بھروسا کرتا ہے، کام پر نظر رکھو کام کرنے والے پر نہیں۔''

''مجھے یاد ہے انہوں نے کہا تھا۔ کام کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں اصل بات کام لینا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ۔۔۔! ڈاکٹر صاحب ہمیں ڈیڈی کا وے آف ٹریڈ ذرا اولڈ اسٹائلش لگتا تھا۔۔۔ لیکن جب لبرٹی ملی تو ہم نے اپنے اسٹائل میں کام شروع کردیا۔ Oh my God! چار مہینے میں اتنا Ups Down بلکہ ڈاؤن ہی ڈاؤن۔۔۔ ناٹ اونلی وِدمی۔۔۔ سب کے ساتھ اور تو اور ہمارے منسٹر صاحب کے ساتھ بھی ان کو کسی Religious ministry میں لگا دیا گیا۔۔۔ ہم لوگ تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔۔۔ جب ڈیڈ آئے تو ہم لوگ ان کے سامنے اپنی ناکامیوں کے چارٹ سنانے لگے۔۔۔ ہنس ہنس کے سب کی باتیں سنتے رہے۔۔۔ پھر Very Next day سب ٹھیک ہوتا چلا گیا۔

وفاقی وزیر نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہمارے ڈیڈ گریٹ پلانر ہیں۔۔۔ ان کا ججمنٹ ان کی Prediction اتنی Correct ہوتی ہیں کہ No body can imagine مارننگ واک کرنے والے اور شام کو گاف کھیلنے والے ڈیڈ اور اتنا سیریز ہارٹ اٹیک۔''

''یہ خیال تو کبھی ہمارے دل سے گزرا بھی نہیں تھا۔''

''صبح ٹہل کر آئے۔ آنے کے بعد غسل کیا۔ فجر کی نماز پڑھی اور معمول کے مطابق ناشتے کی میز پر

قبضہ

شادی والے گھر میں اچانک کسی نے آواز لگائی۔ ''بھاگو۔۔۔ مکان میں بم ہے۔''

یہ سننا تھا کہ ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔۔۔ تمام سامان باہر پھینک دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر خالی ہوگیا۔

ایک صاحب گلی کے کونے سے اپنے نوکر کے ساتھ نمودار ہوئے اور چیخ کر بولے۔ ''مکان کو تالا لگادے چھوٹو! کم بخت کرائے داروں نے آٹھ ماہ سے مکان پر قبضہ جما رکھا تھا۔''

آن بیٹھے۔ بیگم نے کہا۔''

گھر والوں کی یہ ساری باتیں بالکل درست تھیں۔ سیٹھ عباس جب ناشتے کی میز پر آکے بیٹھے تو سامنے پڑے ہوئے اخباروں میں سے ایک انگریزی اخبار کا تجارتی صفحہ نکال کے ذرا توجہ کے ساتھ دیکھتے رہے۔ پھر بڑے بیٹے سے کہا۔

''یارن امپورٹ کرو، کاٹن کا فارورڈ میں سودا کرلو۔ اپنی پروڈکشن جتنی بڑھا سکتے ہو بڑھاؤ۔ ڈبل شفٹ میں کام کرو۔ دو مہینے کے اندر مارکیٹ اوپر جانا چاہیے۔''

یہی جملہ ادا ہوا تھا کہ ایک دم کپکپی سی طاری ہوئی اخبار ہاتھ سے پھسل گیا۔ کنڈے کے ساتھ انگلی میں اٹکی ہوئی چائے کی پیالی۔۔۔''

سردی میں بجتے دانتوں کی طرح پرچ سے ٹکرا کے کٹاکٹ کٹاکٹ کی آواز پیدا کرنے لگی اور اس سے پہلے کہ میز کے گرد بیٹھے ہوئے بال بچے پوری طرح صورت حال کا اندازہ کرسکیں وہ کرسی پر ایک جانب ڈھلک گئے۔

اسپتال لے جائے گئے تو وہاں مختلف شعبوں کے ڈاکٹر پہلے سے موجود تھے، جو نہیں بھی تھا، وہ دس پانچ منٹ میں پہنچ گیا۔

ساتھ آنے والوں کی گھبراہٹ دیکھ کر کسی نے کہا۔ ”دعا کیجیے۔“

دعا کا لفظ گولی کی طرح لگا۔ کہنے والے کی جانب ایسی خشمگیں نگاہوں سے دیکھا گیا جیسے اس نے بددعا دی ہو۔ جب تمام ماہر ڈاکٹروں نے اطمینان دلا دیا اور ڈاکٹر منصور کو لواحقین کے سپرد کر کے چلے گئے۔ اس وقت بڑے بیٹے کا دوست اسپتال پہنچا۔ ساری صورت حال معلوم کر کے اس نے سرگوشی کی۔

”ذرا باہر آؤ۔“

باہر لے جا کے اس نے کہا۔ ”بھئی مجھے یہاں کے ڈاکٹروں پر بھروسہ نہیں ہے۔۔۔ میری بہن کا کیس بگاڑ دیا تھا کھول کے بیٹھ گئے۔۔۔ وہ خوب ہنسے اسی اسپتال میں۔۔۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ امریکا میں ایک ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر اسٹیوارٹ۔۔۔ وہ شکاگو کے اسپتال میں ہے۔ مصروف بہت ہے مگر ماہر ایسا کہ ادھر نبض پر انگلی رکھی ادھر رکا ہوا دل دھڑکنے لگا۔ میں اپنی بہن کو وہاں لے گیا تھا۔۔۔ اگر ہو سکے تو اسے بلوالو۔“

"Waht do you mean

اگر ہو سکے تو۔۔۔ میں ابھی فون کرتا ہوں۔“

بڑے بیٹے نے منجھلے سے کہا۔ ”یہ ڈاکٹر اسٹیوارٹ کا فون نمبر ہے۔ ان سے کہو فی الفور آجائیں۔“

وفاقی وزیر نے کہا۔ ”میں ابھی پاکستان ایمبسی فون کراتا ہوں۔۔۔ وہ اس ڈاکٹر۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟“

”آپ رہنے دیجیے بھائی جان! ہم ابھی Arrange کیے لیتے ہیں۔“

بڑے بیٹے کے دوست نے یہ بات پھر بتائی کہ ڈاکٹر اسٹیوارٹ جواں سال ہیں لیکن اللہ نے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ اسی سبب سے شہرت اور دولت کی ریل پیل نے مصروف ترین ڈاکٹر بنا دیا ہے۔

دو تین گھنٹہ کوشش کے بعد ڈاکٹر اسٹیوارٹ کی سیکریٹری سے بات ہو سکی۔ اس نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ ان کے بے شمار اپائمنٹس ہیں وہ نہیں آسکتے۔ ہاں اگر مریض کو یہاں لے آئیں تو ایک ہفتہ کے اندر وقت ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔

سیٹھ عباس کے منجھلے بیٹے نے دوبارہ کال ملائی اور اس مرتبہ ڈاکٹر کی سیکریٹری سے بات کرنے کے بجائے اپنے دوست سے بات کی۔

”ڈاکٹر اسٹیوارٹ کو آج ہی یہاں بھیجنے کا انتظام کرو۔ ہر قیمت پر۔۔۔ میرے ڈیڈ کی زندگی سے زیادہ قیمتی کوئی نہیں ہے۔“

پانچ چھ گھنٹے بعد دوست کا ٹیلی فون آیا۔ وہ ساری تفصیل غیر ضروری سمجھ کے نظر انداز کر دی گئی کہ ڈاکٹر کو کیسے اور کتنی فیس دے کر آنے پر رضامند کیا گیا۔ کیسے جہاز کا ٹکٹ حاصل کیا۔ سیٹ کی کنفرمیشن میں کیا کیا کشٹ اٹھانے پڑے۔۔۔ گفتگو کا حاصل۔۔۔ ائر لائن کا نام اور فلائٹ نمبر نوٹ کر لیا گیا۔

ڈاکٹر اسٹیوارٹ کے آنے کا سن کر سب کے چہروں پر رونق آگئی۔

سیٹھ عباس انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے۔ ان کی بیگم نے مشورہ دیا کہ اسپتال میں ڈاکٹر اور دوائیں تو موجود ہیں، اللہ نے چاہا تو کل شام تک امریکی ڈاکٹر بھی آجائے گا۔۔۔ کچھ صدقہ خیرات بھی دے دیا جائے۔ ماں کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی۔ نوکروں کو دوڑا دیا گیا کہ شہر کے سب یتیم خانوں میں پکے پکائے کھانے کی دیگیں پہنچا دی جائیں۔ مدرسوں میں صدقہ، خیرات کی رقم دے کر کہا جائے کہ یٰسین شریف اور ”یا سلامُ“ کا ختم کرا دیا جائے۔

ماں نے اور عباس سیٹھ کی بیٹی نے گھر سے تسبیح منگوالی تھیں۔ خود بھی درود و وظائف تسبیح کے دانوں پر ورد کر رہی تھیں۔ امرا و وزرا کی جن خواتین تک خبر پہنچ گئی تھی وہ آتو گئی تھیں مگر تسبیح ساتھ نہ لا سکی تھیں اس لیے ہونٹ انگلیوں کے اشارے پر چل رہے تھے۔

شہر بھر کے ڈاکٹر جب بھی فرصت پاتے آ کے سیٹھ عباس کو دیکھتے اور متعلقین کو اطمینان دلاتے کہ ماشاء اللہ اب سیٹھ صاحب کی طبیعت سنبھل رہی ہے۔ لیکن کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ دروازے کے شیشے میں سے سب جھانک جھانک کر دیکھتے۔۔۔ اور اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے دوسروں کو تسلی دیتے۔

تیسرے دن شام کو ڈاکٹر اسٹیوارٹ کو پہنچنا تھا۔۔۔ شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں سوئٹ بک کرا دیا گیا تھا اور دوپہر ہی سے دو گاڑیاں انہیں لینے کے لیے ایرپورٹ روانہ کر دی گئی تھیں۔

ڈاکٹر اسٹیوارٹ کا جہاز ابھی پاکستانی فضاؤں میں پہنچا بھی نہیں تھا کہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے ایک ڈاکٹر باہر آیا اور بڑے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا

”مبارک ہو۔ سیٹھ صاحب اب خطرے سے باہر ہیں۔ آپ میں سے کوئی ایک ان سے جا کے مل سکتا ہے۔ لیکن زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔

بیٹے کو دیکھتے ہی سیٹھ عباس کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ پھیلی پھر بہت ہی نحیف آواز میں بولے۔

”یار یہ مجھے کہاں لا کے باندھ دیا ہے۔۔۔ نکالو یہاں سے۔ دم گھٹتا ہے۔“

بیٹے نے باپ کا ہاتھ محبت سے دبایا اور تشویش بھری نظر ڈاکٹر کی طرف ڈالی۔۔۔ اس نے فوراً کہا۔

”آپ فکر نہ کیجیے دو تین گھنٹے بعد روم میں شفٹ کرانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ لیکن وہاں ان کے پاس زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ ہو۔ اور یہ زیادہ باتیں نہ کریں۔

سیٹھ عباس کو جس وقت آئی سی یو سے وی وی آئی پی روم میں شفٹ کیا جا رہا تھا عین اسی وقت ایک دوسرا مریض آئی سی یو میں داخل ہو رہا تھا۔

وہ دوسرا مریض۔۔۔ ڈاکٹر اسٹیوارٹ تھا جس پر جہاز میں ہی دل کا دورہ پڑا تھا۔

شادی سے پہلے

پڑوسن نے نئی نویلی دلہن سے پوچھا۔ ”شادی سے پہلے تم کیا کرتی تھیں؟“

”میں لوگوں کے گھروں میں جھاڑو، پونچھا، برتن اور کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔“ دلہن نے کہا۔

پڑوسن: ”تو پھر تمہیں یہ تبدیلی کیسی لگی؟“

دلہن: ”خاک اچھی لگی، اب یہ سارے کام تنخواہ کے بغیر کرنے پڑتے ہیں۔“

☆☆☆

چھٹے کی تلاش

تھانے کے ایس ایچ او نے ایک سپاہی کو ایک ہی ملزم کی چھ تصویریں دیں اور کہا

”جاؤ اس ملزم کو تلاش کرو۔“

شام کو سپاہی واپس آیا اور بڑے فخر سے بتایا۔

”جناب! پانچ ملزم گرفتار ہو چکے ہیں، چھٹے کی تلاش جاری ہے۔“

☆☆☆

سیٹ خالی نہیں

ایک طالب علم نے داخلے کا وقت گزر جانے کے بعد داخلہ لینے کی کوشش کی تو پرنسپل نے کہا۔ ”معاف کیجیے گا، اب کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔“

طالب علم بولا: ”آپ سیٹ کی فکر نہ کریں، اس کا انتظام میں خود کر لوں گا۔ میرا باپ کارپینٹر ہے۔“

فرضی مقتول

خودکشی کرنے والوں کی آڑلے کر ایک ذہین شخص نے قیمتی جواہرات اڑانے کا منصوبہ بنایا۔۔ لیکن قانون کا آہنی پنجہ بالآخر اس کی گردن کے گرد سخت ہو گیا

صابر حسین

بلند وبالا عمارت کی سولہویں منزل سے ایک شخص کو گرتا دیکھ کر سڑک پر دبی دبی سی چیخیں ابھرنے لگیں۔

اس کا جسم ایک دھماکا سے مارکیٹ اسٹریٹ پر آگرا۔۔۔ پھر وہ شخص آواز نکالے اور ذرا سا تڑپے بغیر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم سڑک پر نظر آنے لگا جس کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک جام ہو کر رہ گیا۔ وہ ایک پستہ قد یونانی تھا جو اسی بلڈنگ کی سولہویں منزل پر رہتا تھا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اور اس نے خودکشی کرلی تھی۔ بات یہیں ختم ہو جاتی تو یہ اپنی نوعیت کا واحد کیس ہوتا جس میں شاید پولیس کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا لیکن یہ خودکشی درحقیقت پے در پے واقعات کی ابتدا تھی جو بعد میں رونما ہوئے۔

اسی ہفتے ایک نوجوان نے آک لینڈ میں ایک سنیما گھر کی چھت سے کود کو خودکشی کی جب کہ اسی ماہ ایک لڑکی نے محبت میں ناکام ہونے کے بعد دل برداشتہ ہو کر گولڈن گیٹ پل سے چھلانگ لگا کر اپنا خاتمہ کرلیا۔ ابھی لوگوں کے ذہنوں میں خودکشی کی ان وارداتوں کا نقشہ تازہ ہی تھا کہ خودکشی کی چوتھی واردات سان فرانسسکو میں ہوئی جہاں ایک ہوٹل کی دسویں منزل کی کھڑکی سے کودنے والے نے اس دور فانی کو ٹھکرا دیا اور اس روایت کو جاری رکھا جو خود کرنے والے یونانی نے شروع کی تھی۔

تمام وارداتیں ایک ہی نوعیت کی تھیں۔ پولیس پوری سرگرمی سے تفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تمام وارداتیں خودکشی کی تھیں اور مرنے والوں حالات سے متاثر ہو کر خود کو ہلاک کرلیا تھا لیکن میں اس نظریے سے متفق نہیں تھا اور ان حادثات کو خود قرار دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا حالانکہ ظاہر ثبوت اور شواہد میرے دعوے کی کھلی تردید کر تھے۔

دن کا بیشتر حصہ عدالت میں گزارنے کے بعد سہ پہر کے وقت میں اپنے دفتر واپس آ گیا۔ دفتر دو افراد میرے منتظر تھے۔ دونوں کے چہروں پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ خاص طور سے عورت تو بے چینی سے کرسی پر پہلو بھی بدل رہی تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ چالیس سال سے کم نہیں تھی۔ وہ قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی اور چہرے مہرے سے شرفا کے کسی قدیم خاندان کی فرد لگتی تھی۔ اس کے خدوخال اس عمر میں بھی کافی دلکش تھے۔

میں جیسے ہی کرسی پر بیٹھا اس نے کہا۔ ''اگر آپ ہی پیسٹر ہیں تو ہمیں ڈسٹرکٹ اٹارنی نے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔'' اس کی آواز میں شیر

تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ڈپٹی چیف ہوں اور تحقیقاتی شعبے کا انچارج ہوں۔ کہیے، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“

کمرے میں پھیلی ہوئی بھینی بھینی سی خوشبو نے فضا کو خوش گوار بنا دیا۔ عورت اپنی سیٹ پر کسمسائی۔۔۔ پھر اس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

”مسٹر پیٹر! ہم آپ سے ایک اہم مسئلے پر بات چیت کرنے آئے ہیں جس کا صیغہ راز میں رہنا بے حد ضروری ہے۔ توقع ہے آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔“

میں بات شروع ہونے سے پہلے ہی معاملے کی پراسرار نوعیت کا اندازہ لگا چکا تھا اس لیے سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ کا معاملہ قانونی اور جائز ہے تو آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں ورنہ مجھے افسوس ہے کہ میں۔۔“

میری بات شاید اسے ناگوار گزری تھی۔ اس کے پرکشش چہرے پر برہمی پیدا ہوگئی اور قدرے غصے سے بولی۔ ”آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ میں کسی ایسے مقصد کے لیے آپ کے پاس نہیں آئی جو غیر قانونی ہے۔ مسٹر! میں کوئی جرائم پیشہ عورت نہیں ہوں بلکہ میرا نام مسز وان ہے اور میں آرس ڈیل خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔“

آرس ڈیل شہر کا ممتاز اور ثروت مند خاندان تھا۔ عورت اپنے لباس اور خدوخال سے بلاشبہ اسی خاندان کی ایک رکن محسوس ہورہی تھی۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”بات چیت شروع کرنے سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ اپنے ساتھی نکولس سولانو کا آپ سے تعارف کرادوں۔ یہ میرا منگیتر ہے۔“

میں نے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو پہلی بار توجہ سے دیکھا جب میں دفتر میں آیا تھا تو وہ اس وقت بھی کمرے میں موجود تھا لیکن میری نظر اس کی طرف نہیں اٹھی تھی نکولس کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔۔۔

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو نک!“

میرے انداز سے مسز وان سمجھ گئی کہ میں اس کے منگیتر کو پہلے سے جانتا ہوں اور نہ میں پہلی ملاقات میں اتنی بے تکلفی سے اس کا وہ نام نہیں لے سکتا تھا جو اس کے خاص حلقے میں معروف تھا۔ مسز وان نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا آپ مسٹر سولانو کو پہلے سے جانتے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم پرانے دوست ہیں کیوں نک! ٹھیک ہے نا۔“

نک کے چہرے پر ندامت کے تاثرات پیدا ہوئے لیکن اس نے فوراً ہی سنبھلتے ہوئے کہا۔

”ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں اسے گہری قسم کی دوستی تو نہیں سمجھتا البتہ صورت شناسائی کی حد تک ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔“

نکولس دراصل ایک عادی اور پیشہ ور چور تھا۔ اس کا اور میرا آمنا سامنا اس وقت ہوا تھا جب میرا تعلق سراغ رسانی کے بیورو سے ہوا کرتا تھا۔ میں نے اسے جواہرات اور چودہ سنہری گھڑیوں کی چوری کے الزام میں گرفتار کرکے مسروقہ مال برآمد کرایا تھا۔ اس نے یہ سامان ایک مقامی جیولر کی دکان سے چرایا تھا۔ اسے بھی غالباً وہ سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس لیے وہ قدرے پریشان نظر آرہا تھا۔

میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”مسٹر نک! آپ کو آخری مرتبہ میں نے شاید چھ یا سات سال پہلے دیکھا تھا اور ہم ایک ہی کشتی کے شریک سفر تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسی سفر کے دوران سان کونٹین تک ہم ایسے ساتھی تھے جنہیں کوئی الگ نہیں کرسکتا تھا۔“ میرا اشارا اس ہتھکڑی کی طرف تھا جسے حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے یوں استعمال کیا تھا کہ ایک کڑی میری کلائی میں تھی اور اس کا دوسرا حلقہ نک کی کلائی میں پڑا ہوا تھا۔

نکولس نظر جھکائے میری بات سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس کا ماضی یاد دلا کر اسے اذیت پہنچا رہا

وہ بے حد دھیمی آواز میں بولا۔ ”لیکن مسٹر پیٹر! اب میری زندگی کا نیا باب شروع ہو رہا ہے میں پہلے سے بے حد مختلف بن گیا ہوں۔“

میں نے مسز وان کی طرف دیکھا جو سرنگوں کیے بیٹھی تھی۔ اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر مزید بحث تلخی پیدا کرسکتی ہے، مسٹر پیٹر اگر اسے یہیں ختم کر دیا جائے تو میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے مسز وان! اب آپ اپنی آمد کا مقصد بیان کرسکتی ہیں۔“ میں بدنام چور نکولس کو چھوڑ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”آپ نے وان آرس ڈیل خاندان کے جواہرات کے متعلق تو ضرور سنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔

میں ان کے بارے میں سن چکا تھا۔ یہ جواہرات مسٹر آرس ڈیل نے اپنی بیوی کو شادی کے موقع پر بطور تحفہ دیے تھے۔

”ہاں! میں نے ان کے متعلق سن چکا ہوں۔“ میں نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”وہ جواہرات چوری ہوگئے ہیں۔“ مسز وان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ بے اختیار میری نظریں نکولس کی طرف اٹھ گئیں۔ میری آنکھوں میں شک کی جھلک دیکھ کر نکولس نے جلدی سے کہا۔ ”مسٹر پیٹر! اس سلسلے میں آپ جو سوچ رہے ہیں، وہ بے بنیاد ہے۔“

”یقیناً۔۔۔“ مسز وان نے کہا۔ ”جواہرات کی چوری کے سلسلے میں مسٹر نکولس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا اور میں اسے اچھا بھی نہیں سمجھوں گی۔ مسٹر پیٹر اگر آپ نے یہ سوچا تو میں سمجھوں گی آپ ہماری بے عزتی کر رہے ہیں۔“ تھوڑی دیر خاموش رہ کر مسز وان نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے وہ جواہرات ہر قیمت پر اور فوری طور پر ملنے چاہئیں۔۔۔“

مسز وان کی یہ بات مجھے بے حد عجیب لگی۔ وہ مجھے یوں حکم دے رہی تھی جیسے وہ جواہرات صرف میرے ہی پاس ہوں۔ میں نے اس وقت کسی رد عمل کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ میرا پیشہ اس پہلو سے عجیب سا ہے۔ سب کی باتیں صبر وسکون سے سننا اور اپنا کام مہارت سے کرنا ہی میرا فرض ہے لہٰذا میں نے مسز وان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے جواہرات آپ کو ضرور ملنے چاہئیں لیکن کیا آپ نے چوری کی رپورٹ درج کرادی ہے؟“

مسز وان نے نظر جھکالی۔ اس کی برہمی یکا یک ختم ہوگئی پھر وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ حالات سے آپ بخوبی واقف ہیں اس لیے پولیس سے کیسے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ میں چوری اور پھر برآمدگی کے سلسلے میں تشہیر سے خائف ہوں۔ میرا خیال ہے جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں اسے آپ بخوبی سمجھ چکے ہیں۔“

میں سب کچھ سمجھ گیا۔ یہ میری لیے حیرت کی بات تھی کہ مسز وان بھی نکولس کے ماضی سے واقف ہے۔ پولیس کے ہاتھوں میں معاملہ جانے سے نکولس کے بے نقاب ہونے کا خطرہ تھا۔ اس صورت میں معاشرے میں مسز وان کا کیا مقام رہ جاتا۔۔۔ جو اس چور سے شادی کرنے والی تھی۔

میں نے چوری کے سلسلے میں ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال کیا۔ ”یہ جواہرات کہاں سے چرائے گئے ہیں؟“

”میری گردن سے۔“ مسز وان نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پریڈ ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ میں اس تقریب میں نکولس سے منگنی کا اعلان کرنا چاہتی تھی۔ اسی دعوت کے دوران جواہرات غائب ہوگئے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں جواہرات کی واپسی کے سلسلے میں تشہیر کو کیوں پسند نہیں کرتی۔ میں، نکولس کے ماضی سے اچھی طرح واقف ہوں اگر اسے بیچ میں گھسیٹا گیا تو میں بھی بدنام ہوجاؤں گی تاہم مجھے یقین ہے کہ نکولس کسی طرح بھی اس معاملے میں ملوث نہیں ہے۔“

مسز وان جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اس کی اپنی سوچ تھی، بہر حال میں تو نکولس جیسے شاطر چور کو شبہ کی نظر

سے ہی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے مسز وان سے وہ تمام باتیں پوچھ لیں جن کی مجھے ضرورت تھی اور جن کو بنیاد بنا کر میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

"میں جواہرات تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے نکولس سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنے کی اجازت دیجیے۔" میں نے بالآخر کہا۔

مسز وان نے نکولس کو دیکھا اور کہا۔ "نکولس! میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم آٹھ بجے تک پہنچ جاؤ گے نا۔"

نکولس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور مسز وان خوشبوؤں کی لہریں سمیٹ کر میرے دفتر سے چلی گئی۔ کمرے میں نکولس میرے ساتھ تنہا رہ گیا۔ وہ جاذب نظر شخصیت کا مالک تھا۔ میرا خیال ہے اس کے ظاہری روپ میں ایسی کشش موجود تھی کہ مسز وان جیسی دولت مند عورتیں بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ وہ اب پہلے سے بہت بدلا ہوا لگتا تھا۔ اپنے لباس کی تراش خراش کے اعتبار سے وہ ایک وجیہہ جوان نظر آ رہا تھا اگر اس پر چوری کا عیب نہ لگا ہوتا تو وہ بلاشبہ ایک تنومند اور شان دار شخص ہوتا۔ اس کی پرانی عادات کے پیش نظر میں صرف یہی نظریہ قائم کر سکا کہ وہ مسز وان سے شادی بھی صرف اس کی دولت کے لیے ہی کر رہا ہے۔ میں نے اپنے اس خیال کا اس پر اظہار بھی کر دیا جس کے جواب میں اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مسٹر پیٹر! مجھے مسز وان کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ میں محسوس کر رہا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن وہ بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا متلاشی تھا۔ آخر کار نکولس ہی نے سکوت توڑا۔

"میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ موقع مل گیا۔" اس نے رک کر سگریٹ سلگائی اور بولا۔ "یہ جواہرات ایک ولیمز نامی شخص نے چرائے ہیں۔"

میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا

"میں ولیمز کے ساتھ مل کر چوری کی واردات کیا کرتا تھا اور اس کاروبار میں ہم برابر کے شریک تھے لیکن دس سال پہلے ہماری راہیں الگ ہو گئیں۔ اس کے بعد، میں نے اسے نہیں دیکھا، لیکن گزشتہ شب جب تقریب کے ہنگامے اپنے عروج پر تھے تو وہ اچانک ہی ہال میں نظر آ گیا اس نے کسی کاؤبوائے جیسا لباس پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے تقریب میں موجود سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں اسے ملاقات مردوں کے لیے مخصوص کمرے میں لے گیا۔ میں نے اسے فوراً چلے جانے کے لیے کہا اور پولیس کو بلانے کی بھی دھمکی دی۔ اسے نہ جانے کیسے میرے بارے میں اطلاع ہو گئی تھی کہ مسز وان میرے ساتھ اپنی منگنی کا اعلان کرنے والی ہیں اس نے جانے سے انکار کرتے ہوئے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر میں نے اسے تقریب میں رکنے کی اجازت نہ دی تو وہ مسز وان کو میرے ماضی سے آگاہ کر دے گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ تقریب میں شامل رہا تو یقیناً کسی نہ کسی پر ہاتھ صاف کر جائے گا مجھے مسز وان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں کہ وہ میرے ماضی سے واقف تھیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ میری کمزوری سے آگاہ ہو جائیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر تم نے کیا کیا۔" میں نے پوچھا۔

اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کے ساتھ سختی کرنا پڑی۔ میں نے اسے دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا۔ وہ مجھے بلیک میل تو نہ کر سکا لیکن کسی نہ کسی طرح ان جواہرات کو لے اڑا جو مسز وان نے پہن رکھے تھے۔

"ہونہہ۔۔۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جواہرات ولیمز نے چرائے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ولیمز کو میں جانتا ہوں اس نے کاؤبوائے کا لباس صرف لوگوں کو متوجہ کرنے اور ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہنا تھا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن اسے کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔" میں نے الجھن سے پوچھا۔

نکولس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"کیا وہ پولیس کو کسی اور مقدمے میں بھی مطلوب ہے؟"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں۔"

"کیا وہ پہلے کسی کیس میں گرفتار بھی ہو چکا ہے۔"

"میرا خیال ہے بارہ سال قبل اسے ڈیٹرائیٹ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس لیے اس کی تصاویر، ہسٹری، فنگر پرنٹس وغیرہ ڈیٹرائیٹ پولیس سے مل سکتے ہیں لیکن اگر اسی دوران وہ میرے سامنے آ گیا تو میں اسے پکڑ کر تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے اظہار تشکر کے طور پر کہا۔ "شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا۔ اس وقت تو میں خود اس کے ہاتھوں پریشان ہوں۔ میں اسے اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری نئی زندگی کا آغاز ہونے سے پہلے ہی اسے تباہ کر دے۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا پھر اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

جمعے کی شب میں معمول کے مطابق کولمبس یونیو گیا جہاں میں اکثر لیفٹیننٹ جانسن اور جارج کے ساتھ رات کا کھانا کھایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا وہ دونوں جلدی چلے گئے ہیں۔ میں نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا۔ "انہوں نے کچھ بتایا نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟"

"سان کارلوس ہوٹل۔۔۔ جہاں نکولس سولانو نامی ایک شخص نے کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی ہے۔"

نکولس کا نام سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔ چند منٹ تو میں کاؤنٹر کلرک کو گھورتا ہی رہ گیا۔

"آپ کو وہ دونوں وہیں مل سکتے ہیں۔" کلرک نے جلدی سے کہا اور میں نے چونک کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے باہر آیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر ہر ممکن تیز رفتاری سے سان کارلوس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے شاید ہی پہلے کبھی زندگی میں اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلائی تھی جس کا مظاہرہ میں آج کر رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے پہنچ کر میں نے کار پارک کی اور اس طرف دوڑا جہاں مجمع لگا ہوا تھا۔ شدید سرد رات میں خودکشی کا یہ واقعہ پہلے واقعات سے کچھ زیادہ ہی پُراسرار لگ رہا تھا۔ کہر کی وجہ سے گلی میں لگے بجلی کے قمقمے بھی مدھم لگ رہے تھے، میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہجوم کے وسط میں ایک بے حس و حرکت جسم پڑا تھا۔ واقعی یہ عادی چور نکولس ہی کی لاش تھی۔ جیف پیری بھی وہیں موجود تھا۔ وہ سان کارلوس ہوٹل کا سراغ رساں تھا۔

"جیف!" میں نے پوچھا۔ "اس نے کون سی منزل سے چھلانگ لگائی تھی؟"

نکولس نے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "دسویں منزل سے۔۔۔"

"کسی نے اسے چھلانگ لگاتے دیکھا بھی تھا۔" میں نے سوال کیا۔

"نہیں، کسی نے اسے چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔ البتہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور ہوٹل میں مقیم ایک شخص اس وقت ضرور متوجہ ہوئے جب وہ زمین پر گر چکا تھا۔"

"اس شخص کا نام بتا سکتے ہو؟"

"برائٹ۔۔۔ اس کا کہنا ہے کہ لاش

تقریباً اس کے قدموں میں آ گری تھی۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر نکولس کو خودکشی ہی کرنا تھی تو اس نے رات کا وقت کیوں منتخب کیا۔۔۔" پھر اسے کسی نے کھڑکی سے چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا جب کہ خودکشی کے پہلے واقعات میں لوگوں نے انہیں چھتوں سے کودتے دیکھا تھا اور خودکشی کرنے والے یونانی کو تو چند لوگوں نے پیار سے اور لالچ دے کر باز رکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔۔۔ پھر میرے ذہن میں جواہرات کی چوری کے سلسلے میں نکولس کے وہ الفاظ گونجنے لگے جن میں اس نے ولیمز نامی ایک شخص کا نام لیا تھا۔ چنانچہ یہ خودکشی کی صورت نہیں تھی بلکہ ہوشیار قاتل نے خودکشی کی حالیہ وبا سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور اس قتل کو بھی خودکشی کی ان وارداتوں کی آڑ میں چھپانا چاہا تھا جو گزشتہ ایک ماہ سے جاری تھی۔

لیفٹیننٹ جانسن اور جارج دونوں دسویں منزل کے اس کمرے کا معائنہ کر رہے تھے جس کی کھڑکی سے نکولس نے چھلانگ لگائی تھی۔ میں نے اس دوران اس شخص برائٹ سے ملاقات ضروری سمجھی جس کے پیروں کے قریب لاش گری تھی اس وقت مجمع سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ لمبے قد کا ایک بے ڈھنگا سا آدمی تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ ایک غائب دماغ فلسفی سا لگا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس حادثے سے بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اس کے کان کے پیچھے صابن کی جھاگ لگی ہوئی تھی جیسے وہ شیو بناتے ہوئے بغیر منہ دھوئے ہی اٹھ آیا ہے۔ اس کی ٹائی بے ترتیب تھی اور لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اس کے واسکٹ کا ایک بٹن بھی غائب تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی پوچھا۔ "مسٹر برائٹ! کیا تم نے اسے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "نہیں! میں نے اسے چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا بلکہ میں اس وقت متوجہ ہوا۔ جب وہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر زمین پر آ گر تھا۔" پھر قدرے توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ "میں کیلیفورنیا اسٹریٹ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اچانک ایک دھما کا سن کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے ایک بے حس و حرکت جسم پڑا تھا جسے دیکھ کر میں اعصابی طور پر انتشار کا شکار ہو گیا۔ دراصل میں بے حد کمزور دل کا مالک ہوں۔ بے چارہ سولانو جوانی میں مر گیا۔

برائٹ سے بات چیت کے بعد میں جانسن سے ملنے دسویں منزل پر چلا گیا۔ وہ اس وقت کمرے میں موجود ضروری جانچ پڑتال میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جارج نے کہا۔ "مرنے والے نے اس کھڑکی سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس نے ایک کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔" اس کا نام نکولس سالانو تھا اور چند دنوں بعد وہ مسز وان نامی ایک دولت مند بیوہ سے شادی کرنے والا تھا۔"

میں نے آگے بڑھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "نکولس ہیروں کا ایک سابق چور تھا لیکن یہ بات راز میں رہے گی کیونکہ یہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کا حکم ہے۔"

جانسن اور جارج کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہے تھے، میں نے مسز وان کے زیورات کی چوری کا واقعہ ان سے پوشیدہ رکھا۔

"ہیروں کا چور ہے۔" جارج حیرت سے بڑبڑایا۔

"چور تھا اب نہیں رہا۔" میں نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ "تم کونٹین پولیس سے اس کے فنگر پرنٹس حاصل کر کے تحقیقات میں مدد لے سکتے ہو۔"

"فی الحال ہم یہاں سے اس کے پرنٹس لے لیں پھر مزید کارروائی کی ضرورت ہوئی تو کونٹین سے ریکارڈ منگوالیں گے۔ ابھی تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ٹائپ رائٹر پر بھی اس کی انگلیوں کے نشانات ہیں یا نہیں۔" جانسن بڑبڑایا۔

"کیسا ٹائپ رائٹر۔۔۔" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

جارج نے ایک کاغذ کا پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ "وہ ٹائپ رائٹر جس پر سولانو نے خودکشی سے قبل یہ خط ٹائپ کیا تھا۔"

میں نے خط لے کر اسے کھولا اور پڑھنے لگا۔

پیاری میتھلڈ اوان!

"میں اب تک تم سے اپنی زندگی کو چھپائے ہوئے تھا، لیکن میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں تمہیں دھوکا دوں اور اپنے ماضی سے آگاہ نہ کروں۔ لیکن موت کے بعد میرا ریکارڈ تمہارے سامنے میرے تمام راز ظاہر کر دے گا۔

میں نے کبھی قانون کا احترام نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ قانون شکنی کی اور کئی بار جیل گیا، لیکن افسوس ایک امر یہ تھا کہ میں اپنی زندگی میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ اس طرح تمہارے اعتماد کو ٹھیس لگتی۔ چنانچہ اپنی اس منحوس زندگی کو ختم کرنے کے ساتھ ہی میں تمہیں اپنے ماضی سے بھی آگاہ کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے تمہارے دل میں میری کوئی خوش گوار یاد باقی رہ جائے۔ میتھلڈ! میں ایسا اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے پرخلوص اور سچی محبت ہے۔

تمہارا نک"

خط پڑھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ خودکشی کی واردات نہیں ہے، بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مسز وان اس کے مجرم ماضی سے واقف تھی اور قاتل شاید اس نکتے سے آگاہ نہیں تھا۔ دوسرے مسز وان نکولس کو سولانو کے نام سے پکارتی تھی اور نک کے نام سے وہ صرف اپنے اس خاص حلقے میں معروف تھا جس میں اسی جیسے چور شامل تھے۔ خط کی عبارت نے میرا شبہ یقین میں بدل دیا اور میں نے قاتل کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جارج اور جانسن ابھی اپنی کارروائی میں مصروف تھے کہ میں نیچے ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ میں نے ٹیلیفون بوتھ سے مسز وان کو فون کیا وہ اپنے گھر پر موجود تھی اور ریسیور اسی نے اٹھایا تھا۔

"مسز وان۔۔۔" میں نے کہا۔ "نکولس سولانو نے۔۔۔"

اس نے جلدی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں اسے تمہارے دفتر میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ میرا خیال ہے وہ ہوٹل سان کارلوس چلا گیا ہوگا تا کہ لباس تبدیل کر سکے لیکن اسے اب تک یہاں آ جانا چاہیے تھا کیونکہ اس نے مجھ سے آٹھ بجے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔"

میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے نک کی موت کے بارے میں بتا دیا یہ سنتے ہی وہ رونے لگی۔ اس کی چیخوں سے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"میرا پیارا نکولس! اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا۔" تھوڑی دیر توقف کے بعد اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "مسٹر پلیز! میں کیا کروں؟"

میں نے دلاسا دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ نک کے سفر آخرت کا انتظام کرے۔ "پولیس کل تک اس کی لاش تمہارے حوالے کر دے گی۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

سان کارلوس ہوٹل شہر کا بہترین ہوٹل تھا اور نکولس کے واقعے سے اس کی ساکھ متاثر ہوگئی تھی۔ میں فون کرنے کے بعد جیف پیری کے دفتر میں چلا گیا، جہاں اخبار نویسوں کا ہجوم تھا۔ وہ جیف سے سوالات کرنے میں مصروف تھے۔ جیف بڑی خوش مزاجی سے ان کے حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر ان کے تلخ سوالات کا جواب دے رہا تھا کیوں کہ وہ کسی اخباری نمائندے کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح ہوٹل کی سالہا سال سے بنی ہوئی ساکھ مزید متاثر ہوسکتی تھی۔

اخباری رپورٹروں کی بھیڑ چھٹنے کے بعد میں،

جیف کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ غالباً وہ اپنی ذہنی تکان دور کر رہا تھا، جو رپورٹروں سے جھک جھک کر دوران پیدا ہوگئی تھی۔ پھر اس نے نگاہ اٹھائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مسٹر پیٹر! کوئی نئی بات سامنے آئی؟''

''نہیں۔۔۔'' میں نے کہا۔ ''میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا نکولس سولانو کے یہاں قیام کے دوران اس کی ٹیلی فون کالیں چیک کی گئی تھیں۔ کیا اس کے اکثر ٹیلیفون آتے تھے۔''

جیف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اس کی شاذونادر ہی کوئی کال آتی تھی۔ وہ دو ماہ سے ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس نے بہت کم کسی سے رابطہ کیا تھا۔ بل باقاعدگی سے ادا کرنے کے علاوہ وہ ہوٹل کے قواعد پر بھی سختی سے عمل کرتا تھا۔ ویسے بھی اس کا تعلق اعلا سوسائٹی سے تھا۔ جس کے بارے میں آپ کو اخبارات کے ذریعے معلوم ہوجائے گا۔''

''وہ آج رات کس وقت ہوٹل آیا تھا؟''

''یہ بات آپ کو کاؤنٹر کلرک سے ہی معلوم ہوسکے گی۔''

میں کاؤنٹر کلرک کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ نکولس چھ بجے سے پہلے ہوٹل واپس آگیا تھا اور اپنی چابی لے کر سیدھا کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس روز کوئی اسے ملنے نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے اس کے لیے کوئی پیغام چھوڑا تھا۔ ٹیلی فون آپریٹر سے بھی بات چیت کرنا ضروری سمجھ کر میں نے اس سے سوال کیا۔ ''کیا مسٹر نکولس کے لیے کوئی کال آئی تھی؟''

آپریٹر نے اپنی ڈائری چیک کر کے جواب دیا۔ ''نہیں۔۔۔ البتہ روم نمبر 1014 سے ایک کال باہر کے لیے ضرور ہوئی تھی۔ جس میں انہوں نے شاید ٹائپ رائٹر کرائے پر طلب کیا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ بات تفتیش میں مزید مدد دے سکتی تھی۔

''مسٹر سولانو نے کس نمبر پر فون کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپریٹر نے مجھے نمبر دے دیا۔ یہ نمبر مل اسٹریٹ کی ایک دکان کا تھا۔ جہاں سے ٹائپ رائٹر کرائے پر حاصل کیے جاسکتے تھے۔ میں ہوٹل سے باہر آیا اور سپلائی کارپوریشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ توقع تو نہیں تھی کہ دکان کھلی ہوگی لیکن خوش قسمتی سے دکان کھلی مل گئی۔ اس بازار کی سب دکانیں چھ بجے ہی بند ہوجاتی تھیں مگر یہ واحد دکان تھی جو رات نو بجے تک کھلی رہتی تھی۔

دکان میں داخل ہوتے ہی ایک نوجوان نے میرا استقبال کیا جو اس وقت سینڈوچ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہوگیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھے رہنے کے لیے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نوجوان نے سینڈوچ ایک طرف رکھا اور بڑبڑایا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''کیا تم نے آج سان کارلوس ہوٹل میں کسی کو ٹائپ رائٹر بھجوایا تھا۔'' میں نے سوال کیا۔

''نوجوان کے چہرے سے یکایک گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی اور وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''یقیناً۔۔۔ اس میں کوئی گڑبڑ ہے مسٹر سولانو؟''

''میں سولانو نہیں ہوں۔'' میں نے جلدی کہا۔

نوجوان کی بوکھلاہٹ بڑھ گئی اور اس نے بے چینی سے کہا۔

''آپ شاید اس لیے آئے ہیں کہ میں نے ٹائپ رائٹر کسی دوسرے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔''

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یقین کرنے کے لیے آیا ہوں کہ تمہاری طرف سے ہوٹل میں مقیم ہمارے گاہک کو فوری اور تسلی بخش سروس فراہم ہوئی ہے یا نہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ مسٹر سولانو نے مشین کے حصول کے لیے ایک فون کیا تھا۔''

''تقریباً سوا چھ بجے۔۔۔ کیا ٹائپ رائٹر کی ڈلیوری میں دیر ہوگئی تھی۔ لیکن میں۔۔۔ میں نے تو دس منٹ کے اندر اندر ٹائپ رائٹر کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

''کمرے کا نمبر تمہیں یاد ہے؟''

اس نوجوان کو ہر چیز گویا ازبر تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''کمرہ نمبر 1014 اور ٹائپ رائٹر اسی کمرے کے لیے بک کرایا گیا تھا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے ٹائپ رائٹر مسٹر سولانو ہی کے حوالے کیا تھا۔''

''یقیناً۔۔۔'' نوجوان نے زور دے کر کہا۔ ''جب میں مشین لے کر وہاں پہنچا تو ایک شخص نے دروازہ کھولا۔۔۔ اور ٹائپ رائٹر لے کر مجھے ٹپ دے دی۔''

''اس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

نوجوان سوچ میں پڑ گیا۔۔۔ کچھ دیر بعد اس نے دھیمی اور تفکر آمیز آواز میں کہا۔ ''مجھے یاد ہے کہ وہ مشرقی طرز کا گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ میں اس کے نقش ونگار کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ غالباً شیو بنانے والا تھا۔ دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو اس کے چہرے پر صابن کی جھاگ تھی۔ اس کا لباس جاپانی ریشم کا بنا ہوا تھا۔''

مجھے یاد آیا کہ میں نے سولانو کی لاش ایسے ہی ریشمی گاؤن میں دیکھی تھی اس نوجوان کی باتوں سے کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی تاہم میں نے کہا۔ ''اگر تم اس سلسلے میں کچھ اور بتا سکو تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔''

''میں اسے زیادہ دیر تک غور سے نہیں دیکھ سکا۔ اس نے مجھ سے مشین لے لی اور ٹپ دیتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا۔۔۔ پھر دروازہ بند کرلیا تھا۔'' قدرے خاموشی کے بعد اس نے مزید کہا۔ ''مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے جناب!''

''نہیں برخوردار۔۔۔'' میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی بلکہ غلطی کسی اور سے ہوئی ہے اور میں اس کی تلاش میں ہوں۔۔۔ سب سے پہلے تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ درحقیقت غلطی کیا ہوئی ہے۔۔۔ یہ غلطی ہی مطلوبہ آدمی تک میری رہنمائی کرے گی۔''

☆☆☆

نو بجے کے قریب میں واپس ہوٹل آگیا۔ میں سولانو کے کمرے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ جیف نے بغیر کسی پس وپیش کے کمرے کی چابی مجھے دے دی اور میں دسویں منزل کے لیے لفٹ پر سوار ہوگیا۔ اگرچہ کمرے میں کچھ ملنے کی توقع نہیں تھی پھر بھی میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شاید کوئی چیز ہاتھ آہی جائے۔

دروازہ کھول کر میں اندر آگیا اور آگے بڑھنے سے پہلے دروازے کو مقفل کرلیا۔ میں نے روشنی کی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ سولانو کو قتل کیا گیا ہے۔ شروع میں تو کمرے کی ہر چیز کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کس چیز کو آلہ قتل بنایا جاسکتا ہے۔۔۔ پھر کمرے میں موجود برتنوں کو سونگھا اور فرش پر لیٹ کر کلوروفارم کی بو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کا امکان تھا کہ اسے بے ہوش کر کے دسویں منزل سے نیچے پھینک دیا گیا ہو۔۔۔ لیکن مجھے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی۔۔۔ پھر میں نے کمرے میں موجود اس سامان کو غور سے دیکھنا شروع کیا جو ہر گاہک کو ہوٹل کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ ہر چیز کمرے میں موجود تھی۔

اب نکولس سولانو کے سامان کی باری تھی۔ ہر چیز موجود تھی۔ اچانک میری نظر چھڑیوں کی طرف اٹھ گئی۔ نک ہمیشہ چھڑی لے کر چلتا تھا۔ وہاں نصف درجن کے قریب چھڑیاں موجود تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ سہ پہر جب وہ میرے پاس آیا تھا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی قدرے بھاری چھڑی تھی لیکن وہ چھڑی اس وقت مجھے کمرے میں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں چونک پڑا۔ گویا وہ چھڑی ہی بطور آلۂ قتل استعمال کی گئی ہے۔۔۔ اور قاتل یہ ثبوت بھی اپنے

ساتھ ہی لے گیا ہے۔

میں نے فوری طور پر جانسن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ کھانے کے لیے ہوٹل گیا ہوا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ کھانا کس ہوٹل میں کھاتا ہے۔ میں نے اس ریستوران میں فون کیا تو جانسن وہاں موجود تھا۔

"پیٹر! کھانے کے دوران یہ کیا بدمزگی ہے۔" اس نے میری آواز سنتے ہی ناگواری سے کہا۔

"مسٹر جانسن! وہ خودکشی نہیں بلکہ قتل کی واردات ہے اور سرا میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔"

"اگر قتل کا معاملہ ہے تو سراغ رسانی کے بیورو سے رابطہ قائم کرو اور ان سے مدد لو۔ میرا کھانا پینا کیوں حرام کر رہے ہو۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اسی دوران مجھے سبز قالین پر روئی کا ٹکڑا نظر آیا جسے میں نے پہلے غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا۔ میں بستر کے قریب آ گیا اور یہ سوچتے ہوئے کہ یہ روئی کہاں سے آئی میں بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی روئی کے دو تین ٹکڑے میرے پاؤں کے قریب گرے۔ میں نے جلدی سے چادر الٹ دی تو نیچے گدا پھٹا ہوا تھا۔ کسی نے شاید اسے کھول ڈالا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ گدے کو کس مقصد کے تحت کھولا گیا ہے۔

مسز وان کے جواہرات یقیناً سولانو نے ہی چرائے تھے اور قاتل نے ان جواہرات کی تلاش میں گدا پھاڑ دیا تھا۔ میں ابھی واقعات کی کڑیاں ہی ملا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

دوسری جانب جیف تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مسٹر پیٹر! کوئی پراسرار سا معاملہ ہے۔ ایک نوجوان لڑکی آئی تھی۔ اس نے کلرک سے پوچھا کہ مسٹر سولانو کس کمرے میں رہتے تھے۔ لڑکی اتنی حواس باختہ تھی کہ کاؤنٹر کلرک نے مجھے اشارا کر دیا اور وہ۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔ "وہ مسز وان تو نہیں تھی۔"

"نہیں پیٹر! میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، یہ ایک اجنبی لڑکی ہے کلرک نے میرے اشارے پر اسے کمرے کا نمبر دے دیا ہے اور وہ اس وقت کاک ٹیل لاؤنج میں ہے۔ شاید وہ تھوڑی دیر میں اوپر کمرے میں پہنچ جائے۔" میں اس نئی صورت حال سے الجھن میں پڑ گیا۔ یہ لڑکی کون ہے اور یہاں کس لیے آئی ہے۔

میں نے جیف کو ہدایت کی۔ "میں یہاں کا خیال رکھوں گا۔۔۔ تم لابی کے قریب ہی رہنا۔ جب وہ واپس جائے تو اس کا پیچھا کر کے پتا لگانا کہ وہ جاتی کہاں ہے۔"

جیف نے سرگوشی کی۔ "اے پیٹر۔۔۔! وہ متحرک زینے پر چڑھ گئی ہے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور چھپنے کی جگہ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس وقت مجھے کپڑوں کی الماری کے سوا کوئی موزوں چیز نظر نہ آئی۔ میں نے روشنی بجھائی اور الماری میں کھڑا ہو گیا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا بلکہ اتنی سی درز رکھی تا کہ کمرے میں ہونے والی لڑکی کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکوں۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مختلف چابیاں آزما رہا ہو۔ بالآخر کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ کوئی دبے قدموں تاریک کمرے میں داخل ہوا۔ آہستگی کے ساتھ دروازہ بند ہونے اور دوبارہ مقفل ہونے کی آواز کے بعد کمرے میں روشنی کر دی۔۔۔ میں نے الماری کی جھری سے دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

میں الماری میں دم سادھے کھڑا، اس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے سب سے پہلے بیڈ کے ساتھ پڑی میز کی درازیں دیکھیں۔ پھر دیواروں پر لگی تصویریں

ہٹا کر کچھ دیکھنے لگی۔ اسے شاید کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ مایوس ہو کر وہ بیڈ کے قریب آئی اور گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے بیڈ کے نیچے دیکھنے لگی۔ اگرچہ وہ بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی لیکن اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ گھبرائی ہوئی ہونے کے ساتھ ساتھ ناتجربہ کار بھی ہے۔ اس نے کئی جگہوں کی تلاشی لی لیکن اہم جگہوں مثلاً لائٹ فکسچر، اسٹیم ریڈی ایٹر، فرنیچر اور ڈیسک کی سب سے نچلی دراز دیکھنے کا اسے خیال ہی نہیں آیا۔

الماری میں کھڑے کھڑے میں تھک گیا تھا۔ ذرا سی پوزیشن تبدیل کرنے پر میرا پاؤں الماری میں پڑے جوتوں کے ساتھ ٹکرایا اور ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جس سے میں خود بھی گھبرا گیا۔ میں سانس روکے منتظر رہا لڑکی نے بھی آواز سنی ہے یا نہیں۔ وہ محتاط ہو گئی اور سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔۔۔ لیکن جلدی باہر آ گئی۔ وہ کپڑوں کی اس الماری کی طرف بڑھتی ہوئی دو تین قدم پیچھے رک گئی گویا کوئی سن گن لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ چند لمحے وہ نچلی ہونٹ کاٹتی رہی۔ پھر اس نے اپنا پرس کھولا۔ اس کا ہاتھ پرس سے باہر آیا۔ تو اس کے ہاتھ میں ایک آٹومیٹک ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور الماری کا نشانہ لیتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"الماری میں کون ہے۔ اس سے پہلے کہ میں گولی چلا دوں، الماری سے باہر آ جاؤ۔"

چند لمحے میں سوچتا رہا۔۔۔ پھر مسکراتے ہوئے باہر آ گیا۔ اس نے سیفٹی لاک ہٹا دیا اور دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ ریوالور پکڑے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخ پڑی۔ "تم اس کمرے میں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "خود اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میرے طرزِ عمل میں اطمینان دیکھ کر وہ بڑبڑائی۔ "کیا تم سراغ رساں ہو؟"

"اور تم۔۔۔؟" میں نے جواباً پوچھا۔

"منہ دوسری طرف کر لو ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں چیخ پڑی۔

وہ اتنی بدحواس تھی کہ خطرناک سے خطرناک اقدام بھی اس سے متوقع تھے۔ بلا پس و پیش میں نے رخ پھیر لیا۔ اس نے ریوالور کی ٹھنڈی نال میری گردن پر رکھ دی اور دوسرے ہاتھ سے میری جیبوں کی تلاشی لی اور بدن تھپ تھپایا۔

جب اسے اطمینان ہو گیا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے تو اس نے ایک بار پھر حکم دیا۔ "الماری میں واپس چلے جاؤ۔"

بلاتامل میں پھر الماری میں چلا گیا۔ اس نے الماری کا دروازہ بند کر کے ایک کرسی دروازے کے ساتھ لگا دی۔ روشنی بجھائی اور دروازہ لاک کر کے چلی گئی۔ میں نے اسے دانستہ متحرک سیڑھیوں تک جانے کی مہلت دی۔۔۔ پھر میں نے کندھے کو دروزے کے ساتھ لگا کر دھکیلا اور دروزہ کھلتا چلا گیا۔ کرسی فرش پر گر گئی۔ میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر فون کی طرف بڑھ گیا اور آپریٹر کو ہدایت کی کہ وہ جیف سے ملا دے۔ جیف کو تلاش کرنے میں دو منٹ لگ گئے۔ "دیکھو جیف! وہ لڑکی نیچے آ رہی ہے ہوسکتا ہے، وہ لفٹ سے یا پھر متحرک زینے کے ذریعے آئے۔ بہرحال تم اسے نظر میں رکھو اور اس کا تعاقب کرو لیکن احتیاط کے ساتھ کیوں کہ وہ پرس میں ریولوار لیے گھوم رہی ہے۔ کوشش کرو کہ اس کے ٹھکانے کا پتا لگ جائے۔۔۔ پھر مجھے یہیں اطلاع دے دینا۔"

"ٹھیک ہے پیٹر!" جیف نے سرگوشی کی۔ "وہ متحرک زینے کے ذریعے نیچے آ گئی ہے اور میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھ کر اس لڑکی کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے۔ اس پُراسرار قتل میں اس کی اچانک آمد سے

مجھے حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کیونکہ اب معاملہ سلجھتا نظر آنے لگا تھا۔

بیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے جیف کی آواز سنائی دی۔

''پیٹر! لڑکی کے پاس نیلے رنگ کی فورڈ گاڑی ہے۔ لائسنس کا نمبر ۶ ڈبلیو ۶۷۳۸ ہے۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد وہ ایک لمبے راستے سے ہوتے ہوئے چائنا ٹاؤن پہنچی اور وہاں سے گزرنے کے بعد وہ کولمبس ایونیو گئی۔ وہاں سے قریب ہی ایک ڈبل اسٹوری مکان ہے۔ لڑکی اس مکان کے بالائی حصے میں رہتی ہے۔''

''تم کہاں سے بول رہے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''میں قریبی ڈرگ اسٹور سے بول رہا ہوں۔''

''انتظار کرو۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے ریسیور رکھ دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دس منٹ سے بھی کم وقفے میں، میں وہاں پہنچ گیا۔ جیف اسٹور سے باہر میرا منتظر تھا۔ اس نے ایک جانب اشارا کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ابھی تک وہیں ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''تم اب ہوٹل واپس جا سکتے ہو۔''

''پیٹر! سان کارلوس کی ساکھ کو پہلے ہی کافی نقصان پہنچا چکا ہے۔ امید ہے، تم مزید کوئی ایسی بات نہیں ہونے دو گے۔''

میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس کے دومنزلہ مکان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچنے پر نچلے حصے پر ''کرائے کے لیے خالی ہے'' کا بورڈ نظر آیا۔

میں گھوم کر مکان کے عقب میں گیا۔ جہاں مجھے وہ کار نظر آ گئی۔ جس کے بارے میں جیف سے سن چکا تھا۔ میں دبے قدموں کار کے قریب پہنچا اور لائٹر کے ذریعے رجسٹریشن کے بارے میں پڑھا۔ بیکار تھا مس جینٹ ریوس کے نام تھی اور اس کا پتا بھی وہی تھا، جہاں وہ کھڑی تھی۔

میں سیڑھی پر چڑھ کر بالائی منزل پر آ گیا اور کال بیل کے بٹن پر انگوٹھا رکھ دیا اندر کہیں، فاصلے پر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد وہی لڑکی دروازہ کھول کر میرے سامنے آ گئی۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھی۔ وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

''اوہ خدایا! یہ تو وہی ہے جسے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اوہ۔۔۔'' وہ شاید اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کسی مضبوط ہاتھ نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا اور اچانک ایک مکا میرے دائیں جبڑے پر جم گیا۔ میں اس ناگہانی آفت کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس لیے لڑکھڑا گیا۔ نوجوان انتہائی پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے مجھے بالکل موقع نہیں دیا اور پے درپے مکوں کی بوچھاڑ کر دی میں اس تنگ سی جگہ مقابلہ بھی کیا کرتا۔ اس لیے جھکتا چلا گیا۔ نوجوان نے آخر میں ٹھوکر ماری۔ اس کا بھاری بوٹ میرے جبڑے کو چھیلتا چلا گیا۔ میرے گرتے ہی وہ تیزی سے اچھلا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور شور کے ساتھ چلنے کی آواز سنائی دی۔ جب میں اٹھنے کے قابل ہوا تو گاڑی غائب ہو چکی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو لڑکی دروازہ بند کرنے ہی لگی تھی۔ میں لڑکھڑا کر دروازے کے درمیان آ گیا اور اسے دھکیل کر اندر گھس کر دروازہ بند کر دیا۔ میرے ہونٹوں اور ناک سے بہنے والے خون نے میرا حلیہ شاید خوف ناک بنا دیا تھا اور لڑکی کو اپنے ساتھی کی اس حرکت پر میری طرف سے شدید ردعمل کا خطرہ تھا۔ وہ سہمی ہوئی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔

میں اسے ساتھ لیے فون کے قریب آیا اور پولیس کو فون کر کے حملہ آور نوجوان کا حلیہ تفصیل سے بتایا۔ علاوہ ازیں گاڑی کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ نوجوان مشتبہ ہے اور ممکن ہے قتل میں ملوث ہو چنانچہ اس پر نظر رکھی جائے اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔''

لڑکی شاید حقیقت سمجھ چکی تھی۔ میرا تعارف سننے کے بعد اسے یوں بھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ بے دم سی ایک کرسی میں دھنس گئی۔ ریسیور رکھنے کے بعد جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ خاموش بیٹھی ہاتھ مل رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی گھبرائی ہوئی نظر میری طرف اٹھ جاتی تھی۔ میں نے اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں جینٹ! تم نے اپنے لیے مصیبت کھڑی کر لی ہے۔''

اس نے بھیگی بھیگی خوف زدہ آنکھیں اٹھائیں تو آنسو اس کے خوب صورت رخساروں پر پھیلنے لگے۔

''تم نے کیا کہا تھا؟ قتل؟'' اس نے بہ مشکل کہا۔

''ہاں۔۔۔ سان کارلوس ہوٹل میں سولانو کا قتل۔''

''لیکن وہ تو اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' جینٹ نے جلدی سے کہا۔

''وہ کون ہے؟ کیا اسے سولانو کے قتل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟'' لڑکی نے منفی میں سر ہلا دیا اور خاموش رہی۔

''جینٹ! تمہیں اس سلسلے میں زبان کھولنی ہوگی۔ خاموشی تمہارے لیے زیادہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟''

''ہاں تمہارا نام جینٹ ریوس ہے۔ تم مسز وان کی پرائیویٹ سیکریٹری ہو۔ بتاؤ تم کچھ دیر پہلے سولانو کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں اور تمہیں کمرے کی چابی کہاں سے ملی تھی؟''

لڑکی خاموش رہی تو میں اٹھ کر ریڈیو سیٹ کی طرف بڑھ گیا جس پر جینٹ کا پرس رکھا تھا۔ میں نے پرس کھولا اور اس میں ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

''تمہارے اس دوست نے تمہیں خطرناک حد تک مسلح بھی کر رکھا ہے۔'' پرس میں مجھے وہ چابی بھی مل گئی جس سے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ میں نے اسے چابی دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ سولانو کے کمرے کی خصوصی چابی ہے، جو مسز وان کے پاس تھی۔ کیا اس نے یہ چابی تمہیں دی تھی؟''

میرے ذہن میں اب عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اگر یہ چابی جینٹ نے مسز وان سے حاصل کی ہے تو مسز وان اس کے کمرے سے کیا حاصل کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔ پھر یہ لڑکا کون تھا؟ میں جینٹ کو سرد نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور خاموش ہی رہی۔

''تمہیں مسز وان نے وہاں بھیجا تھا؟''

اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے یہ چابی چرائی ہے۔''

میرے اس سوال پر وہ بڑبڑائی۔ ''ہاں۔''

''میرا خیال ہے تم اس کمرے میں جواہرات تلاش کرنے گئی تھیں۔''

''ہاں۔۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب تم ساری کہانی سنا دو تو بہتر ہوگا۔''

کچھ دیر متذبذب رہنے کے بعد اس نے زیرِ لب کہا۔ ''میں جنوبی کیرولینا کی رہنے والی ہوں۔ جہاں میرا دوست جیکسن گریڈی رہتا تھا۔ وہ انتہائی دیانت دار اور اچھا لڑکا تھا۔ اس نے جارجیا چین گینگ کی مخالفت کی جو بدنام ترین بدمعاشوں کا گروہ ہے لیکن اس کے صلے میں اسے ایک سازش کا شکار کر کے ایک جرم اس کے سر ڈال دیا گیا۔ جس کی پاداش میں اسے جیل بھیج دیا گیا لیکن وہ جیل سے بھاگ نکلا۔ یہ واقعہ آج سے نو ماہ پہلے کا ہے۔ جیل سے فرار ہو کر وہ یہاں آ گیا۔ اسے میری تلاش تھی تاکہ ہم دونوں شادی کر سکیں۔ وہ نیک نامی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مسز وان کے پاس ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم رکھوا دیا۔ یہاں وہ اب رابرٹ گرین کے نام سے زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے ماضی کے بارے میں میرے اور تمہارے سوا کسی کو بھی علم نہیں۔''

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی پھر اس نے بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ’’مسٹر پیٹر! یہاں وہ دیانت داری سے کام کررہا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ وہ واپس اس گینگ سے جا ملے وہ اسے توڑ پھوڑ دیں گے۔ اسے کوڑے ماریں گے اور ہوسکتا ہے اسے قتل ہی کردیں۔‘‘

’’کیا تم اس نوجوان کے بارے میں کہہ رہی ہو جو میری ٹھکائی کرکے فرار ہوگیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں۔۔۔۔ میں اسی کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔‘‘

’’گزشتہ رات مسز وان کے جوہرات چوری ہوگئے تھے۔ تمہارے خیال میں وہ کس نے چرائے ہیں۔ تم نے یا جیکسن عرف رابرٹ نے؟‘‘ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

’’میں قسم کھاتی ہوں کہ ہم میں سے کسی نے نہیں چرائے۔۔۔۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جواہرات کی چوری نے خود رابرٹ کے لیے بڑی مشکل پیدا کردی ہے۔ اگر یہ معاملہ پولیس کے سپرد ہوتا ہے تو پولیس تمام ملازمین کے فنگر پرنٹس لے گی۔ اگر رابرٹ کے پرنٹ لیے گئے تو پولیس سمجھ جائے گی کہ وہ برابرٹ نہیں بلکہ مفرور جیکسن ہے۔ اس کے بے نقاب ہونے سے جارجیا گینگ کو پتا چل جائے گا اور وہ اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے وہ پھر گینگ کا سرگرم رکن بن جائے۔ دوسری صورت میں گینگ اسے ختم بھی کرسکتا ہے۔ مسٹر پیٹر۔۔۔۔! پلیز ہماری مدد کیجیے۔ اسے گینگ میں واپس جانے سے بچالیجیے۔ وہ اب اپنی ملازمت پر بھی نہیں ہے بلکہ پولیس کے خوف سے چھپا ہوا ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کیا اسی خوف سے کیا ہے کہ کہیں تم اسے پولیس کے حوالے نہ کردو۔‘‘ لڑکی سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے التجا آمیز نگاہ سے میری طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’مسٹر پیٹر! رابرٹ کو واپس گینگ میں جانے سے بچانے میں میری مدد کیجیے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اس نے جواہرات نہیں چرائے۔‘‘

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ ’’تو پھر تمہارے خیال میں سولانو نے جواہرات چرائے ہیں؟‘‘

جینٹ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے اور کہا۔ ’’مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا۔ مسز وان نے ایک بار اس پر بھی شبہ ظاہر کیا تھا چنانچہ میں نے چابی چرالی اور سولانو کے کمرے کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا تاکہ جواہرات مل جائیں۔ میرا خیال تھا کہ احساسِ جرم پر اس نے خودکشی کی ہے۔ ایسی صورت میں جواہرات اس کے کمرے ہی میں ہوں گے۔ اگر وہ مل جاتے تو میں انہیں مسز وان کے حوالے کرکے جیکسن کو بچا سکتی تھی۔‘‘

’’لیکن اس نے خودکشی نہیں کی۔۔۔۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اسے قتل کیا گیا ہے لیکن یہ بات اب تمہارے دوست کے لیے زیادہ خطرناک ہوگئی ہے۔ کیونکہ میں نے پولیس کو بھی اطلاع دے دی ہے۔‘‘ قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ ’’تم نے مسز وان کی پارٹی میں کسی نوجوان کو ’’کاؤبوائے‘‘ لباس میں تو نہیں دیکھا تھا؟‘‘

’’ایک شخص کو دیکھا تو تھا۔‘‘ جینٹ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ’’جسے دیکھ کر سولانو برہم ہوگیا تھا۔ پھر ان دونوں میں تلخ کلامی ہوئی اور سولانو نے اسے دھکے دے کر نکال دیا۔‘‘ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ’’اسی شخص کو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سان کارلوس ہوٹل میں بھی دیکھا تھا۔‘‘

میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ایک سرد سی لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ ’’تم نے اسے دیکھا تھا؟ لیکن کب اور کہاں؟‘‘ میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔ جینٹ نے کہا۔ ’’جب میں دسویں منزل پر گئی تو وہ اس وقت ہال میں تھا لیکن جب میں تمہیں الماری میں بند کرکے کمرے سے باہر آئی تو اسے میں نے دوبارہ دیکھا۔ وہ ہال کے کونے

میں واقع کمرے میں داخل ہورہا تھا۔‘‘

’’کمرے کا نمبر کیا تھا؟‘‘ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

’’غالباً کمرا نمبر ۱۰۱۱ تھا۔‘‘ جینٹ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے کرسی سے گھسیٹ لیا اور اس کا ہاتھ پکڑے جلدی سے باہر آگیا۔ ’’آؤ جینٹ! میرے ساتھ آؤ۔ ممکن ہے اب میں جیکسن کو بچالوں اور اسے گینگ کے ہاتھوں میں واپس نہ جانے دوں۔‘‘

☆☆☆

ہم سان کارلوس ہوٹل پہنچے تو وہاں خاصی رونق تھی۔ چند گھنٹے پہلے رونما ہونے والے حادثے کو سب بھول چکے تھے۔ میں نے جیف کو تلاش کیا۔ وہ اس وقت لابی میں تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ جیف کا انتظار کرتا۔ میں نے ڈیسک پر جھکے کلرک کو اپنا تعارفی کارڈ دکھایا اور کہا۔ ’’کمرا نمبر ۱۰۱۱ میں مقیم شخص ابھی کمرے میں ہے؟ اگر ہے تو اسے یہاں آئے کتنا عرصہ ہوا ہے اور وہ کب تک ٹھہرے گا۔‘‘

کلرک نے حیرت سے پھٹی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ اس کے ہونٹ متحرک ہوگئے۔ ’’ہاں وہ ابھی کمرے ہی میں ہے۔ اس کا نام برائٹ ہے۔ باقی میں ریکارڈ دیکھ کر بتاتا ہوں۔‘‘

میرا ماتھا ٹھنکا۔ فلفی برائٹ سولانو کی خودکشی کا چشم دید گواہ بھی تھا اور وہ وہی کاؤبوائے ولیمز تھا جو عادی چور تھا لیکن اب وہ برائٹ کے روپ میں یہاں مقیم ہے۔ اس کے قیام کا مقصد ہی جواہرات حاصل کرنا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا سولانو نے انہیں چرایا ہے۔ اس نے سولانو کو ہلاک کیا اور چونکہ خودکشی کی وارداتیں عام تھیں۔ چنانچہ اسے کھڑکی سے دھکیل دیا اور خود چشم دید گواہ بھی بن گیا۔ اب میں قریب پہنچ چکا تھا بہرحال اب صرف اس شاطر چور کی گرفتاری باقی تھی۔

کلرک نے ریکارڈ چیک کرنے کے بعد کہا۔ ’’مسٹر برائٹ چھ دن سے یہاں مقیم ہیں اور وہ آج شام ہوٹل چھوڑ رہے ہیں۔‘‘

’’ایک کام اور کرو۔ ریکارڈ چیک کرکے بتاؤ کہ مسٹر برائٹ نے گزشتہ روز ملبوسات کی کسی دکان سے کوئی لباس بھی کرایے پر حاصل کیا تھا؟‘‘

کلرک نے ایک بار پھر ریکارڈ پر نظر ڈالی اور بڑبڑایا۔ ’’اس نے کل سہ پہر ’’کوئین اینڈ کلان‘‘ نامی فرم سے لباس منگوایا تھا اور آج صبح سویرے واپس کردیا۔‘‘

میں نے کلرک کا شکریہ ادا کیا اور انتظار کرتا رہا۔

’’ساڑھے گیارہ بجنے والے ہیں۔ کیا میں کسی ملازم کو مسٹر برائٹ کا سامان لانے کے لیے اوپر بھیج دوں؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلادیا اور کہا۔ ’’کسی ملازم کی ضرورت نہیں۔ اس کا کام میں خود کروں گا۔‘‘

دسویں منزل پر پہنچ کر میں نے جینٹ کو ہال میں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور خود کمرا نمبر ۱۰۱۱ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ’’جناب! میں آپ کا سامان لے جانے کے لیے آیا ہوں۔‘‘

دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ مسٹر برائٹ لمبے قد کا ایک خوش لباس آدمی تھا۔ اس نے چند گھنٹے پہلے جیسا ڈھیلا ڈھالا لباس نہیں پہن رکھا تھا بلکہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا۔ ’’میں نے کسی ملازم کے لیے کہا تھا۔‘‘ وہ بڑبڑایا۔

میں نے اندر آتے ہوئے دروازہ بند کردیا اور دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

’’کیا کام میں نہیں کرسکتا؟ مسٹر ولیمز!‘‘

وہ گنگ کھڑا مجھے گھورنے لگا۔ اس کے ہونٹ حرکت میں آئے۔ ’’یہ تم نے کیا ولیمز، ولیمز کی رٹ لگا رکھی ہے؟ میرا نام۔۔۔۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

’’یہاں تم نے برائٹ ہی نام لکھوایا ہے۔ لیکن تم

ولیمز ہو چور۔۔۔ ہیروں اور جواہرات کے چور! تم نے ایک خوبصورت ڈراما یا کھیلا ہے لیکن تم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں جس کی وجہ سے تم پکڑے گئے ہو۔"

"کیا بک رہے ہو؟" وہ غصے سے گرجا۔ "مجھے ایک ملازم کی ضرورت ہے جو میرا سامان نیچے لے جائے۔"

"میں ہی ہوٹل کا ملازم ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارا سامان نیچے لے جانے میں مدد دوں گا لیکن تم کہیں اور جانے کے بجائے اب سٹی جیل جاؤ گے کیونکہ تم قاتل ہو۔"

اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے اور وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ بیڈ کے قریب پہنچ کر وہ بڑبڑایا۔ "آخر مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟"

"تم سے کئی غلطیاں ہوئی ہیں۔" میں نے جارحانہ لہجے میں کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر تیزی سے رنگ بدل رہے تھے۔ "مسٹر ولیمز! کوئی دس سال پہلے سولانو اور تم اکٹھے کام کرتے تھے جس کے بعد تم میں پھوٹ پڑ گئی۔ پھر چند روز قبل تم نے سولانو کو دیکھا۔ وہ ایک متمول عورت سے شادی کرنے والا تھا۔ تم نے اسی ہوٹل میں کمرا لیا جہاں سولانو مقیم تھا۔ تم اس ٹوہ میں رہے کہ کب سولانو کوئی ہاتھ دکھائے اور تم اسے بلیک میل کرو۔"

"بکواس بند کرو۔ یہ بکواس ہے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ غصے سے چیخا۔

"مسٹر ولیمز! غور سے سنو۔ یہ ایک حقیقت ہے تم نے کل سہ پہر کوئین اینڈ کلائن سے کاؤ بوائے لباس منگوایا اور اسے پہن کر مسز وان کی پارٹی میں گئے جہاں سولانو سے تمہارا جھگڑا ہو گیا اور اس نے تمہیں وہاں سے نکال پھینکا۔ جس کے بعد سولانو نے مسز وان کے جواہرات چرا لیے۔"

"ہاں۔۔۔ اس نے چرائے تھے۔" ولیمز نے جنونی انداز میں کہا۔

میں اس کی حالت اور اس کی بات پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "ہاں، مسٹر ولیمز! اس نے جواہرات چرا لیے۔ وہ لاکھوں ڈالر کی مالک عورت سے شادی کر رہا تھا لیکن فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے جواہرات چرا لیے یہ حرکت شاید اس نے ذاتی تسکین کے لیے کی ہو گی۔"

اس نے جواہرات چرا لیے تو میں اس سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہتا تھا۔ لیکن رابطہ قائم ہونے سے پہلے ہی اس نے کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی۔" ولیمز نے قدرے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مسٹر ولیمز!" میں نے کہا۔ "تم سولانو کی عدم موجودگی میں، اس کے کمرے میں گئے اور جواہرات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی تم اس کے بستر کا گدا چیر پھاڑ رہے تھے کہ وہ واپس آ گیا۔ ایک بار پھر تمہاری جھڑپ ہوئی اور تم نے کسی سخت اور بھاری چیز سے سر پر وار کر کے اسے قتل کر دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ ایک بار پھر چیخ پڑا۔

"تم جو بھی کہو۔۔۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے قتل کرنے کے بعد تم نے اپنی جان بچانے اور گیس چیمبر سے بچنے کے لیے ایک عجیب ڈراما کھیلا۔ تم نے اسے اسی طرح کی خودکشی بنانے کی کوشش کی جس کا سلسلہ ایک ایسے یونانی سے شروع ہوا تھا جس نے خودکشی کر لی تھی۔ تم نے ایک ٹائپ رائٹر منگوایا اور خودکشی کے بارے میں سولانو کی طرف سے ایک خط ٹائپ کیا۔۔۔ پھر ٹائپ رائٹر پر سولانو کی انگلیوں کے نشانات لگا دیے لیکن تم سے دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ شاید تم نہیں جانتے تھے کہ مسز وان درحقیقت سولانو کی ماضی سے آگاہ تھی۔ تم نے اس بات کے علم سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کا جواز تلاش کیا۔ جو کسی طرح درست نہیں تھا۔ دوسرے مسز وان اسے سولانو کے نام سے پکارتی ہے، اسے قطعاً معلوم نہیں ہے کہ وہ نِک کے نام سے بھی معروف تھا۔ اس کا علم صرف تمہیں تھا یا پھر مجھے تھا۔ تیسری غلطی یہ تھی کہ جب وہ لڑکا ٹائپ رائٹر لے کر آیا تو تم نے چہرہ چھپانے کے لیے چہرے پر صابن مل رکھا تھا لیکن جب تم نے خط ٹائپ کرنے کے بعد سولانو کو کھڑکی سے دھکیلا تو جلدی سے منہ اچھی طرح صاف نہ کر سکے۔ میں نے تمہارے کان کے پیچھے صابن لگا دیکھا تھا۔ اب رہا آلۂ قتل تو وہ بھی مل جائے گا۔ اب تم جواہرات لے کر بڑے اطمینان سے جا رہے تھے کہ میں اچانک یہاں آ پہنچا۔"

ولیمز غصے میں گالیاں بکنے لگا تو میں نے اسے قابو میں رکھنے کے لیے جیب سے وہ ریوالور نکالا جو جینیٹ کے پرس سے نکالنے کے بعد اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ لیکن ہاتھ اٹھانے سے پہلے ہی کمرے میں فائر کی آواز گونجی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ میں نے چونک کر ولیمز کی طرف دیکھا وہ آتش فشاں بنا مجھے گھور رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول چمک رہا تھا۔

میں خالی ہاتھ تھا لیکن میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ "مسٹر ولیمز! پستول پھینک دو اور خود کو میرے حوالے کر دو کیونکہ معاملہ بے نقاب ہو چکا ہے اور تھوڑی دیر میں پولیس بھی آنے والی ہے۔"

اسی لمحے ہال کی طرف کا دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ ایک بار پھر گولی کی آواز سے کمرا گونج اٹھا اور ولیمز کا پستول اچھل کر دور جا گرا۔ میرے پیچھے جیف کھڑا تھا جسے شاید کلرک نے سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ فوراً ہی اوپر آ گیا تھا۔

ولیمز کے بے بس ہونے کے بعد وہ چھری بھی مجھے مل گئی۔ جسے میں نے اس سہ پہر سولانو کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور جسے ولیمز نے قتل کے لیے استعمال کیا تھا۔ البتہ اب تک مسروقہ جواہرات نہیں ملے تھے۔

اسی دوران جینیٹ بھی کمرے میں آ گئی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

"مسٹر پیٹر! جیکسن کا کیا ہو گا؟"

"تمہاری کار تو ایک پارک کے پاس مل گئی ہے۔ لیکن اس میں کوئی نہیں تھا اور ابھی تک پولیس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ جیکسن ہے۔"

"کیا تم اس بات کو اپنی ذات تک محدود رکھو گے؟"

"فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "جب تک مسروقہ جواہرات نہ مل جائیں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تم اطمینان رکھو۔ جب تک ضرورت نہ پڑے۔ میں یہ معاملہ راز ہی میں رکھوں گا۔۔۔ لیکن دعا کرو کہ مسروقہ جواہرات مل جائیں۔"

جینیٹ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

"اگر مسروقہ جواہرات نہیں ملے تو جیک خطرے میں ہی رہے گا۔" وہ بے دلی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جانا ہی چاہتی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

دوسری طرف سے لیفٹیننٹ جانسن بول رہا تھا۔ "پیٹر! تمہیں معلوم ہے ہمیں کیا ملا ہے؟" اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"آلۂ قتل۔۔۔ یعنی وہ چھری جس سے نکولس کو قتل کیا گیا تھا۔"

"یقیناً" اس نے کہا۔ "لیکن چھری پر تحقیقات کے دوران۔۔۔ ڈاکٹر نے اس کی مٹھی کھولی تو مسروقہ جواہرات اس سے نکل کر زمین پر بکھر گئے۔"

"سچ۔۔۔!" خوشی سے میری آواز بھرّا گئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا تو جینیٹ امید و نا امیدی کا مجسمہ بنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "جینیٹ! تم اطمینان سے جاؤ۔ جیکسن کا راز ہمیشہ راز رہے گا۔ جواہرات مل گئے ہیں۔"

وہ بے ساختہ اٹھی اور میری گردن میں بانہیں ڈال کر جھول گئی اور اس کے سرخ ہونٹ کئی بار میرے چہرے پر ثبت ہوئے اور میں دیر تک اس کی گرم سانسوں کا تصور لیے کھڑا رہا اور وہ دیوانوں کی طرح ہنستی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔

انتم سنسکار

اُس فرد کی کہانی جسے اپنی موت کے بعد پیدا ہونے والے مسئلے کا پہلے سے علم تھا اور وہ اس نے اس کا سدباب اپنے جیتے جی ہی کر لیا تھا۔

عذرا نقوی

ایسے فرد کی کہانی جس کا ننھیال مسلمان اور ددھیال ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا

ڈیوڑھی نما بڑے دروازے میں داخل ہو کر بیری والا باغ محلہ شروع ہوتا تھا، جہاں پھوپھی جان کا گھر تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی بیچ کی نسبتاً چوڑی گلی سے دائیں بائیں پتلی پتلی گلیاں نکلتی تھیں، جہاں پرانے مکان تھے جو مسلمان پاکستان جاتے وقت چھوڑ گئے تھے اور ان میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے خاندان بس گئے تھے۔ لیکن اب بھی اس محلے میں کچھ مسلمان خاندان آباد تھے۔ پھوپھا جو شفیق میموریل اسکول میں استاد تھے انہوں نے شاید سن اڑتالیس میں یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ نہ جانے کس سے لیا ہوگا، میں گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔

پھوپھی جان کے گھر کا آنگن ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔ حالانکہ فرش کے پرانے سرخ پتھر کئی جگہ ٹوٹ گئے تھے۔ آنگن میں دروازے کے ساتھ باہر والی بیٹھک تھی جس کے دو دروازے باہر گلی میں کھلتے تھے اور ایک دروازہ اندر گھر میں کھلتا تھا۔ بیٹھک کے پرانے لکڑی کے کواڑوں کے اوپری حصے میں رنگ برنگے شیشے لگے ہوئے تھے جن میں کچھ ٹوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ پلائی کے ٹکڑے جڑ دیے گئے تھے۔ آنگن کے اس پار بیٹھک کے مقابل لمبا برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد لمبی سہ دری تھی جس کو ایک اینٹ کی دیوار سے کمروں کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک زینہ آنگن سے اوپر جاتا تھا جہاں پھوپھی جان کے بیٹے اکبر بھائی رہتے تھے جو ہندو کالج میں زولوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار تھے۔

”آداب پھوپھی جان“ میں نے آنگن میں داخل ہوتے ہوئے کہا

”ارے آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی آئے گا ضرور۔“ انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”بے مروت، آ گئی پھوپھو کی یاد۔ دلی میں ہی رہتی ہو اور مہینوں ہو جاتے ہیں شکل دیکھے ہوئے۔“

”کون آیا ہے بتول۔“ کمرے کے اندر سے دادا ابا کی بھاری آواز آئی۔ چق اٹھا کر اندر گئی تو وہ حسب معمول تخت پر سفید گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ سفید ململ کا کرتا اور سفید آڑا پاجامہ پہنے۔ سرہانے نہج البلاغہ، دیوانِ میر، چند اور کتابیں اور اردو کا اخبار رکھا ہوا تھا۔

”تصویر زہرا آئی ہے بابا!“ پھوپھی جان نے کہا اونچی آواز میں کہا کیونکہ دادا اب بہت اونچا سننے لگے تھے۔ میرا پورا نام تو صرف پھوپھی جان ہی لیتی ہیں۔ ورنہ سب تصویر کہتے ہیں یا یونیورسٹی میں زہرا کہلاتی ہوں۔ دادا ابا نے میری تاریخ پیدائش کے حساب سے یہ نام رکھا تھا۔

پھوپھی جان نے پھر قدرے نیچی آواز میں کہا۔ ''اے ہے! ابھی امام کا چہلم بھی نہ ہوا اور تم نے لال ساڑھی پہن لی اور پھر یہ ساڑھی پہننے کی کیا مار ہے۔ بن بیاہی لڑکیاں نہیں اچھی لگتیں ساڑھی پہنے۔ ویسے بھی غیروں کا پہناوا۔۔۔''

کہاں تو دادا جان اونچا سنتے ہیں کہاں انہوں نے سب کچھ سن لیا۔

محلے میں داخل ہوتے ہی میں نے ماتھے کی بندی تو اتار کر پرس میں رکھ لی تھی۔ ویسے ہی شوق میں لگالی تھی ساڑھی سے میچ کرتی ہوئی بندی اور یہ ساڑھی لال بھی تو نہیں، کافی گہری عنابی ہے۔ میں نے سوچا۔ دراصل میں سیدھی ایک سیمینار سے ادھر آ گئی جو حقوق نسواں اور اقلیتوں کے موضوع پر سینٹ اسٹیفن کالج میں کیا گیا تھا۔

پھوپھا جان جو اسکول سے آ گئے تھے اور پلنگ پر بیٹھے جوتے کے فیتے کھول رہے تھے۔ انہوں نے بھی پھوپھو کے اعتراض سن لیے، وہ ہنس کر بولے۔

''تصویر۔ تمہاری پھوپھی جان کا بس چلے تو سارے سال سوگ منایا کریں۔ ڈھائی مہینے محرم، چہلم کا سوگ اور پھر رمضان کے مہینے۔۔۔ پھر بھی کوئی ریڈیو یا ٹی وی پر گانا نہیں سن سکتا۔''

''اچھا بس اپنی کامریڈی مت بگھاریے، میں اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوں۔'' پھوپھو کہتی ہوئی کھانا نکالنے چل دیں۔

کوفتے پکے تھے کھانا کھا کر مزا آ گیا، ورنہ ہاسٹل میں تو دال، سبزی ہی کھاتی تھی۔ نان ویجیٹرین اس لیے نہیں لیتی تھی کہ پتا نہیں گوشت حلال ہے یا جھٹکے کا۔

کھانا کھا کر برآمدے میں بچھی مسہری پر پھوپھی جان کے ساتھ لیٹ کر باتیں کرنے لگی تو کچھ دیر کے لیے آنکھ لگ گئی ہوگی۔ کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سے آنکھ کھلی تو دیکھا اوپر کوٹھے والے مکان سے شکنتلا بہن جی اپنی دیوار پر سر نکالے پھوپھی جان سے پوچھ رہی تھیں۔

''بتول بہن جی! تصویر آئی ہے، اس کی آواز جیسی لگ رہی تھی۔ پنکی بھی آج سسرال سے آئی ہے، پوچھ رہی تھی اپنی بچپن کی سہیلی کو۔ اتنی دیر میں پنکی بھی دیوار سے جھانکنے لگی۔ پھوپھی جان نے چلا کر کہا۔ ''اے ہے پنکی! کیا کرتی ہو، ایسی حالت میں تم کیوں اسٹول پر چڑھ گئیں۔۔۔ یا علی، یا علی۔۔۔ سنبھل کے۔۔۔ اترو نیچے۔۔۔ میں تصویر کو بھیج دوں گی دو منٹ کے لیے تمہارے گھر۔''

مجھے ہنسی آ گئی اس دو منٹ والی بات پر۔ جب ہم بچپن میں پھوپھی جان کے گھر کبھی چھٹیوں میں جاتے تھے اور پنکی کے گھر کھیلنے کے لیے جانا چاہتے تھے تو پھوپھی بس تھوڑی دیر کی اجازت دیتی تھیں۔ کچھ کھانے پینے کی ممانعت کر دیتی تھیں مگر مانتا کون تھا۔ شکنتلا بہن جی کے ہاتھ کے مولی کے پراٹھے کون چھوڑ سکتا ہے۔ کونڈوں کی نیاز کی میٹھی ٹکیاں جب پھوپھی جان آنگن میں انگیٹھی رکھ کر پکاتیں تو بے بی اور پنکی میرے ساتھ اکڑوں بیٹھ کر بہت دلچسپی سے دیکھتی تھیں۔ پھوپھی جان کو فکر لگی رہتی کہ کہیں وہ ان کے پاک کیے ہوئے برتنوں کو نہ چھولیں۔ نیاز سے پہلے وہ کچھ پوریاں پنکی اور بے بی کو بھی دیتی تھیں۔

میں پنکی سے بات ہی کر رہی تھی کہ اکبر بھائی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، انہوں نے پھوپھا کو الگ لے جا کر کچھ کہا، وہ سر پکڑ کر آنگن میں رکھی نماز کی چوکی پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے پھوپھی جان سے کچھ کہا تو وہ سینے پر دو ہتڑ مار کر مسہری پر گر پڑیں۔ دادا جان باہر نکل آئے تو اکبر بھائی نے رک رک کر بتایا کہ نسیمہ پھوپھی کا فون آیا تھا، ان کی بیٹی سیما جو دلی کے ایک این جی او میں سوشل ورکر تھی وہ ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئی۔ اس کی آخری رسومات یہیں ادا ہوں گی۔

نسیمہ پھوپھی ہمارے ابا کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اپنے زمانے میں بہت انقلابی تھیں، لکھنو میں پڑھتی تھیں تب انہوں نے اپنے ایک کامریڈ ساتھی امریش سنگھ سے شادی کی تھی۔ سیما سے میں دو سال پہلے ملی

تھی، وہ مجھ سے دو چار سال بڑی ہوگی۔ بہت پیاری لڑکی تھی، بہت شوق سے سوشل ورک میں ڈپلوما کیا تھا اور اب جی جان سے اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ سیما اپنی ایک دوست دیپالی کے ساتھ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ جب سیما کو دہلی میں ملازمت ملی تھی تب نسیمہ پھوپھی ایک بار پھوپھی جان کے گھر اس کو ساتھ لے کر آئی تھیں اور اس کو تاکید کی تھی کہ وہ یہاں آتی رہے۔ وہ پھوپھا سے کہہ گئی تھیں کہ سیما کی خیر خبر رکھیں۔

اکبر بھائی اور پھوپھا عجلت سے باہر نکل گئے، پھوپھی کچن کے برابر والے چھوٹے کمرے کا سامان نکالنے لگیں اور مجھے بھی مدد کے لیے بلا لیا، اس کمرے میں غسل دینا تھا۔ مغرب کے وقت سے گھر میں خواتین اور باہر بیٹھک میں مرد آنے شروع ہو گئے۔ پھوپھا سفید کپڑے کا پلندہ اور دیگر سامان پھوپھو کو دینے گھر میں آئے تو بتایا کہ نسیمہ پھوپھو لاش کے ساتھ ایک گھنٹے بعد پہنچ جائیں گی، وہ صبح ہی لکھنو سے آ چکی ہیں۔

امریش انکل کا انتقال ہوئے دس برس گزر گئے اور ان کا بیٹا امریکا جا کر بس گیا۔ نسیمہ پھوپھی لکھنو میں اپنے آبائی مکان میں اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ رہتی ہیں وہ بھی دو برس سے سعودی عرب گیا ہوا ہے۔ لکھنو میں وہ آج کل بالکل اکیلی ہیں۔ یہ سب کچھ پھوپھی نے کام کے دوران مجھے ابھی ابھی بتایا تھا۔

میں زندگی میں پہلی بار یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھوپھو چٹائی بچھا کر کچھ خواتین کے ساتھ کفن تیار کرنے لگیں۔

برآمدے میں ایک بزرگ خاتون جو ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی تھیں، انہوں نے قریب بیٹھی مسز نقوی سے کہا۔

''سنا ہے کہ مرنے والی کا باپ ہندو تھا، وہ بھی ہندو ہی ہوگی۔''

مسز نقوی نے منہ بنا کر دھیرے سے کہا۔

''ارے، ان لوگوں کا کیا مذہب، ماں ٹینی باپ کلنگ، بچے اپنے اپنے رنگ کے۔''

ایک اور خاتون نے کہا سیپارے کا ورق پلٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو بس مغفرت کی دعا کر رہے ہیں، آگے اللہ جانے۔''

نسیمہ پھوپھو جو گٹھیا کی مریض تھیں، سکتے کی حالت میں دروازے میں داخل ہوئیں ان کے پیچھے لاش لے کر اکبر بھائی اور کچھ لوگ تھے۔ پھوپھی جان نے انہیں سنبھالا اور کچھ خواتین نے غسل دینے کی تیاری شروع کر دی۔

ابھی غسل ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک باہر بیٹھک میں کچھ ہل چل سی ہوئی، کچھ تیز تیز آوازیں سنائی دیں۔

شمشان گھاٹ۔۔۔ ارتھی۔۔۔ انتم سنسکار۔۔۔

کچھ ایسے الفاظ سنائی دیے۔

پھوپھا گھبرائے ہوئے اندر آئے اور دھیرے سے پھوپھی جان سے کہا کہ سیما کے ددھیال والے آئے ہیں۔ خواتین میں بے چینی سی پھیل گئی۔ نسیمہ پھوپھی تو بالکل سکتے کی حالت میں تھیں۔ پھوپھی جان دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

غسل مکمل ہو چکا تھا، آنگن میں میت ملا کر رکھی جا رہی تھی، کافور کی بو پھیلی ہوئی تھی، نسیمہ پھوپھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ باہر مردانے میں اب بھی تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اتنے میں ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی، یہ دیپالی تھی سیما کی دوست، اکبر بھائی نے بتایا۔

اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جو اس نے پھوپھا کے ہاتھ میں تھما دیے۔

پھوپھا نے چند منٹ کاغذات دیکھے، چند منٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے کھڑے رہے پھر گہری سانس لے کر کہا۔ ''سیما نے اپنی ڈیڈ باڈی میڈیکل ریسرچ کے لیے دینے کا فیصلہ کئی سال پہلے ہی کر لیا تھا۔''

نسیمہ خالہ چیخ مار کر روئیں، سیما کی لاش سے لپٹ کر اسے چومنے لگیں۔

میں نے نہ جانے کیوں چین کا سانس لیا۔

فرار سے پہلے

فوزیہ ناہید

مجرموں کے فرار ہوجانے کے بعد پیش آنے والے واقعات پر آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی
ایک ایسے مجرم کی روداد سنیے جسے فرار سے پہلے ناقابل یقین واقعات پیش آئے۔

جیک رچی کی ایک خوب صورت

''کسی پولیس والے کو قتل کرنا میری دانست میں تو انتہائی احمقانہ کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس قسم کے واقعے سے ہر متعلقہ اور غیر متعلقہ شخص کو اشتعال آجاتا ہے۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس معاملے میں تمہارے نظریات کیا ہیں۔'' ریگن نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس کام کا معاوضہ مل رہا ہے''

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

''تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم یہی چاہتے ہو تو مجھے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہ کام انجام دے کر پہلی پرواز کے ذریعے سینٹ پال، واپس چلا جاؤں گا لیکن اس وقت تک تم یہیں رہو گے اور پولیس لازماً پوچھ گچھ کے لیے تمہیں بلائے گی کیونکہ انہیں اندازہ ہوجائے گا کہ یہ کام کس نے کروایا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، وہ حقیقت اگلوانے کے لیے تم پر سختی بھی کریں۔''

''اگر وہ ذرا بھی عقل مند ہوں گے تو سختی نہیں کریں گے۔'' ریگن نے کہا۔ ''اگر انہوں نے پوچھ گچھ کے لیے بلانے کا ارادہ بھی کیا تو میرا کوئی نہ کوئی مخبر مجھے پہلے ہی مطلع کردے گا اور میں اسی وقت ڈاکٹر سے اپنا مکمل جسمانی معائنہ کرواکے رپورٹ محفوظ رکھوں گا۔ پوچھ گچھ کے بعد جب میرے قانونی مشیر مجھے پولیس کے پنجے سے چھڑالائیں گے اس وقت ایک بار پھر جسمانی معائنہ کرایا جائے گا اور اگر میرے جسم پر ناخن کی خراش بھی پائی گئی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا۔ سمجھے۔۔۔''

میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے ڈرنک کی دو تین چسکیاں لیں اور ریگن کی بات پر غور کرنے لگا۔ ریگن ایک لحیم شحیم اور سرخ و سپید آدمی تھا۔ وہ اس شہر میں ہر وہ اڈہ چلاتا تھا جس کا دھندا راتوں کو عروج پر ہوتا ہے۔ پہلے وہ اپنی راہ میں حائل انسانوں کا قصہ پاک کرنے کا کام بذات خود انجام دیتا تھا لیکن جب سے اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہوئی تھی اور اس نے معاشرے کے ایک مہذب انسان کی نقاب چہرے پر چڑھائی تھی تب سے وہ اس قسم کے کاموں کے لیے مجھ جیسے پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کرنے لگا تھا۔

''یہ بات مجھے بڑی عجیب سی لگ رہی ہے کہ ایک پولیس والے سے تم اتنے تنگ آچکے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم نے پوری پولیس فورس کو خرید رکھا ہے۔''

''میں نے پولیس فورس میں چند کام کے آدمیوں کے ضمیر خرید رکھے ہیں۔ پوری پولیس فورس کو تو کوئی بھی نہیں خرید سکتا ناقابل فروخت قسم کے

آدمی ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو بعض اوقات کسی بھی طرح قابو میں نہیں آتے۔'' ریگن یہ کہتے ہوئے اٹھا اور اپنا گلاس دوبارہ بھرنے کے بعد بولا۔ ''دیانت دار پولیس والا میرے لیے کبھی پریشانی کا باعث نہیں بنتا بشرطیکہ وہ احمق ہو، لیکن یہ کم بخت رینالڈ بلا کا ذہین ہے اس نے اپنے گلاس میں برف کے ٹکڑے ڈال کر انہیں ہلایا۔ ''مصیبت یہ ہے کہ ہر پانچ دس سال بعد ہمارے ملک کے شہری خواب خرگوش سے بے دار ہوجاتے ہیں اور ان پر جنون سوار ہوجاتا ہے کہ انتخابات میں وہ دیانت دار لوگوں کو ووٹ دیں گے۔ رینالڈ کی ذہانت، دیانت دار اور مستعدی کا شہرہ اگر یوں ہی پھیلتا رہا تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ آئندہ انتخابات میں کامیاب ہونے والی انتظامیہ اسے سونے کا تاج پہنائے گی اور اسے پولیس فورس کا سربراہ بنادے گی اور رینالڈ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شہر میں کالے دھندے کہاں کہاں ہوتے ہیں اور ان کے پس پردہ کس کس کا ہاتھ ہے۔ اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ وہ ان کا قلع قمع کرنے کے طریقے بھی جانتا ہے اور اس وقت اس کے پاس بے اندازہ اختیارات بھی ہوں گے۔ میں چاہوں تو ابھی سے اپنے دھندے وغیرہ سمیٹ کر میکسیکو یا کیوبا کا رخ کرسکتا ہوں لیکن ایک تو میں صرف اڑتالیس سال کی عمر میں ریٹائر ہونا نہیں چاہتا۔ دوسرے میں یہ بھی پسند نہیں کروں گا کہ جب بھی میرا اپنے وطن عزیز کی طرف آنے کا پروگرام بنے تو سرحد پر یہاں کی پولیس میرے خلاف الزامات کی فہرست لیے مجھے گرفتار کرنے کے لیے تیار کھڑی ہو۔ امید ہے اب تم میری بات سمجھ گئے ہوگے۔'' ریگن نے ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا پھر پوچھا۔ ''تم یہ کام کس طریقے سے انجام دو گے۔''

''سیدھے سادے اور اپنے پرانے آزمودہ طریقے سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس طرح کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔''

''اور کس وقت انجام دو گے یہ کام؟ اُس وقت مجھے کسی تقریب میں موجود ہونا چاہیے۔''

اس سوال پر میں نے چند لمحے غور کیا پھر پوچھا۔ رینالڈ شادی شدہ ہے۔

''نہیں۔ تمہیں کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ فرینکلن اسٹریٹ کی بارہویں عمارت کے پانچویں اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا ہے۔'' ریگن نے بتایا۔

''تب پھر وقت کا انتخاب تم خود ہی کرو۔'' میں نے کہا۔

ریگن نے تھوڑی کھجائی اور کچھ سوچ کر بولا۔ ''رات آٹھ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ اس وقت میری منعقد کردہ تقریب میں تمام مہمان کم از کم اس حد تک ہوش و حواس میں ضرور ہوں گے کہ یہ یاد رکھ سکیں کہ میں اس وقت تقریب میں موجود تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم مجھے معاوضے کی ادائیگی کرسکتے ہو۔''

اس معاملے سے فارغ ہوکر میں ہوٹل واپس آیا اور کچھ دیر کے لیے سوگیا۔ نیند سے بے دار ہوکر میں نے کپڑے بدلے۔ اپنا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور چیک کیا اور اس پر سائلنسر فٹ کرکے اسے بریف کیس میں رکھ لیا۔ بریف کیس لے کر میں کمرے سے نکلا اور نیچے ڈائننگ ہال میں آگیا۔ جب میں کھانا کھا کر فارغ ہوا اس وقت آٹھ بجنے میں بیس منٹ تھے میں سست رفتاری کے ساتھ فرینکلن اسٹریٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔

میری مطلوبہ عمارت تین منزلہ تھی جس کا برآمدہ صرف اتنا بڑا تھا کہ دو آدمی بمشکل کود سکتے تھے۔ رینالڈ کا اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔ میں قالین سے ڈھکی سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آیا اور رینالڈ کا اپارٹمنٹ تلاش کرکے میں نے کال بیل کا بٹن دبادیا۔ گھنٹی کے جواب میں جو شخص دروازے پر آیا وہ ظاہر ہے رینالڈ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک میانہ قامت آدمی تھا۔ اس وقت وہ آدمی آستینوں کی قمیص پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں

شام کا اخبار تھا۔ اس نے عقابی نگاہ سے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ ''لیفٹیننٹ رینالڈ۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ ''میں تم سے ایک اہم سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اس کا تعلق ریگن سے ہے۔'' ''اس گفتگو کو دو ایک سال کے لیے ملتوی نہیں کر سکتے۔'' اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال میں ریگن کا تذکرہ سن سن کر بے زار ہو چکا ہوں۔''

''میں جو بات کرنا چاہتا ہوں وہ فوری اہمیت کی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس نے ایک بار پھر سر تا پا میرا جائزہ لیا پھر ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔ اندر پہنچ کر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور بریف کیس اپنے پیروں کے قریب رکھ لیا۔ یہ اپارٹمنٹ ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا جس کے ساتھ کچن اور غسل خانہ ملحق تھا۔ رینالڈ نے ایک لمحے کھڑے رہ کر ہی از سرِ نو میرا جائزہ لیا پھر میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اور نہ ہی آئندہ کبھی دیکھو گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے ابھی اور اسی وقت بات کرنے پر زور دیا تھا۔''

اس نے اچٹتی ہوئی نظروں سے میرے بریف کیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کوئی اطلاع لے کر آئے ہو تو میں ہمہ تن گوش ہوں اور اگر مجھے رقم کی پیش کش کرنے آئے ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔''

میں نے بریف کیس گھٹنوں پر رکھ کر کھولا اور اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تمہارے دونوں اندازے غلط ہیں۔'' میں نے ریوالور نکالا اور اس کے سینے کا نشانہ لے لیا۔ آنکھوں کے سوا اس کے جسم کے کسی حصے نے جنبش نہ کی۔ سائلنسر پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظر میرے چہرے پر آ کر ٹک گئی۔

''کیا خیال ہے، اب تمہیں خریدا جا سکتا ہے۔'' میں نے دلچسپی آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اب میں غور کر رہا ہوں۔'' اس نے نہایت مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میں پہلو بدل کر قدرے آرام سے بیٹھ گیا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں یہاں کیوں نظر آ رہا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''اگر تمہارا مقصد مجھے خوف زدہ کرنا ہے۔'' اس نے اسی مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہے ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''معاملہ اس سے زیادہ نازک ہے۔'' اس کی نظر غیر محسوس انداز سے ایک طرف کو پھیل گئی اور میں سمجھ گیا کہ وہ کس چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا ریوالور ہولسٹر میں محفوظ، کپڑوں کی الماری کے ہینڈل میں لٹکا ہوا تھا اور وہ اس کی دسترس سے تقریباً چھ فٹ دور تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک بار قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہے مگر اس کا بہتر راستہ ڈھونڈنے کے لیے اسے ذرا سی مہلت کی ضرورت تھی۔ مجھے خود بھی تھوڑا سا وقت باتوں میں گزارنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ اس امر کا مشاہدہ بڑی دلچسپی سے کرتا ہوں کہ کوئی شخص اپنی موت کا استقبال کس انداز سے کرتا ہے لیکن اس وقت میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا کیونکہ ریوالور کے سائلنسروں میں ایک بڑا نقص ہوتا ہے کہ یہ ایک فائر کے بعد ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ میں نے ٹریگر دبا دیا۔ رینالڈ کے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ اوندھے منہ فرش پر آ گرا۔

میں نے ریوالور بریف کیس میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رومال سے دروازے کا ہینڈل صاف کرنے کے بعد میں باہر آ گیا۔ میں کال بیل کا بٹن رومال سے صاف کر رہا تھا کہ میں نے رینالڈ کے برابر والے اپارٹمنٹ کے دروازے پر سنہرے بالوں والی اس لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ اس نے دونوں بازوؤں پر سودا سلف کے دو بڑے بڑے لفافے اٹھا رکھے تھے اور چابی سے دروازے کا قفل کھولنے میں

اسے دشواری پیش آ رہی تھی میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ''معاف کرنا۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں ایک زحمت دے رہی ہوں۔ ذرا یہ ایک لفافہ پکڑ لو تا کہ میں دروازہ کھول سکوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے خوش اخلاقی سے مسکرانے کی کوشش کی اور ایک لفافہ پکڑ لیا۔ لڑکی نے تالا کھول کر میرا شکریہ ادا کیا اور لفافہ لیتے وقت میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں بھی مسکرایا اور ہیٹ کا چھجا چھو کر اسے الوداعی سلام کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ باہر فٹ پاتھ پر آ کر میں نے روشنی میں اپنی ہتھیلی کا جائزہ لیا۔ ہتھیلی پر پسینے کی نمی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں اس وقت بالکل پرسکون تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سنہرے بالوں والی لڑکی اگر دوبارہ مجھے دیکھے تو پہچان لے گی لیکن اس سے دوبارہ میرا سامنا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رینالڈ کی لاش اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک دفتر میں اس کی غیر حاضری پر تشویش نہ محسوس کی جاتی اور کسی کو اس کے گھر نہ بھیجا جاتا۔ اس وقت میں سینٹ پال پہنچ چکا ہوں گا۔ رینالڈ کی پڑوسن لڑکی اگر ساری عمر بھی پولیس کے ریکارڈ میں موجود جرائم پیشہ افراد کی تصویریں دیکھتی رہتی تب بھی میری نشاندہی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ میری تصویر پولیس کے ریکارڈ میں نہیں ہے۔

☆☆☆

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے بریف کیس اس سوٹ کیس میں رکھا جس میں پانچ ہزار ڈالر کی رقم بھی موجود تھی۔ میرے پاس اب ایک گھنٹہ تھا۔ روانگی کے لیے کوئی بھی پرواز مجھے ایک گھنٹے سے پہلے نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور نیچے اتر کر کے باہر آ گیا۔ گلی میں تقریباً ایک بلاک کے فاصلے پر مجھے ایک چھوٹا سا اسنیک بار نظر آیا۔ میں کاؤنٹر کے قریب اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''دو برگر اور ایک کافی۔'' میں نے آرڈر دیا۔ کاؤنٹر مین نے میرے سامنے مشین پر برگر تیار کیے اور کافی کا مگ بھر کر دونوں چیزیں میری طرف کھسکا دیں۔

''آج موسم خاصا سرد ہے۔'' اس نے گفتگو برائے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال کا ایک مختصر سی جسامت کا آدمی تھا۔۔۔ لیکن آدمی تجربہ کار لگتا تھا۔

''ہاں۔ خاصی ٹھنڈ ہے۔'' میں نے کہا اور سرسری نظر سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ اسنیک بار میں میرے علاوہ صرف ایک ہی گاہک تھا۔ وہ سرمئی بالوں والا ایک پختہ العمر آدمی تھا جو ایک کیبن میں بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ میں نے برگرز کی پلیٹ اپنی طرف کھینچی ہی تھی کہ دھڑ سے بیرونی دروازہ کھلا اور دو لڑکے اندر آ گئے۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ان دونوں کی عمریں بیس برس سے کم ہی تھیں۔ ان کے کرخت چہروں پر زردی بکھری ہوئی تھی اور سکڑی ہوئی آنکھیں ایک عجیب سی وحشت سے چمک رہی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اوباش چھوٹے چھوٹے لٹیرے ہیں۔

میں نے برگر کا ایک لقمہ توڑا اور دھیرے دھیرے چبانے لگا۔ دونوں لڑکے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ہچکچائے پھر ان میں سے لمبے قد والا موسیقی کی مشین کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا انداز پراسرار تھا۔ مشین کی طرف اس نے پشت کر لی اور جیکٹ کی جیب سے ایک زنگ آلود سا ریوالور نکال لیا۔

''یہ ریوالور بڑی عمدگی سے فائر کرتا ہے۔'' اس نے اعلان کیا۔

''تم میں سے کوئی شخص چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے تو وہ اپنے پوتے پوتیوں تک کو اس ڈاکے کی کہانی سنانے کے لیے زندہ رہے گا۔''

دوسرے لڑکے نے جو ریوالور نکالا تھا۔ وہ قدرے بہتر تھا اس نے ریوالور سے کاؤنٹر مین کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیش رجسٹر کے پاس سے

ہٹ جاؤ، بڑے میاں! میں ایک نظر رقم دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ کیبن میں موجود، سرمئی بالوں والے آدمی نے چھری کا نشار کھ دیا ہے اور سر کی خفیف سی حرکت کے ساتھ دونوں لٹیروں کا جائزہ لیا ہے۔ پستہ قد لڑکے نے آگے بڑھ کر دروازے پر "کلوزڈ" کی تختی لٹکا دی پھر کاؤنٹر پر آ کر کیس رجسٹر میں موجود رقم کا جائزہ لیا۔ مایوسی اور بدمزگی سے اس کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے۔ صرف بائیس ڈالر! اس نے دانت پیس کر کہا اور رقم غصیلے انداز میں جیب میں ٹھونس لی۔

"تمہیں کتنی رقم کی توقع تھی۔" بڑے میاں نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی بینک تو نہیں ہے۔"

پستہ قد لڑکا کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔

"اب تم تینوں اپنے اپنے پرس بڑے فرش پر پھینک دو۔" اس نے حکم دیا۔ میں نے محتاط انداز میں اپنا بٹوہ نکال لیا اور فرش پر پھینک دیا پھر میں نے کیبن کی طرف دیکھا۔ سرمئی بالوں والا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دو ایک گہری گہری سانسیں لیں اور اپنے کوٹ کا بٹن کھولنے لگا۔ اس نے بیلٹ ہولسٹر سے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکالا لیکن ابھی وہ اسے سیدھا بھی نہ کر پایا تھا کہ لمبے لڑکے کا ریوالور دو مرتبہ گرجا اور سرمئی بالوں والا میز اور صوفے کے درمیان دوہرا ہوگیا۔ لمبے لڑکے کا سر اب میری طرف گھوم گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں قاتلوں والی دیوانگی جھلک آئی تھی۔ میں نے کاؤنٹر کے عقب میں چھلانگ لگائی اور برتنوں کے شیلف کے سامنے فرش پر گر گیا۔ دو فائر اور ہوئے اور میری پشت پر برتنوں کی کرچیاں آ گریں۔ میں کاؤنٹر کی آڑ میں بے حس و حرکت پڑا رہا پھر میں نے پستہ قد لڑکے کی آواز سنی۔

"ہوش میں آؤ گدھے! چلو فوراً یہاں سے نکل بھاگیں۔"

میں نے ان کے قدموں کی آواز تیزی سے دور جاتے محسوس کی پھر دروازہ زور دار آواز کے ساتھ بند ہوگیا اور سناٹا چھا گیا لیکن میں اپنے آپ میں اٹھنے کی سکت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اپنی کمزوری پر مجھے خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ بالآخر بڑے میاں کاؤنٹر کے عقب میں سیدھے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور ان کے ہونٹ کس سے بھنچ گئے پھر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے یکلخت گویا ہوش سا آیا۔ مجھے اب فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں اس قسم کی صورت حال میں الجھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا میں اپنی کانپتی ٹانگوں پر اٹھ کھڑا ہوا اور تب میں نے دیکھا کہ دروازے کے شیشے سے بے شمار چہرے اندر جھانک رہے تھے اور دور کہیں پولیس سائرن کی مدھم سی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ گویا بڑے میاں کو فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، کسی نے فائرنگ کی آواز سن کر پہلے ہی پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر احساس ہوا کہ مجھے بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ باہر ہجوم بڑھتا جا رہا تھا اور تماشائیوں کی دہشت آمیز نظریں باری باری سرمئی بالوں والے کی لاش اور پھر میرا اور بڑے میاں کا طواف کر رہی تھیں۔ میں نے سوٹ کیس نیچے رکھ دیا اور دونوں ہتھیلیاں پتلون پر رگڑ کر پسینہ پونچھا پھر میں نے متوحش نظروں سے بڑے میاں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اس احمق کو ہیرو بننے کا شوق چرایا تھا۔ اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش کیوں کی تھی۔"

بڑے میاں ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئے اور جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرتے ہوئے بولے۔ "یہ اس کا فرض تھا برخوردار، کیونکہ یہ ایک سپاہی تھا۔" انہوں نے افسردہ سی نظروں سے سرمئی بالوں والے کے بے حس و حرکت جسم کی طرف دیکھا۔ "جوفرلے نام تھا اس کا۔ نیا نیا پولیس میں بھرتی ہوا تھا اور اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ بے چارہ سکون کے چند لمحات گزارنے اور کچھ کھانے آیا تھا۔" پھر بڑے میاں کی آنکھوں میں تختی جھلک آئی۔

"پولیس کی نوکری میں قتل و غارت گری کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے لیکن بہرحال ایک پولیس والے کا قتل کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ اس قسم کے واقعے پر تو پولیس فورس غصے سے پاگل ہو جاتی ہے، مسٹر!" انہوں نے پائپ کو شعلہ دکھانے کے بعد بات جاری رکھی۔ وہ دونوں اچکے گرفتاری سے نہیں بچ سکتے اور گرفتاری کے بعد عدالت میں پیش ہونے تک ان کے جسموں کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں گی اور پولیس والے ثبوت پیش کر دیں گے کہ یہ ہڈیاں گرفتاری کی کارروائی کے دوران ہی لٹیروں نے بھاگ دوڑ میں تڑوائی ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

دو پولیس والے ہجوم میں سے راستہ بنا کر اندر آتے دکھائی دیے۔ اندر پہنچ کر انہوں نے خاموشی سے سرمئی بالوں والے کی لاش کا جائزہ لیا پھر ان میں سے ایک باہر کھڑی اسکواڈ کار کی طرف واپس چلا گیا۔ میں نے کاؤنٹر پر سے اپنا کافی کا کپ اٹھایا لیکن میرا ہاتھ اس بری طرح سے کانپ رہا تھا کہ میں نے اسے واپس کاؤنٹر پر ہی رکھ دیا اور اس کی جگہ ایک سگریٹ سلگا لی۔ شعبہ قتل کے سراغ رساں دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے اور ان میں سے دو مجھے اپنے ساتھ ایک کیبن میں لے گئے۔

"میں سارجنٹ ولسن ہوں۔" ان سے ایک نے کہا۔ وہ میری طرح دراز قد لیکن مجھ سے دبلا تھا اور اس کے بالوں پر سفیدی غالب آ رہی تھی۔ اس نے انگوٹھے سے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا شریک کار سارجنٹ کوپر ہے۔ تمہارا نام؟"

میں نے اپنا صحیح نام بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ وہ میرے کاغذات ضرور دیکھیں گے۔ "چارلس ٹریپ۔" میں نے کہا پھر ان کے پوچھنے پر میں نے اپنا سینٹ پال کا ایڈریس بھی بتایا اور کہا۔ "میں یہاں چند دوستوں سے ملنے آیا تھا اور واپسی کے لیے مجھے دس بجے والی فلائٹ پر پہنچنا ہے۔"

"مسٹر!" سارجنٹ ولسن نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں ایک پولیس والا قتل ہوگیا ہے۔ تمہاری واپسی دوسرے جہاز سے بھی ہو سکتی ہے۔"

"اس واقعے کے متعلق ہمیں شروع سے بتاؤ۔" کوپر نے ملائمت سے کہا۔ میں نے انہیں شروع سے سارا قصہ سنایا اور دونوں لٹیروں کے حلیے بتائے۔

"اگر تم دوبارہ انہیں دیکھو تو پہچان لو گے؟" سارجنٹ ولسن نے پوچھا۔

میں ہچکچایا۔ "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں اس وقت خاصا خوف زدہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے ان کے حلیے تو بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم انہیں پہچان لو گے۔" سارجنٹ ولسن یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "بہتر ہوگا کہ تم اور بڑے میاں ہمارے ساتھ ہیڈکوارٹرز چلو۔ ہم تمہیں کچھ پیشہ ور مجرموں کی تصویریں دکھانا چاہتے ہیں۔"

"سارجنٹ!" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "میرا اگلی پرواز سے سینٹ پال پہنچنا نہایت ضروری ہے۔"

"میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔" سارجنٹ ولسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہیڈکوارٹرز پہنچ کر وہ مجھے اور بڑے میاں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے اور ہمارے سامنے جرائم پیشہ افراد کے ریکارڈ کی فائلیں لا کر ڈھیر کر دیں۔ سارجنٹ ولسن نے کہا۔

"یہ سوٹ کیس ایک کونے میں رکھ دو تاکہ تم آسانی سے بیٹھ سکو۔"

"میں بالکل ٹھیک بیٹھا ہوں۔" میں نے سوٹ کیس کو مزید اپنے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میں دو گھنٹے تک فائلوں کے اوراق پلٹتا رہا۔ میری سگریٹیں ختم ہوگئیں تو سارجنٹ ولسن نے مجھے دوسرا پیکٹ منگوا دیا۔ بالآخر ایک فائل کے ورق الٹتے وقت میری نظر ایک تصویر پر پڑی۔ یہ ان دونوں

لٹیروں میں سے لمبے والے کی تصویر تھی جس نے فائرنگ کی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگا کر چند کش لیے اور ایک منٹ غور کرنے کے بعد بالآخر سر اٹھا کر کہا۔
"یہ ان دونوں میں سے ایک ہے۔"
سارجنٹ ولسن اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا۔ اس نے تصویر بغور دیکھی اور اس سے منسلک ریکارڈ پڑھنے کے بعد تصدیق کے لیے فائل بڑے میاں کی طرف بڑھائی۔ بڑے میاں نے عینک درست کر کے ہر زاویے سے تصویر کو دیکھا اور کہا۔ "یقیناً یہ وہی ہے۔"
میں نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے اب اجازت دو۔ سینٹ پال میں میری ایک ضروری ملاقات طے ہے۔ دوسرے لٹیرے کی تصویر بڑے میاں شناخت کرلیں گے۔"
"دیکھتے رہو۔ دیکھتے رہو۔" ولسن نے لاپروائی سے کہا اور فائل میرے سامنے چھوڑ کر کمرے سے رخصت ہوگیا۔ اس کی واپسی بیس منٹ بعد ہوئی۔ اس کے چند منٹ بعد سارجنٹ کوپر بھی کمرے میں آ گیا۔ وہ مضطربانہ انداز میں ماچس کی ایک تیلی چبا رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے سارجنٹ ولسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو ایک ہی پولیس والے کے قتل پر پاگل ہو رہے ہو۔ میٹ رینالڈ کے قتل کی خبر بھی آ گئی ہے۔"
"مذاق نہ کرو۔" ولسن اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔
کوپر نے واٹر کولر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "رینالڈ کا بھائی اتفاقاً اس کے گھر چلا گیا تھا اس نے رینالڈ سے گولف کھیلنے کی چھڑیاں عاریتاً لینی تھیں۔ اس نے گھنٹی بجائی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ کسی طرح دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچا تو رینالڈ اسے مردہ حالت میں قالین پر پڑا ملا۔ اس کے سینے میں گولی پیوست تھی۔" کوپر نے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر پیا اور کمرے سے چلا گیا۔
میں نے فائل کے مزید چند ورق پلٹے اور دوسرے لٹیرے سے کسی حد تک ملتی جلتی ایک تصویر منتخب کی اور جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔ "دوسرا لڑکا یہ تھا۔" سارجنٹ ولسن نے تصدیق کے لیے تصویر بڑے میاں کو دکھائی اور یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ بڑے میاں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
"بڑے میاں کی نظر صحیح کام نہیں کر رہی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے۔" ولسن نے کہا۔ "بہرحال ہم اطمینان کرلیں گے اس تصویر کو فی الحال ہم ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ اور باقی تصویریں بھی دیکھ لو، مجبوراً مجھے بیٹھنا پڑا۔ کچھ دیر بعد کوپر دوبارہ اندر آیا اور بولا۔ "رینالڈ کے قتل کے سلسلے میں ایک شہادت ملی ہے۔ ایک لڑکی جو رینالڈ کے برابر والے اپارٹمنٹ میں رہتی ہے، نے بتایا ہے کہ اس نے آج شام ایک شخص کو رینالڈ کے اپارٹمنٹ سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے خاصی اچھی طرح اس شخص کی صورت دیکھی تھی۔ ہم نے لڑکی کو یہاں بلوایا ہے۔ تاکہ وہ کچھ تصویریں دیکھ لے۔ شاید ان میں اس شخص کی تصویر نکل آئے۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس شخص کے دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی کی پور غائب ہے۔ یہ چیز لڑکی نے اس وقت دیکھی تھی جب اس شخص نے ہیٹ کا چھجا چھو کر اسے الوداعی سلام کیا تھا۔"
میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنالی اور بظاہر انہماک سے تصویریں دیکھتا رہا۔ مجھے ایک تصویر نظر آئی جو میرے خیال میں پستہ قد لٹیرے کی تھی لیکن بڑے میاں نے اسے بھی بغور دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلا دیا اور بولے۔ "یہ اس لٹیرے سے کافی حد تک ملتی ہے لیکن اس کی نہیں ہے۔"
"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے بڑے میاں!" میں نے جھلا کر کہا۔ "یہ وہی ہے۔ آخر میں بھی تو جائے واردات پر موجود تھا۔ کیا میں اسے نہیں پہچان سکتا۔"
"میں بھی موجود تھا۔" بڑے میاں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "اور میری نظر ابھی اتنی کمزور نہیں۔"
میں نے سارجنٹ ولسن کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں سرد مہری پا کر دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھا

فائلیں کھنگالنے لگا۔ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا تو میں غیر ارادی طور پر اچھل پڑا۔ کسی کی بھاری سی آواز سنائی دی۔ "ہم نے ان لٹیروں کو پکڑ لیا ہے۔ سارجنٹ!"
میں نے فوراً اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے میاں قدرے اطمینان سے اٹھے اور انہوں نے اٹھ کر انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔
"اب چلو بھی بڑے میاں!" میں نے بے تابی سے کہا۔ سارجنٹ کوپر ہمیں ایک بڑے سے کمرے میں لے آیا جہاں دونوں لٹیرے ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ اس وقت ان کا دھیان صرف اپنی چوٹیں سہلانے پر تھا۔ لمبا لڑکا ناک پر رومال رکھے کراہ رہا تھا اور رومال خون میں تر تھا۔ اس کے چہرے پر نیل اور خراشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ پستہ قد کا چہرہ تو اس قدر سوجا ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں ہی بند نظر آ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے تقریباً رو رہا تھا۔ ان کے عقب میں کھڑا عظیم جسیم باوردی سپاہی مسکرایا اور اس نے پستہ قد لڑکے کے بال مٹھی میں جکڑ کر جھٹکے سے اس کا چہرہ اوپر کیا تاکہ ہم زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکیں۔ "یہ دونوں بے حد عجلت پسند مجرم ہے۔" سپاہی نے کہا۔ "بھاگتے وقت کئی مرتبہ سیڑھیوں سے گر پڑے تھے۔" وہ ان کے چہروں کی ٹوٹ پھوٹ کا جواز پیش کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کے ہاتھ کی پشت پر لگے ہوئے خون کے دھبے اصل کہانی سنا رہے تھے کہ اس نے ان دونوں پر اچھی طرح غصہ نکالا ہے۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ جنہیں میں نے انگلی سے پونچھ ڈالا۔
"بتانے کی ضرورت نہیں۔" بڑے میاں نے سپاہی کو تسلی دی۔ "ہم نے ان کی شکلیں دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا اور ہمیں ان کی حالت پر قطعاً افسوس نہیں۔"
سارجنٹ ولسن نے دونوں مجرموں کا جائزہ لیا اور سپاہی سے مخاطب ہوا۔ "تم نے بڑی نرم دلی سے کام لیا ہے ہیرس! ابھی تو ان کے چہرے کافی حد تک

بھڑاس

ایک شخص اپنے دوست کے سامنے اپنی بیوی کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ "کبھی کبھی، اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اٹھا کر اوپر والی منزل سے نیچے پھینک دوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ میں ایسا کر نہیں سکتا۔"
"کیوں؟" دوست نے پوچھا۔ "یقیناً اس کا وزن زیادہ ہوگا۔"
"نہیں۔" ان صاحب نے چڑ کر کہا۔ "سوچتا ہوں اگر وہ بچ گئی تو میرا کیا ہوگا؟"

☆☆☆

بھڑاس

ایک بڑی سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ سڑک کے درمیان میں پھنسی ایک ڈبل ڈیکر بس کو پانچ بے وقوف دھکا لگا کر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر بس ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔
اسی دوران ایک ٹریفک سارجنٹ بڑی مشکل سے ادھر آ پہنچا اور بس کو دھکا لگایا مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔
ٹریفک سارجنٹ نے بے وقوفوں سے کہا۔ "میں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ ماجرا کیا ہے؟ تم دھکا لگاتے جاؤ۔"
سارجنٹ نے بس کی دوسری طرف سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ "آگے سے بھی پانچ بے وقوف پیچھے کی طرف دھکا لگا رہے تھے۔"

☆☆☆

سلامت ہیں۔''

ہیرس کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''انہیں چند منٹ پہلے ہی یہاں لایا گیا ہے سارجنٹ! مجھے زیادہ وقت نہیں ملا۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہم نے انہیں پہچان لیا ہے۔ یہ وہی ہیں۔'' میں نے کہا اور اپنے لہجے کے اضطراب اور آواز کی کپکپاہٹ پر خود حیران رہ گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے بڑے میاں۔'' ولسن نے پوچھا۔ بڑے میاں کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا اور بے چینی سے کہا۔

''جلدی جواب دو بڑے میاں! کیا پوری رات سوچو گے۔''

''تحمل سے کام لو۔'' بڑے میاں نے مجھے تلقین کی پھر مزید چند منٹ غور کرنے کے بعد بولے۔ ''ہاں۔ یہی ہیں۔''

''بہرحال ابھی تم لوگوں کو مزید تھوڑی سی کارروائی کے لیے کچھ دیر رکنا پڑے گا۔'' ولسن نے کہا۔ وہ ہمیں ایک اور کمرے میں لے آیا اور کچھ ٹائپ شدہ کاغذات میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اسے غور سے پڑھ لو کوئی اندراج غلط تو نہیں ہے۔ پھر اس پر دستخط کر دو۔ یہ تمہارا بیان ہے۔''

میں نے کاغذات پر سرسری سی نظر دوڑائی اور تیزی سے اپنے دستخط گھسیٹ دیے۔ ''تم بہت تیزی سے پڑھتے ہو مسٹر!'' ولسن نے کہا اور بغور میرے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں گویا اسے کوئی بات یاد آ رہی ہو۔ میں دروازے کی طرف چل دیا۔ ولسن میرے پیچھے پیچھے آیا اور بولا۔ ''تم بہت ہی عجلت میں ہو۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''حالانکہ رات تو تمہیں شہر ہی میں گزارنی پڑے گی۔ کیونکہ گیارہ بجے کے بعد یہاں سے کوئی جہاز نہیں جاتا۔''

''میں ٹرین پکڑ لوں گا۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''ہم تم سے رابطہ رکھیں گے۔'' ولسن نے کہا۔ ''کیونکہ عدالتی کارروائی کے دوران تمہیں گواہی دینا پڑے گی۔''

''یقیناً۔'' ''یقیناً'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ولسن میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ حالانکہ میں کوریڈور میں حتی الامکان تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ پھر ہم سیڑھیاں اترنے لگے اور ہمارے جوتوں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ اس وقت ہم دوسری منزل کی سیڑھیاں اتر چکے تھے اور موڑ کاٹ رہے تھے۔ جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔

وہ دو سادہ لباس والوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ہمارے قدموں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ شناسائی کی حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں خوف سے میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ اب میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ بچاؤ کی طرف ایک ہی کوشش تھی جو میں کر سکتا تھا۔

میں نے سوٹ کیس فرش پر رکھا اور اس کے کلپ کھولنے لگا۔ ''تمہیں کیا ہوا۔۔'' میں نے ولسن کو حیرت سے کہتے سنا۔

''یہ وہی ہے۔'' عین اسی وقت لڑکی چلائی۔ میں اس وقت سوٹ کیس کے دونوں کلپ کھول چکا تھا اور تالے کا کھٹکا دبا رہا تھا۔ پھر میری انگلیاں ریوالور کے دستے سے مس ہی ہوئی تھیں کہ ولسن کی ٹانگ نے حرکت کی۔ ٹھوکر میری کنپٹی پر پڑی اور میں سیڑھیوں سے لڑھکنے لگا۔ رکنے کے لیے میں نے کسی چیز پر ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن ہوا کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ پتھریلی سیڑھیوں کے کنارے میرے چہرے اور جسم میں کھب رہے تھے۔ چوٹوں کی اذیت ناقابل برداشت تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ تو صرف ابتدا ہے۔ صرف ابتدا۔۔۔

آخری دعا

کامران جاذب

کتنے ہی گھروں میں مائیں بیٹوں کی لاپروائی اور نفرتوں کی اشتہا سے مر رہی ہیں۔ بہو پوچھے نہ پوچھے اس کی اپنی مرضی مگر بیٹے ماؤں کو بھول جائیں تو دوزخ کا عذاب دنیا میں ہی شروع ہو جاتا ہے۔

ایک ایسی بیٹی کی دلسوز کہانی جسے اپنی ماں سے بے انتہا پیار تھا

یوں تو ہر بیٹی کو اپنی ماں سے پیار ہوتا ہے لیکن مریم کو اپنی ماں سے والہانہ محبت تھی۔

شاید اس کی یہ بھی وجہ تھی مریم کا باپ اسے دو سال کا چھوڑ کر چل بسا تھا باپ کے حصے کی محبت بھی اس نے ماں کے لیے وقف کر دی اپنے بھیا کی وہ اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ بچپن میں اپنی ماں کو سجانا مریم کا بہترین مشغلہ تھا کبھی امی کے بال بنا رہی ہے کبھی دوپٹہ اوڑھا کر اس کا چھوٹا سا گھونگھٹ نکال کر پھر خود بھی گھونگھٹ کے اندر منہ کر کے اپنی امی کے رخساروں پر پیار کر رہی ہے۔ جب مریم جوان ہوئی اور کالج جانے لگی تو اپنی شوخ سہیلیوں کے درمیان رہ کر بھی وہ ماں کے پاس جا کر اس کی آغوش میں منہ ڈال کر زیادہ خوشی محسوس کرتی۔ کالج سے آتے ہی وہ بھوک پیاس نظر انداز کر کے کتابوں کا بنڈل تخت پر پھینکتی اور اپنی ماں کی آغوش میں منہ چھپا لیتی اس کی دراز چٹیا زمین پر پڑی ہوتی اور بھیا اس کی چٹیا کھینچ کھینچ کر کہتے۔

''چلو اٹھو کھانا کھا لو۔''

جب بھیا انہیں اکیلا چھوڑ کر اپنی ملازمت پر چلے گئے تو مریم کے لیے اب ایک ہی کام رہ گیا تھا۔

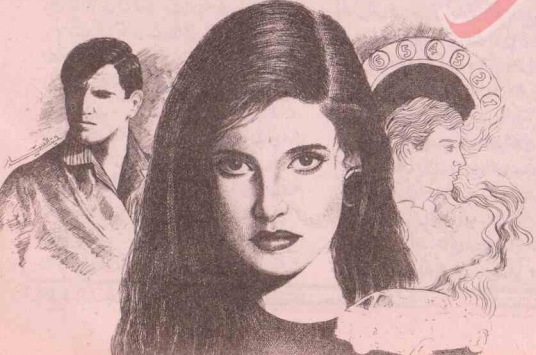

اپنے پیارے سے بھیا کے لیے پیاری سی دلہن ڈھونڈنا۔ اس نے اپنے محلے میں ہی ایک لڑکی پسند کر لی، اسے یقین تھا یہ لڑکی ان کے مختصر سے خاندان میں آ کر ان کی خوشیوں میں اضافہ کرے گی۔

اپنے بھیا کی شادی پر اس نے اپنی بوڑھی ماں کو گوٹے سے بھرا دوپٹا اوڑھایا اور پھر سب کے سامنے ماں کے گلے لگ کر ان کا جھریوں بھرا چہرہ چوم کر بولی۔

''میری امی کو نظر نہ لگ جائے امی جب آپ دلہن بنی ہوں گی تو کتنی خوب صورت لگی ہوں گی میرے ابو تو آپ کے دیوانے ہوں گے۔ کاش! آج ابو زندہ ہوتے اور بیٹے کی شادی پر آپ کو پھر دولہن بنا دیکھتے۔''

جب بھیا اپنی دلہن کو لے کر دور دیس چلے گئے تو ماں کو اکیلا پا کر مریم کی محبت میں اور شدت آ گئی۔ اس کی والہانہ محبت کو دیکھ کر محلے کی بوڑھی خواتین سوچتیں۔

''یہ لڑکی سسرال میں کیسے دل لگائے گی یہ تو روز اپنی ماں کے پاس بھاگی آئے گی۔''

جب مریم کی ماں بیمار ہوئی تو مریم نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

دن رات ماں کے پاس بیٹھی اس کی صحت و زندگی کی دعا مانگا کرتی۔ اس نے اتنی تندہی سے ماں کی تیمارداری کی کہ ڈاکٹر حیران رہ گیا۔ ایک دن مریم کو کہنے لگا۔ ''میرے علاج سے زیادہ آپ کی تیمارداری نے مریضہ کو بچا لیا۔ میں آپ کو اپنے ہاسپٹل لے جاؤں گا تاکہ آپ میری نرسوں کو ٹریننگ دیں۔''

اس کے اترے ہوئے چہرے اور شب بیداری سے سرخ آنکھیں دیکھ کر اس کی سہیلیاں کہتیں۔

''مریم! خود بھی آرام کیا کرو۔ اس طرح تو تم خود بیمار ہو جاؤ گی۔ رات کو امی کے کمرے میں بوا کو سلایا کرو۔''

اپنی ماں کو وسیع گھر میں اکیلا چھوڑ کر آتے ہوئے وہ بہت روئی۔ جمال کو آئے ابھی مہینہ بھی ... ہوا تھا۔

اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر بڑا سا تالا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ محلہ کی عورتوں نے اسے بتایا اس کی ماں بیمار ہو گئی تھی اور اس کا بھیا آ کر انہیں اپنے پاس لے گیا۔

مریم نے اسی وقت بھیا کے گھر جانا چاہا سفر بہت طویل تھا۔ رات گئے وہ بھیا کے گھر پہنچی۔ ملازم اسے ماں کے کمرے میں لے گیا۔ اتنی رات گئے اس نے بھیا بھابی کو جگانا مناسب نہ سمجھا زندگی میں پہلی بار اس کے گلے لگ کر روئی ورنہ ہمیشہ مریم ان کے ساتھ رویا کرتی۔ ماں کو ملیریا ہو گیا تھا۔ مریم انہیں تسلی دیتی رہی۔ ''واہ! امی اتنی معمولی سی بیماری سے گھبرا گئیں آپ تو بڑی بہادر تھیں۔''

مریم نے جان لیا اس کی ماں بخار سے پریشان نہ تھیں بلکہ بہو کے رویہ سے پریشان تھیں جسے مریم ان کی بیٹی بنا کر لائی تھی۔ اس نے اپنے بھیا کے لیے امیر گھرانہ نہ دیکھا تھا بلکہ یہ سوچا تھا متوسط گھرانہ کی یتیم لڑکی جس نے بچپن میں ہی ماں کو کھو دیا تھا اس کی ماں کو اپنی ماں سمجھے گی مریم یہ نہ جان سکی بعض لوگ جنہوں نے ایسا مقدس پیار دیکھا ہی نہ ہو وہ اس آفاقی جذبہ کی قدر کیا جانیں۔

مریم جتنے دن وہاں رہی ماں کو ہی سمجھاتی رہی۔ ''امی! آپ کو میرے ابو کے لاڈ پیار نے اپنی زندگی میں ہی سب جائیداد کا انتظام آپ کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ آپ نے ابو کی زندگی میں اتنی محبت پائی جس نے آپ کو نازک مزاج بنا دیا ہے آپ صبر سے کام لیں اور بھابی کی کوتاہیاں درگزر کر دیں۔''

اس نے بھیا سے کوئی شکوہ شکایت نہ کی بلکہ ماں کو ہی سمجھاتی رہی۔ اس کی ماں نے بھی بہو کے گستاخانہ رویہ کی کوئی شکایت بیٹے سے نہ کی اور پھر کہنے کو ان کے پاس تھا بھی کیا۔ ان کی طرف بہو جس نفرت، حقارت اور گستاخی سے دیکھتی وہ نظریں ان کے دل پر کچوکے لگاتیں اس وقت کیا وہ اپنی بہو کی تصویر کھینچ کر اپنے بیٹے کو دکھاتیں۔

اگر اپنے بیٹے کے ملازموں کو وہ کوئی حکم دیتیں تو بہو کی غصہ سے بھری آواز بند ہو جاتی۔

''جس دن میری ماں کو کچھ ہو گیا وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میرا دل تو ماں کی محبت کے سہارے دھڑک رہا ہے جس دن خدا نے یہ نعمت مجھ سے چھینی میں مچھلی کی طرح تڑپ کر مر جاؤں گی۔''

اپنی ضعیفی اور علالت سے گھبرا کر ماں نے جلد ہی اس کی شادی کر دی۔ رخصتی کے وقت وہ ماں کے گلے لگ کر اتنا روئی جتنا شاید ہی کوئی لڑکی پی کے گھر جاتے ہوئے روئی ہو۔

یہ بھی خدا کا شکر ہے سجاد طبیعت کا محبت کرنے والا شوہر تھا۔ مریم صبح اٹھتے اسے کہتی۔ ''سجاد آج میں نے ماں کو بہت پریشان دیکھا مجھے جلدی ماں کے پاس لے چلو مہینے میں وہ کئی چکر اسی طرح خواب دیکھ کر لگا جاتی۔

جب مریم کے بیٹا پیدا ہوا اور اس کی ماں اس کے گھر آ کر رہی تو مریم کو بہت سکون ملا۔ سب کا خیال تھا اپنی مامتا میں کھو کر مریم اب اپنی ماں کی دیوانی نہ رہے گی۔ لیکن اس وقت سب حیران رہ گئے جب ایک ماہ کے جمال کو ماں کی گود میں ڈال کر خود ماں کے کندھے سے سر لگا کر اس نے کہا۔

''امی جمال کو آپ اپنے ساتھ لے جائیں اس کے ساتھ آپ کا دل بہلا رہے گا آپ میرے لیے اداس نہ ہوا کریں گی۔'' اس کی ساس غصہ سے بل کھا کر رہ گئی اور وہ بڑی معصومیت سے سجاد کا ہاتھ جھلا کر بولی۔

''سچی کتنا مزا آئے گا۔'' اب مریم اپنے خواب نہ سنایا کرتی بلکہ ہر اتوار صبح تیار ہو کر بیٹھ جاتی اور سجاد کوشش کے باوجود اس کی بات کبھی نہ ٹال سکتا۔

وقت گزرتا گیا اور جب جمال اسکول جانے کے قابل ہوا تو مریم کو مجبوراً اپنی ماں کے کہنے پر اسے اپنے گھر لانا پڑا اور اس دن تو مریم بھی سناٹے میں آ کر رہ گئی جب بھابی کا یہ جملہ اس نے سنا۔

''بہت لاڈلی ہے ماں تو ماں کو ہی گھر میں رکھیں اس گھر میں یا میں رہوں گی یا ماں۔''

مریم کا دل چاہتا زندگی کی آخری منزل میں پڑی اپنی ماں کو وہ اپنے گھر میں لے جائے مگر اپنی سسرال کے طعنے اور بڑے بھیا کے یہ الفاظ۔

''مریم! آخر ماں کو یہاں کیا تکلیف ہے اچھا کھاتی ہیں اچھا پہنتی ہیں تم اپنی سسرال والوں کی نظر میں مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو۔''

مریم خاموش ہو جاتی وہ کیسے کہتی۔ ''بھیا! بوڑھے لوگ اس عمر میں بہت حساس ہو جاتے ہیں اچھا کھانا اور اچھا لباس نہیں چاہتے صرف اچھا رویہ ہی انہیں خوش رکھ سکتا ہے۔ بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ یہ چیزیں انہیں خوش نہیں رکھ سکتیں۔ جسم پر ریشمی لباس ہو منہ میں سونے کا نوالہ اور دل پر طعنوں اور کچوکوں کے تیر لگ رہے ہوں تو انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے۔''

اپنی ماں کو خدا کے سپرد کر کے وہ اپنے گھر آ گئی جس گھر کا ذرّہ ذرّہ اس کی ماں کو خوش آمدید کہنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں سے جہاں ہم نے جہیز جیسی لعنت گلے ڈالی وہاں بیٹی کے گھر رہنا بھی معیوب سمجھنے لگے۔ بیٹی جسے بھائیوں کے ساتھ خود خدا نے حکم دے کر وارثت میں حصے دار بنایا جس نے بھائیوں کی ہی

لالٹین

ایک پروفیسر صاحب اپنے کسی دوست کے گھر رات کے کھانے پر گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ لالٹین اس خیال سے لے لی کہ اگر بجلی چلی گئی تو راستے میں پریشانی نہیں ہو گی۔

رات کے دس بجے وہ دعوت سے اپنے گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کے دوست نے اپنے ملازم کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا جس پر لکھا تھا۔

''آپ کی لالٹین بھیج رہا ہوں، آپ میرے طوطے کا پنجرہ بھجوا دیں۔''

طرح ماں کی گود میں پرورش کی اس کا دودھ پیا وہی بیٹی شادی کے بعد غیر بن گئی۔

مریم بہت افسردہ رہنے لگی۔ اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے اس کی ماں جسے شوہر کی طرف سے بے حد چاہت عزت ملی تھی جس کے مزاج میں ایک شاہانہ وقار تھا بہو کی ہر وقت کی گستاخیاں برداشت نہ کر سکی۔ ان کا دل چھلنی ہو گیا الفاظ کے نشتروں سے ان کے اندر لگے زخموں کے منہ سے لہو بہنے لگا۔ وہ لب جو اپنے بچوں کی بہتری کے لیے ہر وقت دعا گو رہتے تھے اب ان پر خون جما رہتا۔ وہ چپ چاپ بستر پر پڑی سوچتی رہتیں نہ جانے کیا کیا۔

اس رات ماں کی حالت بہت خراب تھی۔ بھیا نے سب رشتہ داروں کو بلا لیا۔ روتی تڑپتی مریم بھی جمال کو سینے سے لگائے آ پہنچی۔ رو رو کر مریم کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ رشتہ دار اور محلے والے اس کا غم سے نڈھال چہرہ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے اس کی ماں کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کرتے۔ جہاندیدہ بوڑھی عورتیں اس کی ماں کی حالت دیکھ کر حسرت سے مریم کی طرف دیکھتیں۔

''ہائے مریم! کیسے برداشت کرے گی یہ دکھ ایسی اندھی محبت شاید ہی کسی بیٹی نے اپنی ماں سے کی ہو۔ ہائے ہائے! اس کا کیا بنے گا یہ زندہ کیسے رہے گی۔'' اس کی سہیلیاں دیوار کے ساتھ سر لگائے رو رہی تھیں اور ان کے کانوں میں مریم کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''جس دن میری ماں کو کچھ ہو گیا وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میرا دل تو ماں کی محبت کے سہارے دھڑک رہا ہے جس دن یہ نعمت خدا نے مجھ سے چھینی میں مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی۔''

''اللہ مریم کو حوصلہ دینا، صبر دینا، اسے اپنے جمال کے لیے زندہ رکھنا۔ اس کی سہیلیاں سہمی ہوئی روتے ہوئے دعا کر رہی تھیں۔ بار بار ان کی نظریں مریم کے چہرے پر ٹھٹک جاتیں۔ شدتِ غم سے اس کا زرد اور ویراں چہرہ دیکھ کر وہ سہم جاتیں ان کے لب پھر حرکت میں آ جاتے۔

''اللہ رحم کر مریم پر رحم کر اس کی ماں کو اس سے نہ چھیننا یہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔''

مریم کو غم سے نیم مردہ پڑا دیکھ کر ایک بوڑھی خاتون آگے بڑھیں، مریم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بھرائی آواز میں بولیں۔

''مریم! جاؤ نماز پڑھو، دعا کرو، دعا میں بڑی طاقت ہے وہ تمہاری ماں کو موت کے منہ سے کھینچ لائے گی۔''

مریم اٹھی، تھوڑی دیر اپنی ماں کے جھریوں سے بھرے شفیق چہرے کو دیکھتی رہی پھر ایک ویران نگاہ اپنی آنسو بہاتی بھابی پر ڈالی اور جانماز لیے خاموشی سے اندر چلی گئی۔ جب بہت دیر تک مریم باہر نہ آئی تو اس کی سہیلیاں گھبرا کر اندر داخل ہوئیں۔

مریم کی سسکیوں ہچکیوں سے کمرا گونج رہا تھا۔ وہ سجدے میں پڑی تھی اور بھرائی آواز میں اپنے خدا سے کہہ رہی تھی۔

''میرے خدا تُو نے ہمیشہ میری دعا سنی۔ تو جانتا ہے میرے خدا مجھے اپنی ماں سے کتنا پیار ہے۔۔۔ کتنا پیار ہے۔۔

اللہ جی یہ میری آخری دعا ہے اسے ضرور قبول کرنا۔ ضرور قبول کرنا۔

اللہ جی۔۔۔ میری ماں کو اب اس ظالم دنیا سے اٹھا لے۔۔۔ اپنے پاس بلا لے۔۔۔ خدایا میری ماں کو اپنے پاس بلا لے۔۔۔ یہ۔۔۔ میری آخری دعا ہے۔

☆☆☆

آج بھی کتنے ہی گھروں میں مائیں بیٹوں کی لاپروائی اور نفرتوں کی انتہا سے مر رہی ہیں۔ بہو پوچھے نہ پوچھے اس کی اپنی مرضی مگر بیٹے ماؤں کو بھول جائیں تو دوزخ کا عذاب دنیا میں ہی شروع ہو جاتا ہے۔

ہاں اسے آئرن سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ ایک سادہ سا گھریلو حادثہ ہی بہتر ہو گا۔ مگر بے چاری بیٹرس کی طرح' غسل کے دوران گرنے اور ڈوب جانے والا طریقہ اب مناسب نہیں رہے گا۔ اس بار کوئی اور ہی طریقہ ہونا چاہیے۔

حادثہ

اویس احمد

تجسس سے بھرپور دلچسپ کہانی

کارٹر وارلے پراسرار کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ جب وہ چھپ جاتیں تو انہیں اپنے ذہن سے نکال دیا کرتا۔ اس کے دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی اس کی کوئی کہانی پڑھ بھی لیتے تو اس سے تذکرہ نہ کرتے شاید اس معاملے میں وہ اس سے حسد کرتے تھے۔ جہاں تک عام قاری کا تعلق ہے تو وہ تفریح طبع کے لیے اس کی کہانیاں پڑھتے تھے پھر صفحہ پلٹ دیتے اور رسالہ ختم کر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

مگر نومبر کی اس صبح جب تیز بارش نے ومبلڈن کامن میں واقع وارلے کے مکان کی کھڑکیوں پر جلترنگ چھیڑ رکھا تھا تو وارلے اپنی ڈیسک پر بیٹھا' امریکہ سے آنے والے ایک خط کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خط نیویارک میں چھپنے والے ایک رسالے کے توسط سے اس کے پاس آیا تھا۔ مگر لفافے پر نیویارک کی بجائے پیٹانوگا' ٹینیسی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

خط میں لکھا تھا۔ ''آپ کی کہانی بھولنے والا' پڑھ کر حیران رہ گیا۔ آپ نے تو گویا میری ہی کہانی لکھ دی تھی۔'' خط لکھنے والے نے اپنا تعارف ولیم اسٹاک کے نام سے کرایا تھا اور وہ ایک وکیل تھا۔ اتفاق ہے کہ اس کہانی میں وارلے نے اپنے ولن کا نام اسٹاک ہی رکھا تھا اور اس کا پیشہ بھی وکالت دکھایا تھا۔

وارلے نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھایا اور جواب لکھنے لگا۔ اس نے اس اتفاق پر معذرت کرنے کے بعد خط لکھنے پر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر یہ بھی لکھ دیا کہ اگر

کبھی اس امریکی کا لندن آنا ہو تو اس سے ضرور ملے۔

دوپہر تک بارش تھم گئی۔ وارلے باہر نکلا' کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا اور پھر ولیم اسٹاک کے نام اپنا خط پوسٹ کر دیا۔

رات کو جب کھانا کھانے کے بعد وہ کافی پی رہا تھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس نے امریکی کو خط میں ملاقات کی دعوت کیوں دے ڈالی تھی۔ وہ تنہائی پسند شخص تھا۔ اسے تو اپنے دوستوں کا اپنے گھر آنا بالکل پسند نہیں تھا' کجا یہ کہ وہ ایک اجنبی امریکی کو مدعو کر بیٹھا تھا جو محض ایک اتفاق کی بنا پر اس سے شناسائی کا حق جتا رہا تھا۔

کافی ختم کر کے اس نے دو انڈے کھائے اور کافی کی دوسری پیالی حلق سے انڈیل لی۔ پھر اس نے ایک جام میں شراب انڈیلی اور میز پر آ بیٹھا۔ اس نے سوچا کہ وہ تو خوامخواہ ہی پریشان ہو رہا ہے۔ اس نے تو صرف رواروی میں جواب دے دیا تھا اور گھر بلانے کی دعوت تو محض تکلف تھا جسے کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لے سکتا تھا۔ چٹیانوگا لندن سے ہزاروں میل دور تھا۔ بھلا اسے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔

کرسمس آ گیا اور وارلے کو احساس ہوا کہ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنی بیوی کی موت کو نہیں بھلا سکا ہے۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود بیوی کی یاد کانٹے کی طرف اس کے دل میں کھٹکتی رہتی۔ مہینوں وہ خود کو یہ دھوکا دینے کی کامیاب کوشش کرتا رہا کہ اسے کسی کی رفاقت کی ضرورت نہیں لیکن سال کے آخر میں جب وہ کام سے سر اٹھاتا' فرصت اسے میسر آتی تو خوفناک یادوں کا ایک سیلاب سا امنڈ آتا۔ نارنگیوں کی خوشبو۔ کہر آلود راتوں میں سنسان سڑک کی سیر' کھڑکی کے پردوں سے کرسمس کے موقع پر درختوں میں ٹمٹماتی روشنیوں کی جھلملاہٹ۔ پھر کرسمس ہی کے موقع پر لڑکوں کی ٹولی کا گانا گاتے ہوئے اس کے دروازے پر آنا۔ ہر چیز کے ساتھ بے شمار یادیں وابستہ تھیں اور ہر سال یہی سب کچھ ہوتا تھا۔ دل میں کانٹے چبھ جاتے تھے۔

اس برس بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ بچوں کی ٹولی کو تو اس نے پچاس سینٹ دے کر بھگا دیا تھا۔ روشنیاں گل کر کے تاریکی میں اسکاچ کی بوتل لے کر ماضی کی عذابناک یادوں کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ پچیس سال کا تھا اور بیٹرس کے ساتھ گرجا میں پادری کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کرسمس کی رات تھی۔ پادری دعائیں پڑھ کر انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ رہا تھا۔

بیٹرس کے ساتھ ازدواجی زندگی کے ابتدائی چند سال کس قدر حسین تھے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی محبت میں کمی آتی گئی پھر بھی وہ رشتہ نبھاتے رہے مگر اب جبکہ وہ تنہا تھا' وہ صرف خوشگوار دنوں کو ہی یاد کرنا چاہتا تھا۔

کرسمس گزر گیا' سال بدل گیا۔ اب سرد جنوری کا مہینہ تھا۔ پھر بھورا فروری آ گیا۔ یہ دونوں مہینے وارلے کے لیے آرام کے مہینے تھے۔ پھر چمکیلا مارچ آ گیا۔ سورج کی روشنی وارلے میں نئی زندگی دوڑا گئی اور وہ سر جھکا کر کام میں جت گیا۔

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

“ہیلو!” اس نے فون اٹھا کر کہا۔ “وارلے اسپیکنگ۔”

“ہیلو۔ میں بلی اسٹاک بول رہا ہوں۔” دوسری طرف سے آواز آئی جو وارلے کے لیے اجنبی تھی۔ “کیا آپ مسٹر کارٹر وارلے ہیں۔؟”

“ہاں! میں کارٹر وارلے ہی ہوں۔” وہ بولا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

“دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں۔ ہم کل ہی لندن پہنچے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ کے اس پرخلوص دعوت نامے کے جواب میں کم از کم آپ کو ہیلو ہی کہہ لوں۔”

“اچھا آپ ہیں! بڑی خوشی ہوئی۔” اس نے اسٹاک کی ہنسی سنی۔ انداز بڑا بچکانہ تھا۔

“میرے خیال میں آپ نے شاید ہی کبھی اپنی کہانی کے کسی کردار کا فون ریسیور کیا ہو۔” لہجے میں زندہ دلی تھی۔

گفتگو کے دوران میں اسٹاک نے کسی آئرن

کو بھی آواز دی تھی۔ وہ تنہا نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس خیال سے وارلے نے بڑا اطمینان محسوس کیا۔

“مجھے احساس ہے کہ مصنفین کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے میری اور آئرن کی خواہش ہے کہ آپ لندن آ کر ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔”

وارلے مہینوں سے ہائی اسٹریٹ سے آگے نہیں گیا تھا۔ لندن کے معنی تھے واٹرلو تک ٹرین کا سفر اور وہ سفر سے بہت گھبراتا تھا۔

“دراصل' ان دنوں مصروفیت بہت ہے۔ اگلے ہفتے شاید کوئی دن نکال سکوں۔” اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔

“مگر محترم' ہم لندن میں صرف دو دن ہیں۔ ہم نے ایک کار کرائے پر لے رکھی ہے۔ ہمارا ارادہ جنوبی ساحل کی طرف جانے کا ہے۔” اسٹاک نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر وارلے کے منہ سے از خود نکلا۔ “پھر یہاں میرے ہاں آ جاؤ۔ آج ہی رات ڈنر پر۔” بعد میں اسے خود حیرت ہوئی کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔

امریکن نے اس دعوت پر اس قدر مسرت کا اظہار کیا کہ وارلے کا جذبہ میزبانی جوش پر آ گیا۔ اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ “آپ لوگ ہوٹل کو مکمل طور پر خیرآباد کہہ دیں۔” وہ کہہ رہا تھا۔ “میرے ہاں ایک بڑا آرامدہ گیسٹ روم ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔”

اس کے بعد اس کا لکھنے کو دل نہیں چاہا۔ اس نے مسودہ ایک طرف کھسکایا اور سادہ کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھا کر ڈنر کے لیے مینو ٹائپ کرنے لگا۔

چھ بجے تک وہ اپنے مہمانوں کے ڈنر کا اہتمام کر چکا تھا۔ ڈنر بہت معقول تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ وہ آتشدان میں کوئلے ڈال رہا تھا اس کے مہمان آ گئے۔ وارلے ایک لمحے تک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ ٹائی کی گرہ درست کر کے اس نے اپنے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کئی برس بعد پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی دوڑی تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی۔

ولیم اسٹاک اور آئرن اس کی توقع کے مطابق بڑے دلکش ثابت ہوئے۔ اس کے دل میں جو تھوڑا بہت خوف رہ گیا تھا' وہ بھی ہوا ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کا لباس بچکانہ نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر امریکنوں کا لباس ہوتا ہے۔ اسٹاک کسی قدر دراز قد اور بھاری جسم کا تھا۔ چہرہ بڑا جاذب نظر تھا۔ وہ وارلے سے دس سال چھوٹا نظر آتا تھا۔

آئرن اسٹاک تیس سال سے زیادہ کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے انداز گفتگو اور میک اپ کی بنا پر وہ کسی فلم کی اداکارہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے نقوش بڑے تیکھے اور دلاویز تھے۔ گھنے سنہرے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سبز آنکھوں میں بڑی گہرائی اور دلکشی تھی۔

آتشدان کے قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ کر جب شراب کا دور شروع ہوا تو باہر بارش شروع ہو گئی۔

“انگلینڈ کی سیر کی خواہش بڑی دیرینہ تھی مگر میں اب تک اسے ٹالتا رہا۔” اسٹاک کہہ رہا تھا۔ “مگر آپ کا پرخلوص دعوت نامہ پا کر پہلے ہی موقع پر چلا آیا۔”

“آپ کا گیسٹ روم بہت خوب صورت ہے۔” آئرن بولی۔ پھر اس نے اپنی سبز آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ “مجھے آپ کا یہ مکان بے حد پسند آیا۔” اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

ڈنر ٹیبل چھوٹی تھی۔ اس لیے وہ تینوں بہت قریب قریب دائرے میں بیٹھے تھے۔ اسٹاک کے بھاری کندھے آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران میں وارلے جب بھی آئرن کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک دوڑ جاتی۔ اس انداز میں ایک پیغام تھا۔

وارلے کو ان دونوں کے بے تکلفانہ انداز پر حیرت تھی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی اس کے باوجود وہ دونوں انتہائی بے تکلفی اور اطمینان سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر کافی کی میز پر ایک ممکنہ جواز اس کی سمجھ میں آ گیا۔ شراب کی ایک بڑی بوتل ان کے حلق سے اتر چکی تھی۔ اتنی شراب پینے کے بعد تو اجنبیت کے تمام

پردے اٹھ جاتے ہیں۔ خود اس نے کئی برس بعد اتنے خوشگوار ماحول میں شراب پی تھی اور خوب پی تھی۔

"میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا ہے۔" وہ گردن اٹھا کر بولا۔ "تم ہنسو گے۔"

"کیا خیال آیا ہے۔" اسٹاک نے پوچھا۔

"یہی کہ شاید تم ولیم اسٹاک نہ ہو بلکہ محض مہم جو ہو۔ یہ کہ شاید تم استاد قسم کے لوگوں میں سے ہو اور محض اس لیے مجھے خط لکھا ہو کہ یہاں آ کر میرا اعتماد حاصل کر لو۔" وارلے اس وقت درویشانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا "مگر کہنا پڑتا ہے کہ تم اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہو۔"

نہ جانے یہ فریب نظر تھا یا حقیقت۔ بہر حال اسے ایسا لگا تھا کہ اسٹاک نے بڑے معنی خیز انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تھا پھر اسٹاک نے گویا اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "مگر میرے لیٹر پیڈ پر میرا نام چھپا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس پر میرے نام ولیم اسٹاک کے ساتھ اٹارنی ایٹ لا آف پیٹانا گو،ٹینیسی لکھا ہوا ہے۔"

"جعلی لیٹر پیڈ چھپوانا تو دنیا کا آسان ترین کام ہے۔" وارلے نے کہا تھا اور پھر یہ بھی سوچا تھا کہ آخر وہ اس خیال پر اتنا زور کیوں دے رہا ہے۔ کہیں اس کے مہمان برا نہ منائیں۔

مگر اسٹاک ہنس پڑا اس نے کہا۔ "مصنف کا ذہن کام کر رہا ہے میرے خیال میں آپ کو ہر بات میں کوئی نہ کوئی چکر نظر آتا ہے مگر آپ ہی بتایئے آخر ہمیں ایسا کرنے کی کیا غرض پڑی ہے۔ کیا مقصد ہو سکتا ہے ہمارا۔؟"

وارلے تڑ سے بولا۔ "مالی فائدہ اور کیا۔ یہاں آ کر تم مجھ سے دوستی بڑھاتے اور پتا لگا لیتے کہ میں اپنی دولت کہاں رکھتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی طرح مجھ سے کوئی رقم نکلوا لو یا چیک ہی حاصل کر لو اور غائب ہو جاؤ۔ پولیس اس جعلی نام کے فرد کو کہاں تلاش کرتی پھرے گی۔"

پھر سب چپ ہو گئے تھے۔ یہ خاموشی وارلے کے جسم میں چھری کی طرح اترتی جا رہی تھی۔

چند لمحوں کے لیے اسے اپنے سینے میں گھٹن سی محسوس ہوئی پھر وہ بتدریج اعتدال پر آ گیا۔ اس نے اسٹاک کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اس کا انداز دھمکی آمیز تھا مگر وہ تو بیٹھا شراب کے جام سے کھیل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ یوں جڑے ہوئے تھے جیسے وہ چسکی کا لطف لے رہا ہو۔

آتشدان کے پاس بیٹھے وہ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں میاں بیوی نیو آرلینز، اٹلانٹا اور کیلیفورنیا تک اپنے موٹر ٹرپ کے بارے میں کہانیاں سناتے رہے۔ یہ فاصلے وارلے کے لیے ایسے ہی تھے جسے دو سیاروں کے درمیان کا فاصلہ کیونکہ وہ خود پچاس میل دور برٹین سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔

مہمانوں کی موجودگی نے وارلے پر نشہ آور دوا کا سا اثر کیا۔ اس نے بھی خلاف عادت اپنی زندگی کے سارے ہی گوشے ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ مگر شاید یہ تو اس قانون دان کے عقلمندانہ سوالات کا اثر تھا جس کا اسے بعد میں احساس ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ خود کو اس دنیا میں قطعی تنہا سمجھ رہا تھا جس نے پہلی بار ہمدرد سامع پائے تھے۔ نہ اس کے کوئی بچہ تھا نہ کوئی عزیز رشتہ دار۔ وہ ایسا شخص تھا جس کی موت پر بھی کوئی رونے والا نہ تھا۔

"آپ کی بیوی کیسے......" آئرن کہتے کہتے رک گئی۔ اسٹاک نے گلا صاف کیا۔

"نہیں کوئی بات نہیں!" وارلے اس کا اشارہ سمجھ کر بولا۔ "حادثے میں مر گئی تھی۔ نہاتے میں اس کا سر ٹکرایا تھا اور وہ ڈوب گئی تھی۔"

گھنٹوں بعد اپنی تاریک خوابگاہ میں لیٹے ہوئے وارلے نے سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلیپر پہنے۔ گاؤن باندھا اور دبے قدموں چلتا نیچے آ گیا۔ اس نے مہمانوں کی سہولت کے لیے باتھ روم کی بتی کھلی چھوڑ دی تھی۔ اس کی روشنی زینے کی پانچ سیڑھیوں تک پڑ رہی تھی۔ مکان پر سناٹے کا راج تھا مگر فضا میں ایک خوشبو سی رچی ہوئی تھی۔ کسی عورت کی

خوشبو۔ اتنی رات گئے اپنے مکان میں کسی عورت کے وجود کو محسوس کیے اسے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔

سیڑھیاں اتر کر وہ سرد کاریڈور میں آ گیا۔ ہال کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ہال سے گزر کر باغ کی طرف جانے والے راستے پر آ گیا۔ آئرن اسٹاک ایک روش پر کھڑی تھی۔ اس نے بڑا لمبا فرغل پہن رکھا تھا۔ اس کے طویل سنہرے بال کھلے ہوئے لہرا رہے تھے۔ وہ آئرن کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر رک گیا۔ ایک لمحے تک دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔

"مجھے افسوس ہے۔" آئرن ہی نے پہل کی۔ "مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔"

آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ اینٹوں کی دیوار پر چڑھی ہوئی انگور کی بیل بے جان سی لگ رہی تھی۔ وارلے کے نتھنوں میں زمین کی نمی اور درختوں کی باس گھل گئی۔ وہ جیسے فضا کے اس سحر میں کھو سا گیا۔ اچانک آئرن نے پرانے دوستوں کے انداز میں اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگے جھکی اور وارلے کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ وارلے کو یوں لگا جیسے اس کے ہونٹ گلاب کی شگفتہ پھول سے مس ہو گئے ہوں۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بڑی مشکل سے بول سکا۔ آئرن نے مڑ کر مکان کی چھت پر بنی ہوئی چمنی کے اوپر معلق چاند پر نظر گاڑ دی۔ "مجھے یہ مکان بہت پسند ہے۔" اس نے جیسے خواب میں کہا اور پھر عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔

ناشتے کے بعد وارلے اسٹاک کے ساتھ تھا۔ آئرن ضد کر کے بازار جا چکی تھی اور کہہ گئی تھی کہ دوپہر کے لیے کھانا بھی خود ہی لائے گی۔ اسٹاک کافی کے تیسرے کپ سے شغل کر رہا تھا۔ "میرے خیال میں آئرن نے پچھلی رات پاگل پن کا ثبوت دیا تھا۔" وہ بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی وارلے خجل سا ہو رہا تھا۔ "کوئی بات نہیں بہت سے لوگوں کو اجنبی جگہ نیند نہیں آتی۔" وہ مدھم لہجے میں بولا۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ماضی کے بارے میں تمہیں کچھ پتا چلتا۔" اسٹاک بولا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمیں تمہارے مکان میں رات گزارنی پڑے گی۔" پھر وہ اسے بتانے لگا کہ یہ ان کا تفریحی دورہ نہیں تھا۔ وہ ایک خطرے کے پیش نظر ہی سفر پر نکلے تھے۔ آئرن کئی سالوں سے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز سے چیزیں چرانے کی عادی تھی۔ وہ کئی مرتبہ پولیس کے ہاتھ لگ چکی تھی مگر اب وہ مقام آ گیا تھا جہاں اسٹاک کی قانونی حیثیت بھی ناکام نظر آ رہی تھی۔ پولیس اب آئرن کو اسٹاک کے اثر و رسوخ کے باوجود جیل بھیجنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

"کلپٹو میڈیا۔" وارلے بولا۔ "اسے کسی ماہر نفسیات کو کیوں نہیں دکھایا۔"

"کوشش کی تھی۔ مگر کچھ لوگ اچھے معمول نہیں ہوتے۔ آئرن انہی میں سے ایک ہے۔" وہ بڑی تلخی سے مسکرایا۔ "کچھ نہیں بن سکا تو میں نے تبدیلی کا سوچا۔ کسی قصبے میں یا دیہات میں منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا جہاں اسے چوری کے کم سے کم مواقع حاصل ہوں۔"

"مگر تمہاری پریکٹس کا کیا ہوگا۔؟"

"خوش قسمتی سے میں ایک بڑا کامیاب وکیل رہا ہوں۔ اس لیے دولت کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

اسی وقت آئرن بازار سے واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اشیا سے بھری ہوئی باسکٹ تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ آئرن اس معنی خیز خاموشی کو بھانپ گئی اور اس نے کہا۔

"میرے شوہر باتیں کر رہے تھے۔ ہے نا۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ "بلی کے ساتھ یہی ایک پرابلم ہے۔ حضرت کو یہی معلوم نہیں کہ کب زبان بند رکھنی چاہیے اور کب کھولنی چاہیے۔" پھر اس نے میز کے پاس جا کر باسکٹ سے چیزیں نکال کر میز پر رکھنی شروع کر دیں۔

اسٹاک ہی کا مشورہ تھا کہ وہ ان کی کرائے کی سیڈان میں ان کے ساتھ جنوبی ساحل چلے۔ موسم بڑا

خوشگوار تھا۔ مارچ کا سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اسٹاک نے کہا۔ ”ہم راستے میں ایسے گاؤں بھی دیکھتے چلیں گے جہاں ہم رہائش اختیار کر سکیں۔“ اس کے بعد انہوں نے گاڑی برائٹن روڈ پر ڈال دی۔ اس سے گزر کر سسکس سے ہوتے ہوئے مشرق کی طرف نکل گئے۔ ہیسٹنگ کے قریب ساحل پر انہوں نے گاڑی روک دی اور باہر نکل آئے۔ آدھ میل ساحل پر ٹہل کر وہ پھر کار میں آ بیٹھے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے گزرتے ہوئے ڈوور تک آ گئے۔“

”مجھے تو اب تک کوئی بھی جگہ رہائش کے لیے پسند نہیں آئی۔“ اسٹاک بولا۔ ”بہت ہی میٹروپولیٹن قسم کے مقامات ہیں۔“

”لینڈ گیٹ چھوٹی اور بڑی اچھی جگہ ہے۔“ وارلے نے مشورہ دیا۔

”کیوں نہ کسی میدان میں ڈیرہ ڈال لیا جائے۔“ آئرن کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ”یا اگر کہو تو کسی جنگل میں جھونپڑی بنا لیں۔“

وارلے کو اس وقت احساس ہوا کہ اسٹاک واقعی بے حد سنجیدہ ہے جب وہ ایک اسٹیٹ آفس کے سامنے یہ معلوم کرنے جا کھڑا ہوا کہ آیا اس علاقے میں فروخت کے لیے کوئی مکان موجود ہے یا نہیں۔ آئرن نے دفتر کے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وارلے اس کے ساتھ کار میں ہی بیٹھا رہا۔ چند لمحے کار میں خاموشی رہی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا آئرن کی گردن، شانے اور سنہرے بالوں کو دیکھتا رہا۔ کار میں خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”تو اس نے تمہیں پوری طرح اعتماد میں لے لیا۔“ اچانک آئرن پلٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

”کیا مطلب۔“ وہ سٹپٹا گیا۔

”تمہیں اس کی باتوں پر یقین آ گیا ہے نا۔؟“

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا!“ وارلے بولا اور آئرن نے آنکھیں بند کر لیں۔

”رات تو تم تصورات کی دنیا میں تھے۔“ وہ بولی ”مگر اب تو جاگ رہے ہو۔“ اس نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے وارلے کو دیکھنے لگی۔

”یہ کیا تم نہیں دیکھ رہے۔“ وہ بولی۔ ”مصنف کی حیثیت سے تمہارا وجدان بالکل درست تھا۔ وہ ولیم اسٹاک نہیں ہے۔ میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔ ہم دونوں میں ایک معاہدہ ہوا ہے کہ تم سے بہت بڑی رقم ہتھیا کر آپس میں بانٹ لیں گے۔“

”مگر پچھلی رات تو میں مذاق کر رہا تھا۔“ وارلے نے کہا پھر بھی وہ مشکوک سا تھا۔ کیا اس نے واقعی وہ بات مذاق میں کہی تھی۔ پھر اسے خطرے کی گھنٹی یاد آ گئی جو اس نے اپنے ذہن میں بجتی سنی تھی۔

”مذاق میں کہا تھا یا سنجیدگی سے بہر حال تمہارے منہ سے اس وقت سچی بات نکلی تھی۔ اس کا اصلی نام ٹیڈ ہے، اسی نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا ذہن ایسے معاملے میں بہت تیز تھا۔ تم اسے بالکل ٹھیک سمجھے تھے۔ یہاں تک کہ تمہارا جعلی لیٹر پیڈ والا خیال بھی صحیح تھا۔“

وارلے نے اپنی آنکھوں میں کھٹک سی محسوس کی۔ یہ شاید غصے یا اعتماد کی شکست کا اثر تھا۔ ”تو پھر جب ٹیڈ واپس آئے گا تو میں اس سے ضرور بات کروں گا۔“ وہ بولا۔ ”مگر وہ مکان کی تلاش میں سرگرداں کیوں ہے۔ کیا یہ بھی محض فراڈ ہے۔؟“

”سو فیصدی فریب۔ محض تمہیں یقین دلانے اور تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی ایک چال ہے۔“

”اور یہ تمہارے کلپٹومیا والی کہانی۔ کیا یہ بھی غلط ہے۔“

”ہاں یہ سب تمہیں چکر دینے والی باتیں ہیں۔ محض تمہاری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کر کے وارلے کا ہاتھ تھام لیا اور گرمجوشی سے دبا دیا۔ ”ہوشیار رہنا اسے یہ پتا نہ چلے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسے روحانیت میں بھی دخل ہے۔ تم واقعی خطرے میں پڑ جاؤ گے۔ بس دیکھتے رہو، آنکھیں کھلی رکھو اور زبان سے کچھ نہ کہو۔“

”تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔“

”دلچسپی کی بات نہیں۔ میرے خیال میں تم ایک اچھے آدمی ہو۔“ اس نے وارلے کا ہاتھ دبایا۔ ”اپنی حفاظت کرنا۔ کل تک میں اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”وہ آدمی جس نے اپنا نام ولیم اسٹاک بتایا تھا، اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر سے نکلا تو اس کے ہاتھوں میں ایسے مکانوں کی فہرست تھی جو اس علاقے میں برائے فروخت موجود تھے۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ مکانوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی جس کے سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ”یہ منظر نظر آئے۔“ اس نے آئرن سے سوال کیا۔

آئرن جواب دیے بغیر کار سے اتری اور اترتی ہوئی پہاڑی کے کنارے پہنچ گئی۔ دونوں ہاتھ پشت پر جما کر وہ منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔

”آگے مت جانا۔“ اسٹاک نے تنبیہہ کی۔ ”بڑی اچھی جگہ ہے مگر دو قدم آگے بڑھے اور موت کے منہ میں پہنچے۔“ وہ سب کنارے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ سمندری ہوا اور سورج کی شعاعیں ان کے چہروں کو چوم رہی تھیں پھر آئرن کی نظر بائی وے کے قریب ہی کھڑی ایک کافی ویگن پر پڑی۔ وہاں ایک رہائشی زیر تعمیر عمارت کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ آس پاس کئی ہٹیں بنی ہوئی تھیں۔

”اس وقت ہمیں یقیناً گرما گرم کافی کی ضرورت ہے۔“ آئرن نے کہا۔

اسٹاک یہ سن کر پلٹا تھا مگر وارلے نے اسے نہیں جانے دیا۔ بعد میں وہ خود ہی کافی کے تین کپ لانے کے لیے نیچے اترنے لگا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ وہ اس خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے۔ سیدھی بات تو یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں پولیس سے مدد لیتا۔ اگر یہ جعلی اسٹاک اتنا ہی خطرناک آدمی تھا جتنا کہ آئرن نے بتایا تھا تو اسے سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے تھا۔ مگر پولیس کو وہ کیا بتا سکتا تھا۔ ابھی انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ انہیں گرفتار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن اگر امریکن کو یہ شک بھی ہو جاتا کہ وارلے اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہے تو نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے۔

گتے کی ٹرے پر کافی کے بھرے تین کپ رکھے واپس آتے وقت اس نے یہی فیصلہ کیا کہ کل تک کسی نہ کسی طرح دوستانہ رویہ اختیار کیے رہے اور پھر انہیں بڑے خلوص سے رخصت کر دے۔ ان کے جانے کے بعد وہ پولیس کو ان کے تعاقب میں لگا سکتا تھا۔

پہاڑی پگڈنڈی پر چڑھتے وقت وہ ایک ٹیلے کے عقب میں آ گیا۔ جہاں سے ذرا دیر کے لیے چوٹی پر کھڑے دونوں مہمان نظروں سے غائب ہو گئے۔ اچانک اس نے آئرن کی چیخ سنی وہ تیزی سے ٹیلے کی اوٹ سے نکل آیا۔ اوپر آئرن اور اسٹاک آپس میں گتھے ہوئے تھے۔ وہ کنارے کے بہت قریب تھے۔ اسٹاک، آئرن کا ہاتھ پکڑے گھسیٹ رہا تھا۔ وہ اسٹاک سے بری طرح الجھی ہوئی تھی اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے لاتیں بھی چلا رہی تھی۔ کسی جنگجو عورت کی طرح لڑ رہی تھی پھر اس نے اسٹاک سے اپنے ایک ہاتھ چھڑا لیا اور پوری قوت سے اس کے سر پر ہاتھ مارا ایک ہاتھ میں اس نے ایک بڑا پتھر پکڑ رکھا تھا۔ اسٹاک کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس کے گھٹنے زمین سے ٹکے اور وہ گھاس پر لڑھک گیا۔ وارلے دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔

”کیا تم نے اسے بتا دیا تھا۔؟“

”نہیں اسے شک ہو گیا تھا پھر وہ مجھے مارنے لگا۔“ آئرن نے اپنے بازو پر سرخ نشانات دکھائے۔ ”اور آخر مجھے اسے سب کچھ بتانا ہی پڑا۔“

وارلے اسٹاک کے زخمی سر کو دیکھنے کے لیے اس پر جھک گیا۔ وہ کراہ رہا تھا اور کسی قدر بیہوشی کے عالم میں تھا۔ ”تم نے تو اسے مار ہی دیا ہوتا۔“

”مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔“ وہ بولی۔ ”اس نے کہا تھا کہ جیسے ہی تم کافی لے کر آؤ گے وہ تمہیں نیچے سمندر میں پھینک دے گا۔“ وارلے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آئرن اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ پاگل ہے۔“

اسٹاک نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ ”اب ہم کیا کریں گے۔“ وارلے نے سرگوشی میں آئرن سے کہا۔

”ہمیں اسے ختم کر دینا چاہیے۔“ وہ غیر جذباتی لہجے میں بولی۔

”نہیں ایسا مت سوچو۔“

”جب وہ ہوش میں آئے گا تو غصے سے پاگل ہو جائے گا پھر ہم اسے قابو نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہم بھاگ بھی گئے تو وہ گھر آ جائے گا۔ اگر تم نے پولیس کو خبر کر دی تو وہ چھپ جائے گا اور یوں تم مستقل خطرے میں رہو گے۔ یقین کرو میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“ وارلے نے پوچھا۔

”اسے یہاں سے نیچے لڑھکا دو فوراً۔ ہم کہہ دیں گے کہ اس کا پیر پھسل گیا تھا اور سر کا زخم نیچے گرنے کی وجہ سمجھا جا سکتا ہے۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وارلے فیصلہ کن انداز میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

آئرن نے جھک کر اسٹاک کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹنے لگی۔ وہ حیرت انگیز حد تک طاقت ور عورت تھی۔ ”میری بات اچھی طرح سن لو۔“ وہ غرائی۔ ”یہ اسی قابل ہے کہ مر جائے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ اسے مار کر تم صرف انصاف کا تقاضا پورا کرو گے۔“

اسٹاک کا خون آلود سر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں، منہ کھلا ہوا تھا۔ بڑا خوف ناک منظر تھا۔ اچانک وارلے کا جی چاہا کہ یہ سب کچھ ختم ہو جائے۔ اس نے جھک کر دوسرا بازو پکڑا اور دونوں نے اسٹاک کے جسم کو اٹھا کر کنارے تک پہنچا دیا۔ پھر انہوں نے اس کے جسم کو عمودی چٹان سے لڑھکا دیا۔ اگلے لمحے اسٹاک سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا گرا تھا۔

پھر پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ گھاس پر خون کے دھبے مٹا دیے اور دوسرا کام یہی تھا کہ وہ کار میں بیٹھ کر نزدیک ترین پولیس اسٹیشن گئے اور حادثے کی رپورٹ درج کرا دی۔ سورج غروب ہونے تک ولیم اسٹاک کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ لاش پولیس اٹھا لے گئی۔ کارٹر وارلے آئرن کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

آئرن نے ریڈیو آن کر دیا۔ ریڈیو پر کمرشیل میوزک کا پروگرام آ رہا تھا مگر یہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وارلے نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔

”کیا بات ہے۔“ آئرن تیزی سے بولا۔

”خاموش رہو۔“ وارلے بولا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ سب کچھ گڑبڑ تھا۔ اسٹاک کے تمام کاغذات درست تھے۔ شناختی کارڈ کے اندراجات کے اعتبار سے وہ واقعی چھیانوے کا ولیم اسٹاک تھا۔ وہ بولا۔ ”ڈرائیونگ لائسنس، سوشل سیکورٹی کارڈ اور دیگر کاغذات، سب کے مطابق وہ اسٹاک ہی تھا۔ اگر وہ اصلی اسٹاک نہیں تھا اور یہ محض ایک فریب تھا تو پھر اس نے اتنی دردسری کیوں مول لی تھی۔“

”یہ کوئی معمہ نہیں وارلے۔ یہ تمام دردسری اس نے اسی لیے مول لی تھی کہ وہ واقعی ولیم اسٹاک تھا۔ اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا سچ تھا۔ جھوٹ تو میں نے تم سے بولا تھا۔“ اس کا لہجہ بڑا زہریلا تھا۔

کارٹر وارلے کے تخلیقی ذہن نے اسے حیرت پر قابو پانے میں بڑی مدد دی۔ اس نے گزشتہ رات ڈنر ٹیبل پر خطرہ بڑھتا محسوس کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسٹاک ایک دم سے کیوں کھو گیا تھا۔ خطرے کی گھنٹی ان کی طرف سے بجی تھی۔ جسے وارلے اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا۔“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس نے میری زندگی جہنم بنا دی تھی۔ وہ مجھے مسلسل ماہرین نفسیات کے پاس معائنے کے لیے لے کر جاتا تھا اور اب اس نے مجھے کسی دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں دفن کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زندگی کی رعنائیوں اور گہما گہمی سے دور۔“ وہ زبان ہونٹوں پر پھیرتی ہوئی بولی۔ ”یہ کوئی انسان بات نہیں کہ مہذب آدمی کو اس طرح ہلاک کر دیا جائے۔“

”گویا تم نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔“

”ہم دونوں نے قتل کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اسے مت بھولو۔ میں حکام کو ایسی کہانی سنا سکتی ہوں جو ہم دونوں ہی کو ایک لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دے گی۔ مگر میرے خیال میں اس کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم عقلمند آدمی ہو۔“

وارلے غصے میں کھول کر رہ گیا۔ اسے اس عورت سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ وارلے تو اب یہ بھی بھول چکا تھا کہ عورت کے ساتھ بستر میں لیٹنے کا لطف کیا ہوتا ہے۔ مگر قتل کا وہ واقعہ اس کے جسم کو برف کی سل بنا چکا تھا۔ اس خطرناک عورت نے جس طرح اپنے شوہر کو ٹھکانے لگایا تھا وہ منظر اس کی نگاہ کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے آئرن کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ بہرحال وہ بڑی حسین عورت تھی اور ایک اچھی رفیق ثابت ہو سکتی تھی۔ بستر کی رفیق۔

لیکن دو دن بعد ہی جب ایک اسٹور کا منیجر ایک بل لے کر اس کے پاس آیا تو وارلے سوچ میں پڑ گیا۔

”آپ کو زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔“ منیجر بولا۔ ”مسٹر وارلے وہ امریکی خاتون جو میرے خیال میں آپ کے ہاں مقیم ہے کچھ زائد چیزیں لے آئی تھی، جن کے پیسے دینا شاید وہ بھول گئی تھی۔ بہت تھوڑی سی رقم ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔“

وارلے نے بقیہ رقم ادا کی اور سوچنے لگا۔ اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ پھر وہ اپنی اس ڈیسک پر بیٹھ گیا جس پر وہ کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی سے باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ذہن سوچ کے سمندر میں غرق تھا۔ خوب صورت موسم ختم ہو گیا تھا۔ جسم کو چھید ڈالنے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔

ہاں اسے آئرن سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ ایک سادہ سا گھریلو حادثہ ہی بہتر ہو گا۔ مگر بیچاری بیٹرس کی طرح، غسل کے دوران میں گرنے اور ڈوب جانے والا طریقہ اب مناسب نہیں رہے گا۔ اس بار کوئی اور ہی طریقہ ہونا چاہیے۔ ان چکراتی سیڑھیوں سے گر کر گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ اگر کوئی ان کاموں کا عادی نہ ہو تو یہ سیڑھیاں، اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور آئرن بغیر دستک دیے اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ وارلے کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔

”تم یہاں تنہا بیٹھے کیا کر رہے ہو۔“ آئرن نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان اور آسودگی تھی۔

کارٹر وارلے نے قلم اٹھایا اور اپنے سامنے پڑے مسودے پر دو چار الفاظ لکھے۔ ”اوہ! میں نیا پلاٹ بنا رہا تھا۔“ وہ بولا۔

آئرن وہسکی کا یہ دوسرا گلاس پی رہی تھی۔ شاید اسی لیے وہ وارلے کے لہجے میں پوشیدہ خطرے کی گھنٹی کی آواز نہ سن سکی۔

توتا کہانی

ڈاکٹر سلیم اختر

ہم اپنے آپ سے ...... اپنی ذات اور اردگرد کی بہت سی چیزوں سے فرار چاہتے ہیں ...... اپنے متعلق بہت سی خوش فہمیوں میں بھی مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہم اس طرح اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے؟ ایک حسینہ کا قصہ' وہ آئینے سے مطمئن نہ تھی ...... اس کو مطمئن کرنے کے لیے ایک پرندے نے اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا ......!

ادب سے انتخاب ...... ایک فکریہ تحریر

بیگم جمال بڑی دیر سے آئینہ کے مقابل تھی۔

جب آئینہ نے پرم کئے ہوئے بالوں، گرین آئی شیڈ، ٹویزر سے تراشیدہ بھنوؤں، امپورٹڈ آئی لیشز، بلش آن والے گال پر مصنوعی تل اور جسم کے ساتھ لپٹے ہوئے پیرٹ سوٹ کے ساتھ میچ کرتی لپ اسٹک کے بارے میں پہلے اظہار خیال اور پھر اظہار اطمینان کر دیا تب کہیں بیگم جمال نے اطمینان کی طویل سانس لی، یوں کہ شرٹ اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی گئی۔ تب آئینہ نے آنکھ ماری۔

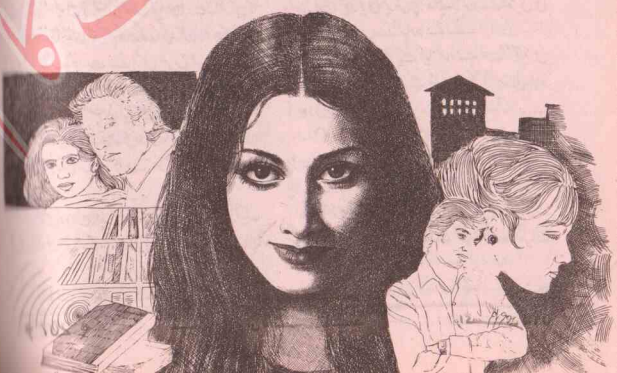

''یوڈرٹی!'' وہ اٹھلا کر بولی۔

آئینہ بھی جواب میں خوشی سے کھل اٹھا۔ ''وسیم اکرم؟''

بیگم جمال نے قہقہہ لگایا۔

''اے جان قیس ...... تیرے ارادے کدھر کے ہیں۔'' آئینہ نے پوچھا۔

''پھر شعر وشاعری شروع کر دی۔'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

''کیوں ...... شعر وشاعری میں کیا خرابی ہے؟''

''یو نو! میں ایک پریکٹیکل عورت ہوں اور شاعری کی باتوں میں کیا رکھا ہے بھلا؟''

''آئی نو! آئی نو!''

''شٹ اپ! یو ڈونٹ نو ون تھنگ فرام دی اور ...''

''بٹ ...... آئی سی ...... دی سینگ آئی۔''

''اونہہ! سینگ آئی۔ مائی فٹ''

''اچھا ڈیئر، برا نہ مناؤ یہ بتاؤ کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں بھی نہیں۔''

''تو پھر یہ چلتا پھرتا اسلحہ خانہ کیوں؟''

''میں بہت بور ہو رہی ہوں۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں بس ...... کچھ عجیب سی حالت ہے ان دنوں میری۔''

''سہیلیوں سے گپ شپ کر لی ہوتی۔''

''او نو! اسٹوپڈ بچز، سب کی سب اسکینڈلز مونگر۔ اور یو نو، مجھے فضول کے اسکینڈلز سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''تو؟''

''سوچتی ہوں کہیں گھوم آؤں ...... کچھ شاپنگ ہی کر لوں۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا ...... ویسے بھی کوکنگ آئل اور واشنگ پوڈر ختم ہو چکے ہیں۔''

اس نے برا مان کر آئینہ کو گھورا۔

''پھر بے تکی ہانکنے لگے۔''

''اچھا بے تکی نہیں ہانکتا، چلو تک کی ......''

''یو ایڈیٹ مرر! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''کیوں نہیں سمجھ سکتا۔'' اس مرتبہ آئینہ نے برا منایا۔ ''میں تمہارا رازدار بھی ہوں اور چاہنے والا بھی ......''

''ویٹ آئی نو!''

''تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں تمہاری اولین محبت ہوں' سوچو آج سے ......''

وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔

''مجھے یاد ہے' اب اس بہانے میری عمر کا حساب لگانا نہ شروع کر دینا۔''

''نہیں'' وہ ہنسا۔ ''میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا ...... سنو!''

''ہوں۔''

''کبھی کبھی میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی چھو منتر سے میں مرد بن جاؤں۔''

وہ اسے مخمور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''اچھا؟''

''محض مرد نہیں ...... بلکہ صرف تمہارا مرد بن جاؤں۔''

''پھر؟'' وہ اب شرما رہی تھی۔

''پھر؟'' وہ جیسے سوچتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں شائد تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ میں ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔''

وہ نیم وا آنکھوں سے آئینہ دیکھے جا رہی تھی، وہ پھر بولا۔ ''ویسے ایک بات تو تمہاری درست ہے۔''

''کیا؟''

''یہ شعر وشاعری واقعی فضول شے ہے۔''

''اچھا؟ اچانک انکشاف کیسے؟''

''اب دیکھو نا ...... میرے جذبات کیا ہیں جب کہ شاعر یوں کہتا ہے۔

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھا

آئینہ کو پس کا ہے پریشاں نظری کا

"واہ کیا شعر ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ پھر چپ ہو کر دیکھتی رہی اور اب جو بولی تو آواز مہین، ملائم ریشمی رومال میں تبدیل ہو چکی تھی۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"سچ بتاؤ گے ناں؟"

"تم جانتی ہو، میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"کیا میں واقعی خوب صورت ہوں؟"

"یقیناً......"

"سب سے زیادہ خوب صورت؟"

اور جواب میں آئینہ کرچی کرچی ہو گیا، وہ ہنسی۔

"اچھا! اب یہ ایکٹنگ بند کرو۔ اب میں چلتی ہوں۔" پھر گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ "بائی۔"

"او کے سی یو۔" لہجہ بچھڑنے والے عاشق جیسا تھا۔

وہ میچنگ پرس ہلاتی کمرہ سے باہر تو نکل آئی لیکن وسیع کوٹھی کے عریض لان میں گومگو کے عالم میں کھڑی سوچتی رہی کہ جائے کہاں؟ کیا کرے؟ گاڑی نکال لے؟ اعصابی تناؤ کے باعث خود کو کسی گمان میں محسوس کر رہی تھی۔ لہٰذا گاڑی چلانے میں خطرہ تھا، یوں بھی شہد کی بھنبھناتی مکھیوں کا چھتا بنا ہوا تھا اور کبھی کبھی یوں بلاوجہ جسم میں جیسے لرزش سی دوڑ جاتی! تو اب؟

بیگم جمال کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا، سوائے جمال صاحب کے جو اس سے بالعموم دور ایک دوسرے ملک کاروبار کرتے، کاروبار کیا، سونے کی کان تھا، لہٰذا بیگم جمال کی خوش قسمتی کی طویل فہرست کا آغاز تا بعد ار امیر جمال صاحب سے ہوتا تھا۔ سال دو سال بعد آتا تو محبت تحائف سے لدا پھندا، البتہ چیک باقاعدگی سے آتے، لہٰذا خوش قسمتی کی بقیہ فہرست ان چیکوں کا ضمیمہ تھی۔ ہاں ایک بات تھی کہ خوش قسمتی کی اس فہرست میں بچوں کے نام نہ دیکھے جا سکتے تھے، لہٰذا کئی امور کے لحاظ سے وہ فارغ تھی، اتنی فارغ کہ اب یہ فراغت وبال بن رہی تھی۔ چنانچہ ایسی امیر فارغ عورتوں کی سرپرستی اور صدارتوں کی متلاشی سوشل ورکر قسم کی بیگمات نے اسے بھی دریافت کر لیا اور یوں برج پارٹیوں، چیریٹی شوز اور چیرل فنکشنز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر بیگم جمال طبعاً سوشل اینمل نہ تھی، اس لئے اسے چندہ میں بھی بھاری رقوم کے چیک دے کر دکھی انسانیت کی خدمت میں کوئی خاص مزا نہ ملتا، لہٰذا ان سب سے بے زار ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک مطالعے سے خود کو بہلایا اور ہیرلڈ روبنز سے لے کر جیکی کولینز تک تمام بیسٹ سیلرز پڑھ ڈالے، ویڈیو دیکھے کیسٹس سنیں، طرح طرح کے کھلونے تلاش کیے۔ مگر بے کلی اور اس سے جنم لینے والی بدمزگی برقرار رہی، کبھی کبھی تو بوریت جیسے ایک دورہ کی شکل اختیار کر لیتی، تب وہ بے تحاشا شاپنگ کرتی، ایسی افراتفری شاپنگ کہ بیشتر ایسی چیزیں خرید لی جاتیں جن کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن یوں بے معنی خرچ سے کسی خاص قسم کا سکون ملتا اور یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا، ہر چند کہ عمر اس کی بھی طویل نہ ہوتی۔

آج بھی بے کلی سے وہ جلے پاؤں کی بلی بن رہی تھی۔ آئینہ نے کچھ بوریت کم کر دی تھی۔ ویسے آئینہ کی ایک بات تو درست تھی، اب وہی اس کا دوست رہ گیا تھا اور اس سے کلام میں خوش تھا۔ کم بخت کیا مزے مزے کی باتیں کرتا ہے۔ گویا سچ مچ کا مرد ہو۔ باتیں کم اور گدگدی زیادہ!

وہ پرس جھلاتی، فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی، کبھی کبھی کوئی راہ گیر اسے دیکھ کر ٹھٹھک سا جاتا تو اطمینان بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیل جاتی کہ اسے دیکھ کر یوں ٹھٹکنا آنکھ کا پھیلنا، کھلے منہ کا بند ہونا اور پرمعنی مسکراہٹیں ہی اب تو من بھاتا کھاجا تھیں۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتی جا رہی تھی کہ اچانک نگاہ فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے قسمت کا حال بتانے والے کی جانب اُٹھ گئی، جس کے گرد بدقسمت لوگوں کا دائرہ بنا تھا اور توتا قسمت کا حال بتانے والا لفافہ نکال رہا تھا۔ اس کا بھی جی مچلا کہ رُک کر توتے سے قسمت کا حال معلوم کرے اور عین اس لمحہ گویا توتے نے اس کے دل کی بات سمجھ کر گردن گھمائی اور بیگم جمال نے خود کو توتے کی گول آنکھوں میں جھانکتے پایا۔ توتا معنی خیز انداز سے آنکھیں نچا کر بولا۔

"ان لفافوں میں بھلا تمہاری قسمت کا حال آ سکتا ہے کہیں۔"

وہ بھونچکی سی ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ دوسرے لمحہ نگاہ اٹھائیں تو دیکھا کہ لفافہ نکال لینے کے بعد توتا اپنے مقام پر بیٹھا مالک کے ہاتھ سے دانہ کھا رہا ہے اور پوچھنے والا قسمت کا حال سن کر خوش ہو رہا تھا۔

گھبرا کر رفتار تیز کر دی۔ سامنے ریستوران نظر آیا تو پھولی سانسیں مرتب کرنے کو وہاں جا گھسی اور بلیک کافی پیتے ہوئے سوچنے لگی غالباً میں ابنارمل ہوتی جا رہی ہوں کہ اب توتا بھی باتیں کرتا محسوس ہوتا ہے۔ کافی سے خود میں نئی توانائی محسوس کی۔ جی تو چاہا کہ اب گھر واپس چلی جائے مگر پھر سوچا نہیں، آج اتنا پیدل چلو کہ تھکن سے پاؤں دُکھنے لگیں، تا کہ اس تھکن کی وجہ سے رات کو آرام سے نیند آ جائے۔ یہ بے خوابی تازہ الجھن تھی!

یوں ہی چلتی رہی، بے قرار سی، کبھی کبھی کسی شوکیس میں جھانک لیتی مگر شاپنگ کا موڈ نہ بنا پاتی اور پھر وہ چلتی چلتی ٹھٹک گئی۔

اسے دیکھ کر توتے نے سیٹی بجائی تھی۔

یہ اس کا وہم نہ تھا، سامنے پالتو پرندے کی دکان تھی۔ رنگ برنگے توتے، کبوتر، پیاری پیاری چڑیاں دروازے کے قریب پنجرہ میں بند توتے نے اسے دیکھ کر سیٹی بجائی تھی۔ بالکل ان امریکن سیلرز کی مانند جو بندرگاہ پر اترتے ہی پہلی نظر آنے والی لڑکی کو دیکھ کر بے اختیار ہو کر سیٹی بجا دیتے ہیں۔

آنکھیں چار ہونے پر توتا دیدے نچا کر بولا۔

"اندر آ جاؤ۔"

"ہائیں تم بولتے بھی ہو۔"

"کیوں...... میں کیوں نہیں بول سکتا؟" وہ برا مان کر بولا۔

"تعجب ہے۔"

"تعجب کی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "بس اندر آ کر مجھے خرید لو۔"

"کیوں؟"

"بس میری خواہش ہے، تم مجھے خرید لو۔"

"مگر مجھے تو طوطوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"مگر مجھے تو عورتوں سے دلچسپی ہے۔ پلیز۔"

لاجواب ہو کر وہ دکان میں داخل ہو گئی اور مالک سے پوچھا۔

"یہ بولتا ہے؟"

"کاٹھا ہے جی۔"

"کیا مطلب؟" اس نے توتے کی طرف دیکھا جو اس گفتگو سے لاتعلق اب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دکاندار وضاحت کر رہا تھا۔ "یہ ان طوطوں میں سے نہیں جو بول سکتے ہیں......"

"کبھی بھی نہیں؟" اس نے پھر توتے کو دیکھا۔

"شائد بعد میں...... بادام وغیرہ کھانے کے بعد بول پڑے تو اور بات ہے فی الحال تو نہیں۔"

"اچھا؟" وہ تذبذب میں تھی۔

"بیگم صاحبہ میں غلط بات نہیں کرتا ویسے اور توتے ہیں اور بہت اچھے اور سستے بھی......"

"نہیں۔" اس نے فیصلہ کر لیا۔ "مجھے یہی لینا ہے۔"

اس نے کبھی توتے نہ خریدے تھے، اس لئے یہ فیصلہ نہ کر پائی کہ قیمت کم ہے یا زیادہ۔ توتا تو اب خرید ہی لیا تھا، لہٰذا قیمت کا کیا تردد؟

گھر آ کر بولی۔ "تمہارا مالک تو کچھ اور کہہ رہا تھا؟"

"وہ بھی جھوٹ نہ کہہ رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"عام حالات میں تو میں واقعی گونگا ہوں لیکن ایک خوب صورت عورت دیکھ کر میری زبان خود بخود

چلنے لگتی ہے۔“

آئینہ نے طنزاً قہقہہ لگایا۔ وہ پنجرہ اٹھا کر بیڈروم میں لے گئی۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”کوئی چکر نہیں بیگم جمال۔“

”ہائیں! تم میرے نام سے بھی واقف ہو؟“

”کیوں نہیں۔“

”مگر کیسے......؟“

”اسے چھوڑو! میں تو اور بھی بہت سی باتوں سے واقف ہوں۔“

”کیا کہا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ گردن ٹیڑھی کر کے گویا مسکرایا۔

”تم کیا جانتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں...... بھلا میں نے کیا جاننا تھا۔ یہ تو میں نے ویسے ہی سسپنس پیدا کرنے کو کہا تھا۔“

”اچھا یہ بتاؤ تم انسانوں جیسی باتیں کیسے کر لیتے ہو۔؟“

”انسانوں جیسی نہیں صرف مردوں جیسی......“

”مردوں جیسی...... کیا مطلب؟“

”نہیں سمجھیں؟“

”نہیں۔“

”چلو! بعد میں سمجھ لیں گے۔“

”نہیں ابھی بتاؤ۔“

”دیکھو! میں مرد ہوتا تھا۔“

”ہائے اللہ!“

”سنو میری دکھ بھری داستان۔“ توتا بولا۔ ”میں ایک ملک کا شہزادہ تھا، حسین و جمیل ایک پری کی محبت میں گرفتار، مگر ایک دیو پلید بھی اس پری کا خواستگار تھا چنانچہ ایک دن اس نے جادو کی ایک انگوٹھی سے مجھ پر غلبہ پا کر مجھے توتا بنا دیا۔“

وہ منہ کھولے سن رہی تھی۔ ”اور اس پری کا نام؟“

”سبز پری۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”آخر توتے ہی رہے نا۔ عشق بھی کیا تو سبز پری سے۔“

”تم نے بھی تو یہی لباس پہن رکھا ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”ہائے میں مری۔“

”سنو! کیا یہ ممکن نہیں کہ تم وہی سبز پری ہو جو مجھ سے زبردستی چھن لی گئی تھی۔“

وہ جھینپ سی گئی۔ ”واٹ نان سینس۔“

”خیر چھوڑو اس قصہ کو...... تمہیں ایک شعر سناؤں؟“

”مجھے شعر و شاعری پسند تو نہیں لیکن سناؤ۔“

”دراصل یہ شعر ابھی ابھی کہا ہے تمہیں دیکھ کر۔“

”ارشاد۔“

تب توتے نے لہک لہک کر یہ شعر پڑھا۔

آتی نئی انداز سے اب سبز پری ہے
پر سبز ہیں لب سرخ ہیں پوشاک ہری ہے

توتا اس طرح سے چھے دار باتوں سے بیگم جمال کا جی پرچاتا رہتا اور وہ ان باتوں کی اتنی عادی ہو گئی کہ آئینہ حاسد بن گیا۔

”اس مردار توتے نے تمہیں توتا چشمی سکھا دی ہے۔“

”ہی از اے برڈ! مجھے چھوڑ کر اس سے پیار کرنے لگی ہو۔“

”ڈونٹ بی سلی۔“

ایک دن سے شرارت سوجھی اور توتے کو آئینے کے مقابل کر دیا، خیال تھا کہ دونوں خوب لڑیں گے مگر ہوا اُلٹ یعنی دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والی کیفیت...... توتا آئینہ میں سراپا دیکھ رہا تھا یا آئینہ توتے کی چشم کے دریچے سے خود کو جھانک رہا تھا اب دونوں اسی طرح خاموش رہے اور ایک دوسرے کو جلی کٹی نہ سنائیں تو بور ہو کر واپس بیڈ روم میں رکھ دیا لیکن ایک دن وہاں سے بھی اٹھا دیا کہ کپڑے بدلتی دیکھ کر توتے نے خاص انداز سے

یوں سیٹی بجائی کہ وہ شرما گئی مگر جب یوں جلاوطنی پر توتا روٹھ گیا تو واپس لے آئی۔ توتے نے اس کا دل لگا دیا تھا اور خود توتے میں بھی ایسی مزاج شناسی پیدا ہو چکی تھی، جس سے اس کا خاوند اب تک محروم تھا۔

وہ باہر جانے سے پہلے پوچھتی۔

”یہ شرٹ کیسی رہے گی۔“

”ٹھیک نہیں۔“

”کیوں؟“

”گلے کی وی لمبی نہیں۔“

”مگر آئینہ کو تو پسند ہے۔“

”اسی لئے تو یہ ٹھیک نہیں۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا۔“

وہ مسکرا دی۔ ”واقعی اسے کیا پتا ان باتوں کا۔“

ایک دن توتا آہ بھر کر بولا۔ ”نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”کچھ نہیں۔“

ان ہی باتوں سے جی بہلا رہتا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مطمئن اور مسرور تھی۔ اس نے بعض رازدار سہیلیوں سے جب بات کی تو وہ مارے اشتیاق کے توتے کی باتیں سننے چلی آئیں مگر یہ ان کے سامنے بالکل کاٹھ کا مادھو بن گیا۔ باتیں اور اشعار کی تو کجا، ٹیں بھی نہ کی۔ تب فخر سے سوچا یہ صرف مجھ ہی سے محو کلام ہونا چاہتا ہے۔ کسی دوسری عورت کو اس قابل نہیں سمجھتا اور یوں توتے کی دل جوئی میں مزید محو ہو گئی۔

آج شام سے ہی ہلکی مگر مسلسل بارش ہو رہی تھی اور خنکی کے ساتھ ساتھ بیگم جمال کے ڈپریشن میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بیزار ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔ ویڈیو سے بھی افاقہ نہ ہوا۔ ناول کھولا مگر یوں ہی بے خیالی سے صفحات اُلٹتی چلی گئی۔ عجیب ذہنی انتشار تھا اور جسم جیسے شکنجے میں کسا جا رہا تھا۔ انگلیاں کھولیں اور بند کیں تو ان کے چٹخنے سے گویا بیڈروم گونج اُٹھا، ورزش کرنے کے انداز میں بازو پھیلا دیئے تو یوں لگا یہ دیواروں سے جا لگیں گے۔ پنڈلیوں پر زور زور سے مکے مارے تو محسوس ہوا کہ ان کی پنڈلیاں پتھرا چکی ہیں۔ ایسی حالت ہو رہی تھی کہ توتا بھی یاد نہ رہا جو گردن ٹیڑھی کئے اسے بڑے اطمینان سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”جی! میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”ویسے ہی......“

”ویسے ہی نہیں...... کوئی بات ہے۔ ہے ناں۔“

”ہاں۔“

”کیا؟“

”تم بہت بے چین ہو۔“

”وہ تو ہوں۔“

”مگر یہ بھی سوچا...... کیوں؟“

”سوچنا کیا...... بس ہوں۔“

”کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے؟“

”پتا نہیں وہ شائد......“

”میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری بے چینی کی وجہ کا علم ہے۔“

”اچھا؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”کیا تمہیں جمال صاحب یاد نہیں آ رہے؟“

”کون؟...... ہاں...... شائد...... غالباً وہی۔“

”غالباً نہیں یقیناً۔“

”چلو یقیناً تو پھر؟“

”تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کے بارے میں کسی سے باتیں کر لو۔“

”ان کے میں کس سے باتیں کر لوں۔“

”دلدار مرزا سے......!“

”دلدار مرزا سے......؟“

”ہاں ہاں وہ جو سامنے والی کوٹھی میں رہتا ہے۔“

''وہ...... اس کی ریپوٹیشن تو کچھ اچھی نہیں ہے۔''

''تو تم کون سے اس سے ووٹ مانگنا ہے۔ چند باتیں ہی تو کرنی ہیں اور وہ بھی جمال صاحب کے بارے میں۔''

''مگر وہ تو جمال کو نہیں جانتا۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ یوں آزادی سے جس طرح کی باتیں چاہو اس سے کر سکتی ہو۔''

''جس طرح باتیں چاہوں' اس سے کر سکتی ہوں...... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب وطلب کچھ نہیں' بس یہی جمال صاحب کے بارے میں باتیں۔''

''مگر کیسی باتیں؟''

''یہی کہ وہ کتنے اچھے ہیں' تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

''ہاں۔''

''ان کے بارے میں خوب صورت باتیں۔''

''ہاں۔''

''ان کی خوبیوں کی باتیں۔''

''ہاں۔''

''ان کی خامیوں کا تذکرہ۔''

''خامیاں۔ مگر وہ تو بے حد شریف شوہر ہیں۔''

''چلو نہ سہی۔''

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے توتے کو گھورتی رہی پھر بولی۔ ''نا بابا......''

''کیوں؟''

''ڈر لگتا ہے؟''

''ڈر کس بات کا؟ تمہاری نیت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔''

''تو پھر کس بات کا ڈر؟''

''کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''مگر تم کوئی غلط کام کرنے تو نہیں جا رہیں...... ہے ناں؟''

''ہاں! یہ تو ہے۔''

''تو پھر گھبراؤ مت۔ اطمینان سے چلی جاؤ۔''

''مگر میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟''

''بھئی تم بھلا کیا کرنا ہے، ظاہر ہے باتیں ہی کرنی ہیں۔''

''ہاں......'' پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''مگر کیا بہانہ کروں وہاں جانے کا۔''

''عجب عورت ہو۔'' توتا غصے سے بولا۔ ''عورت ہو کر جھوٹ بولنا نہیں آتا؟ بیوی ہو کر بہانے کرنے نہیں جانتی؟'' سنو کوئی کہانی گھڑنے کی ضرورت نہیں سب چلے گا۔ مثلاً باتھ روم میں کاکروچ ہے، کچن میں چوہا نظر آیا ہے اور بیڈروم کی چھت پر ایک چھپکلی رینگ رہی ہے...... بہانوں کی کیا کمی ہے زرخیز ذہن والیوں کے لئے۔''

''یوڈرٹی اولڈ اینڈ لیچرش......''

وہ اب پہلی مرتبہ کھلکھلا کر ہنسی پھر جسم پر ہاتھ پھیر کر بے شکن لباس کی شکنیں دور کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا پہنوں؟''

''جو چاہو پہن لو...... کچھ فرق نہ پڑے گا۔''

''پھر بھی......؟''

''میں کہتا ہوں' اسی طرح چلی جاؤ...... بغیر میک کے زیادہ پیاری لگ رہی ہو۔ فطری سی......''

''بنا تو نہیں رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔''

''گڈ لک!''

بیڈروم سے نکلی تو ڈریسنگ روم میں آئینہ دیکھ کر سراپا جائزہ لینے کا سوچا مگر اس وہ آئینہ کی جلی کٹی سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ لہٰذا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

غم الفت

احمد رضا خان

زندگی میں پہلی بار میں نے کسی سے ہمدردی کے دو بول سنے تھے' اس لیے میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور انہیں اپنی پریشانی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ مجھے باہر بینچ پر بٹھا کر خود ڈاکٹر سے ملنے چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد آکر کہا۔ ''میں نے ڈاکٹر سے بات کرلی ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت اسپتال میں داخل ہوجانو۔ تمہارا آپریشن آج ہی ہوگا۔''

اس شمارے کی ایک حساس و سچی کہانی

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں دکھ اور سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن میری بھی کیا زندگی ہے۔ اب تک دکھوں سے ہی واسطہ پڑتا رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کچھ وقت سکھ سے گزارا ہو۔ بچپن کی باتیں مجھے یاد نہیں لیکن جوانی آتے ہی میں ایک کے بعد ایک مصیبت میں پھنستی چلی گئی۔ میری شادی سولہ سال کی عمر میں ہی ایک پچاس سال کے بوڑھے سے کردی گئی۔ یہ کارنامہ' میرے بھائیوں نے انجام دیا جو میرے سرپرست تھے۔ اس شخص نے اپنی بیٹی میرے بھائی کو دے کر میرا رشتہ مانگ لیا۔ میں فریاد کس سے کرتی۔ لہٰذا چپ چاپ بھائیوں کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ شوہر نے میرا بہت خیال رکھا لیکن عمر کے فرق کی وجہ سے اسے ذہنی طور پر اپنا شوہر تسلیم نہ کرسکی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی میں ماں بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹا دیا تھا لیکن اس کے کچھ عرصے بعد میرا شوہر اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور میں بیوہ ہو کر بھائی کے در پر آن پڑی۔

بھائی کے گھر میں رہتے ہوئے ابھی چند ماہ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ بھابھی نے جو میرے مرحوم شوہر کی بیٹی تھی' میرا جینا مشکل کردیا۔ بھائی نے یہ

صورت حال دیکھ کر مجھے دوسری شادی کرنے کے لیے آمادہ کرنا شروع کردیا۔ میں اتنی جلدی دوسرا نکاح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ذہن میں بس یہی ایک بات تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ شوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ میں نے دوسری شادی کرلی لیکن بھائی نے دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت دبتا تھا اور اسی کے کہنے پر مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ بھائی کے بہت زیادہ زور دینے پر میں دوسری شادی کے لیے تیار ہوگئی۔

میری خالہ کا لڑکا امین مغل پہلے سے شادی شدہ اور دو بیٹوں کا باپ تھا۔ اس کی بیوی ناراض ہوکر میکے چلی گئی تھی۔ امین مغل نے موقع غنیمت جان کر میرا پیچھا پکڑ لیا۔ خالہ بھی بیٹے کی طرف داری میں آگے آگئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ''بیوی کی علیحدگی کی وجہ سے میرا بیٹا بہت پریشان ہے۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو میری بہن کی بیٹی ہے۔ تجھ سے بڑھ کر میرے لیے کون ہوسکتا ہے۔ میں تجھے کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔''

میں پہلی بیوی کی موجودگی میں امین سے نکاح نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن امین نے کہا کہ وہ اسے طلاق دے چکا ہے تو میں نکاح کے لیے رضامند ہوگئی۔ نکاح کے دوسرے دن ہی امین اپنی بات سے مکر گیا اور بولا۔

''میں اسے طلاق نہیں دے سکتا۔ وہ میرے بیٹوں کی ماں ہے۔''

میں یہ سن کر خوب چیخی، چلائی اور جھگڑا شروع کردیا۔ اس پر میری ساس بولی۔

''وہ اس گھر میں ضرور آئے گی۔ اگر تو نے کوئی رکاوٹ پیدا کی تو میں امین کی تیسری شادی کردوں گی۔ چاہے بدلے میں مجھے اپنی بیٹی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''

میں بہت جلد سمجھ گئی کہ وہ لوگ صرف مجھے دبانے کے لیے جھگڑا کھڑا کررہے تھے۔ امین بہت عیاش شخص تھا اور آئے دن عورت بدلنا اس کا مشغلہ تھا۔ امین کا دل بہت جلد مجھ سے بھر گیا اور اب وہ تیسری شادی کرنے کے چکر میں تھا۔ میں امید سے ہوئی تو میری ساس نے دائی کو رقم دے کر آمادہ کرلیا کہ وہ بچے کو پیدا ہوتے ہی مار دے۔ میری بیٹی پیدا ہوئی تھی لیکن دائی نے مشہور کردیا کہ وہ مری ہوئی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ میں بہت روئی، تڑپی لیکن میں نے اپنے ہونٹ سی لیے کیونکہ میں امین کو بہت چاہتی تھی۔ اس سے پیار کرتی تھی۔ اسی پیار کے چکر میں پھنستی گئی۔ دوبارہ امید سے ہوئی تو ماں بیٹے نے بہت کوشش کی کہ بچہ ضائع ہوجائے۔ میں نے ان کی ایک نہ سنی اور خدا سے دعا کرتی رہی کہ اس بار بچہ خیریت سے ہوجائے۔

خدا نے میری سن لی اور میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ امین پر اس خبر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی رنگ رلیوں میں مست تھا۔ میں نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ اس پر میری کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا، اس لیے اس سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میں نے اپنی ساری توجہ بیٹے پر مرکوز کردی۔ ابھی میرا بیٹا کاشف ایک سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ امین کو پھر تیسری شادی کی سوجھی۔ اس بار اسے ایک بکریاں چرانے والی لڑکی پسند آگئی تھی۔ امین نے مجھ سے کہا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر میں نے اس کو شادی کی اجازت دے دی تو ٹھیک ورنہ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ میں امین کی بات سن کر سناٹے میں آگئی۔ میں نے کہا۔

''ایسا غضب نہ کرنا۔ میں تو آپ کو بہت پیار کرتی ہوں۔ آپ کے بغیر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔''

امین نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ پیار تو میں نے اپنی ماں سے نہیں کیا، تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

میں نے اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ بس اس نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی تھی کہ شادی کی اجازت دے دو ورنہ طلاق کے لیے تیار ہوجاؤ۔ مجھے بچے کی فکر تھی۔ اگر مجھے طلاق

ہوجاتی تو اس کا مستقبل تاریک ہوجاتا۔ لہٰذا اس بچے کی خاطر مجھے امین کی بات ماننا پڑی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اپنی ساس پر ہورہی تھی جو میری خالہ ہونے کے باوجود مجھ سے دشمنی کررہی تھی۔ اس نے شادی سے آٹھ دن پہلے ہی امین کا کمرا الگ کردیا۔ میں بچے کو لے کر اس کے پاس جاتی تو ساس چیخنے چلانے لگتی کہ اس نحوست کو یہاں سے لے جاؤ۔ وہ تو چاہتی تھی کہ میں اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤں لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور دل پر پتھر رکھ کر امین کی برات کے ساتھ چلی گئی۔

میری آہ رنگ لائی اور امین کی تیسری بیوی شادی کے دس دن بعد ہی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ امین کی آنکھوں پر عشق کی پٹی چڑھی ہوئی تھی، اس لیے وہ اس عورت کی حقیقت نہ جان سکا تھا جبکہ میں اس عورت کے کردار سے اچھی طرح واقف ہوچکی تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں تین تین مردوں کو بے وقوف بناتی تھی۔ امین اس کی تلاش میں دیوانہ وار پھرتا رہا۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ وہ عورت امین کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی تھی اور امین سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے عشق میں مرا جارہا تھا۔

ایک دن میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ میں اسپتال چلی گئی۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرکے بتایا کہ DNC ہوگی۔ اسپتال میں داخل ہوتی تو وہاں ...ار کرنا پڑتا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ گھر آکر یہ کام کردے گی۔ اس نے پندرہ سو روپے لیے۔ ایک ... میں نے اپنی طرف سے دیا لیکن اس نے بے احتیاطی سے کام کیا جس کی وجہ سے کوئی زخم ہوگیا اور میری تکلیف بڑھنے لگی۔ میں دوبارہ اسپتال گئی تو ڈاکٹر نے فوری طور پر الٹراساؤنڈ کروانے کا مشورہ دیا۔ میں نے گھر واپس آکر امین کو بتایا تو وہ بولا۔ ''میں تو بہت مصروف ہوں۔ تم کسی کو ساتھ لے کر چلی جاؤ۔''

مجھے اس سے اسی جواب کی توقع تھی، لہٰذا مجبوراً ... کے ساتھ بہاول پور گئی۔ الٹراساؤنڈ کروانے کے بعد رپورٹ ملی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

''زخم میں پس پڑ چکا ہے۔ اگر بڑا آپریشن نہ ہوا تو کینسر بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے بڑے حوصلے سے یہ بات سنی اور گھر آگئی۔ دونوں بچے بھوکے سوگئے۔ میں نے امین سے پوچھا تو کہنے لگا۔

''کیا خردماغ بچے پالے ہیں۔ کسی کے ہاتھ سے کچھ کھاتے ہی نہیں۔'' میں صبر کا گھونٹ پی کررہ گئی۔ گھر میں دودھ تک نہیں تھا۔ رات ہوچکی تھی۔ میں گرتی پڑتی بازار گئی اور بچوں کو جگا کر انہیں کھانے کو دیا۔

دوسرے دن اسپتال گئی۔ ڈاکٹر کو رپورٹ دکھائی تو وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے کہا۔

''بی بی! تمہارا بڑا آپریشن ہوگا اور اس پر ٹھیک ٹھاک خرچہ آئے گا لیکن یہ آپریشن جتنی جلدی ہوجائے تو اچھا ہے، ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔'' میں نے امین کو بتایا تو وہ کہنے لگا۔

''میں تو اتنی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتا۔''

میں روتی دھوتی ڈاکٹر کے پاس گئی اور اسے اپنی مجبوری بتائی۔ ڈاکٹر نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! تم فکر مت کرو۔ کوئی نہ کوئی بندوبست ہوجائے گا۔ یہاں کئی مخیّر اور پیسے والے لوگ آتے ہیں جو غریبوں کے علاج کا پورا خرچ خود برداشت کرتے ہیں۔ میں کسی سے بات کرتا ہوں۔''

میں ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلی تو باہر ہی ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ میں ان کا نام نہیں بتا سکتی۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ ''کیا ہے، اتنی پریشان کیوں ہو؟''

میں حیران ہوکر بولی۔ ''آپ کون ہیں۔''

''میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گا لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ فی الحال تم مجھے اپنی پریشانی کے بارے میں بتاؤ۔''

زندگی میں پہلی بار میں نے کسی سے ہمدردی کے دو بول سنے تھے، اس لیے میں اپنے جذبات پر

قابو نہ رکھ سکی اور انہیں اپنی پریشانی کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ وہ مجھے باہر بینچ پر بٹھا کر خود ڈاکٹر سے ملنے چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد آ کر کہا۔ "میں نے ڈاکٹر سے بات کرلی ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت اسپتال میں داخل ہوجاؤ۔ تمہارا آپریشن آج ہی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "اتنی جلدی میں کیسے داخل ہوسکتی ہوں۔ گھر والوں کو تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ صرف ابو میرے ساتھ آئے ہیں۔"

"گھر والوں کو بھی اطلاع ہوجائے گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔"

ابو باہر لان میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر سے بات کرلیں۔ مجھے ابھی اسپتال میں داخل ہونا ہے۔ شاید آج ہی میرا آپریشن ہوجائے۔ ڈاکٹر نے ابو کو تسلی دی کہ کسی نیک آدمی نے میراں کے علاج کی تمام ذمے داری اپنے سر لے لی ہے لہٰذا اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

امین کو خبر ہوچکی تھی لیکن وہ بچوں کو لے کر اس وقت پہنچا جب میں آپریشن تھیٹر جاچکی تھی۔ میں بارہ بجے آپریشن کے لیے گئی تھی۔ شام پانچ بجے واپسی ہوئی۔ میں بے ہوش تھی اس لیے کچھ پتا نہیں کہ کون آیا، کون گیا۔ رات تین بجے ہوش آیا تو وہی مہربان دوست میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک گل دستہ میرے سرہانے رکھا اور بولے۔ "مبارک ہو میراں! اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس شخص سے میرا کیا رشتہ ہے۔ میرے اپنے سب چلے گئے اور یہ غیر شخص رات کے تین بجے بھی یہاں بیٹھا ہے۔ میں غنودگی میں تھی۔ دوبارہ نیند میں چلی گئی۔ پانچ بجے آنکھ کھلی تو وہ میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کچھ پیسے میرے ہاتھ پر رکھے اور بولے۔ "یہ رکھ لو۔ دوپہر کے کھانے میں بکرے کے گوشت کی یخنی بنوا کر پی لینا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ سات بجے ابو آ[illegible] انہوں نے ڈاکٹر کے کہنے پر مجھے چائے لا کر [illegible] دس بجے امین بچوں کو لے کر آگیا۔ میں نے ا[illegible] تین سو روپے دیے اور کہا۔ "میرے لیے بکرے [illegible] مرغی کے گوشت کی یخنی بنوا کر لے آنا۔"

امین نے یہ بھی نہ پوچھا کہ پیسے کہاں سے آئے اور آپریشن کیسے ہوا۔ دوپہر کو وہ یخنی کی بجائے بڑے کے گوشت کا قیمہ لے کر آگیا۔ میرا دل تو ویسے ہی چٹ پٹی چیز کھانے کو کررہا تھا، سو میں نے قیمہ کھالیا۔ چار بجے کے قریب میرا پیٹ پھول گیا۔ مجھے دوبارہ آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ تین گھنٹے بعد واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر، امین پر بہت ناراض ہوا۔ رات میرے مہربان دوست آئے تو انہوں نے ڈاکٹر سے کہہ کر میرے لیے کھانے کا انتظام کروادیا۔

پندرہ دن بعد مجھے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ ڈاکٹر نے امین کو سختی سے تاکید کی تھی کہ [illegible] تک مکمل احتیاط کرنی ہے اور کوئی جھٹکے والا کام نہیں کرنا ہے۔ امین اس وقت تو سر ہلاتا رہا لیکن دس دن بعد ہی پھر تو تو میں میں شروع ہوگئی۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈاکٹر نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میرا پیٹ پھول گیا لیکن امین کو اپنی غلطی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ مجھے اسپتال لے چلو لیکن وہ ٹال مٹول کرتا رہا حالانکہ اس وقت بھی اس کے پاس کم از کم سات ہزار روپے گھر میں تھے۔ اسی دوران امین کا ایک بھتیجا آگیا۔ اس نے امین کو بہت باتیں سنائیں اور مجھے 1500 روپے دیے۔ میں فوراً بہاول پور چلی گئی۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور بولا۔ "بی بی! شکر کرو، ٹانکے نہیں ٹوٹے۔ ورم ہے۔ میں [illegible] دے رہا ہوں۔ اسے باقاعدگی سے استعمال کرنا۔"

اللہ نے کرم کیا۔ میری صحت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی۔ اس دوران میں امین کی زیادتیاں بڑھ گئیں۔ وہ مجھ سے بات بے بات جھگڑتا تھا۔ ایک شام میں بہت پریشان تھی کہ اس نے مجھ سے جھگڑا شروع کردیا۔ میں نے بھی جواب دیا تو اس نے [illegible]

[illegible]ا شروع کردیا۔ میرا دل ویسے ہی پریشان تھا۔ [illegible] اطلاع ملی تھی کہ میرے بڑے بیٹے سلیم کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ میرے پہلے شوہر سے تھا۔

میں پریشانی کے عالم میں چلی گئی پہلے بہاول پور میں اس کا علاج کروایا پھر لاہور میں معذوروں کے اسپتال میں داخل کرادیا۔ اس طرح دشمنوں کو موقع مل گیا جن میں میری سگی بہن اور بہنوئی پیش پیش تھے۔ انہوں نے میرے خلاف امین کو خوب بھڑکایا۔ عید قریب آرہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ سلیم کو اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں کررہا تھا اور اگر گھر نہیں جاتی تو امین کا پارا ہائی ہوجائے گا۔

خیر، میں عید کے دوسرے دن گھر پہنچی تو امین نے سیدھے منہ مجھ سے بات تک نہ کی۔ کہنے لگا۔ "مجھے تمہاری بہن اور بہنوئی نے سب کچھ بتادیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر تمہیں ان کی باتوں پر یقین ہے تو میں کوئی صفائی پیش نہیں کرسکتی۔"

"صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔"

"دیکھو امین! اس وقت میں بہت پریشان ہوں۔ کل صبح سلیم کا آپریشن ہے۔ بعد میں بات کرلیں گے۔"

امین نے میری بات سنی ان سنی کردی اور مجھے کمرے میں بند کرکے بولا۔ "اگر گھر سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو رات کو مار کر گلی میں پھینک دوں گا۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ تمہاری بہن اور بہنوئی میرے ساتھ ہیں۔ کہہ دوں گا کہ کسی کے ساتھ جارہی تھی۔"

امین تو مجھے کمرے میں بند کرکے چلا گیا۔ میں نے کھڑکی میں سے اپنے بیٹے کاشف کو آواز دے کر امین کے استاد کو بلوایا اور اسے سب کچھ صاف صاف بتادیا۔ اس نے امین کو بہت لعن طعن کی اور میری ضمانت دی کہ تین دن میں واپس آجائے گی۔ امین نے شرط لگائی کہ جو کچھ ہم کہیں گے، یہ اپنے ہاتھ سے لکھ کردے گی۔ میں اس وقت مجبور تھی۔ اس کی ہر بات ماننی پڑی۔ جو زمین میرے نام تھی، وہ بھی واپس لے لی۔ میرے پاس تن کے تین کپڑوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر لاہور چلی گئی۔

سلیم کا آپریشن ہوگیا تو میری بہن کو فکر لاحق ہوئی کہ یہ تو بچ گیا۔ اس نے ایک بار پھر امین کو اکسایا۔ امین اور میرا بہنوئی مجھے لینے لاہور آئے۔ ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ ان کا ارادہ مجھے راستے میں ہی مار دینے کا تھا۔ مجھے یہ بات کسی طرح معلوم ہوگئی تو میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ اس پر وہ لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور میری بیٹی کو زبردستی چھین کر لے گئے۔ میں بہت روئی تڑپی مگر ان ظالموں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ایک مہینہ اسی طرح روتے دھوتے گزر گیا۔ میں نے بھائی کی خوشامد کی کہ کسی طرح میری بیٹی کو لے آؤ۔ بھائی بھی ایک نمبر کا لالچی تھا۔ اس نے کہا کہ میں بہت پریشان ہوں۔ اگر میں نے بجلی کا بل نہیں بھرا تو میرا میٹر کٹ جائے گا۔

میں نے پیسے دینے کی ہامی بھری اور بچے کھچے پیسے نکال کر اسے دے دیے۔ اس طرح میری بیٹی مجھے واپس مل گئی۔ میں پناہ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ گھر واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں جاتی تو وہ لوگ مجھے یقیناً مار دیتے۔ کسی مہربان عورت نے مجھے ایک جگہ کا ایڈریس دیا اور کہا۔ "اس پتے پر چلی جاؤ۔ وہاں تمہیں کام بھی ملے گا اور رہنے کے لیے جگہ بھی۔"

میں اس عورت کو دعائیں دیتی ہوئی لاہور کے ایک محلے شادی پورہ چلی گئی۔ وہاں لعل اسٹار اسکول کے مالک نے اپنے گھر پر ملازم رکھ لیا۔ تنخواہ کے ساتھ ساتھ رہنے کے لیے جگہ بھی دی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور محنت سے کام کرنے لگی۔ وہاں سب لوگ بہت اچھے تھے۔ میرے حالات جان کر بہت

سے لوگوں کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

انہی میں ایک لڑکا جس کی عمر چودہ سال تھی، میرا منہ بولا بیٹا بن گیا۔ مجھے اس سے بہت ڈھارس تھی کیونکہ وہ میرے بہت سارے کام کر دیا کرتا تھا۔

سر چھپانے کو جگہ اور عزت کی روٹی ملی تو مجھے اپنے بیٹے کاشف کی یاد ستانے لگی۔ وہ ابھی تک امین مغل کے پاس تھا اور میں کسی نہ کسی طرح اسے وہاں سے نکالنا چاہتی تھی۔ بہن بھائیوں نے مجھے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ انہیں لالچ اور دشمنی نے اندھا کر دیا تھا۔ اگر امین کو میرے ٹھکانے کا پتا چل جاتا تو وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ چنانچہ میں نے اپنے اسی منہ بولے بیٹے کو راز دار بنایا اور کہا۔ ”گاؤں میں تمہارا ایک بھائی اور بھی ہے، لیکن میں وہاں نہیں جا سکتی کیونکہ میری جان کو خطرہ ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”آپ میری ماں جیسی ہیں اور میں آپ کا حکم کسی صورت نہیں ٹال سکتا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں بہت جلد کاشف کو لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔“

میں نے اسے اچھی طرح سمجھا کر گاؤں بھیجا۔ کرائے کے پیسے دیے اور تاکید کر دی کہ میرے ٹھکانے کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ اس لڑکے نے بڑی عقل مندی سے کام لیا اور چوری چھپے کاشف کو وہاں سے نکال لایا۔ کاشف کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بیمار تھا۔ جسم پر پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ کاشف نے مجھے بتایا کہ بابا کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ سوتیلی ماں ہر وقت اسے طعنے دیتی رہتی ہے، اور کہتی ہے، امین نے تو تیری ماں کو طلاق دے دی۔ تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ کبھی پیٹ بھر کے کھانے کو نہیں دیتی۔

میں نے کاشف کا علاج کروایا۔ میں لاہور میں بھی اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ امین کسی وقت بھی میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ میرے منہ بولے بیٹے نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو اس نے گاؤں میں دیکھا اور سنا۔ امین کے ساتھ ساتھ میری بہن، بہنوئی اور بھائی بھی میرے دشمن ہو چکے تھے۔ میرے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ میں اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوں اس لیے مجھے کاری قرار دے کر وہ لوگ مجھے کسی وقت بھی جان سے مار سکتے تھے لہٰذا میں ایک روز خاموشی سے اپنے بچوں کو لے کر کراچی آ گئی تھی۔

یہ شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ نہ کوئی جان پہچان تھی اور نہ ہی رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ۔ میں راستے بھر یہی سوچتی رہی کہ بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دی کہ جب اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ دیا ہے تو آگے بھی وہی راستہ دکھائے گا۔ کینٹ اسٹیشن سے میں نے رکشا پکڑا اور سیدھی حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر پہنچی۔ فاتحہ پڑھ کر دعا مانگی اور بچوں کو لے کر چل پڑی۔ وہیں قریب ہی نیلم کالونی تھی۔ میں ستانے کے لیے ایک پلیا پر بیٹھ گئی۔ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر گزر رہے تھے۔ کچھ نے اشارے بازی بھی کی۔ میں گھبرا گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت میرے پاس آئی اور بولی۔ ”میں تمہیں بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں۔ تم اس شہر میں نئی معلوم ہوتی ہو۔“

میں کیا جواب دیتی۔ خاموش ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”تمہاری خاموشی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ کسی کے ہتھے چڑھ گئیں تو بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ آؤ میرے ساتھ گھر چلو۔ وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

میں بلا سوچے سمجھے اس عورت کے ساتھ چل دی۔ تھوڑے فاصلے پر ہی اس کا گھر تھا۔ اس نے مجھے اور بچوں کو کھانا کھلایا اور میری داستان سننے کے بعد بولی۔ ”تم نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔ یہاں جان پہچان کے بغیر گزارہ بہت مشکل ہے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی جو میں تمہیں مل گئی لیکن میری مجبوری

یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ میرا شوہر اچھا آدمی نہیں ہے۔ دوسری عورت پر فوراً عاشق ہو جاتا ہے۔ تم تو ویسے بھی بہت خوب صورت ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو وہ پاگل ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”بہن، میں خود بھی تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ بس تم اتنی مہربانی کرو کہ مجھے کہیں کام دلا دو۔“

”کام تو خیر، تمہیں مل ہی جائے گا۔ اصل مسئلہ رہائش کا ہے۔ یہاں ایک کمرے کا مکان بھی ہزار روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ کرایہ دینے کے بعد تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ پھر بچوں کا مسئلہ ہے۔ تم کام پر جاؤ گی تو وہ گھر میں اکیلے رہیں گے۔ خیر تم پریشان مت ہو۔ میں تمہارے لیے ایسا گھر تلاش کرتی ہوں جہاں رہنے کی جگہ بھی مل سکے۔“

تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ عورت مجھے ساتھ لے کر کام کی تلاش میں چل پڑی۔ دس بارہ کوٹھیوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد مجھے ایک گھر میں کام مل گیا۔ انہوں نے مجھے رہنے کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا لیکن اصل مسئلہ ضمانت کا تھا۔ جو عورت مجھے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی، اس نے کہا۔ ”اس کی ضمانت میں دیتی ہوں۔ شام تک اپنے شناختی کارڈ کی کاپی آپ کو پہنچا دوں گی۔“

میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ میں نے دل لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتی تھی لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اطمینان اس بات کا تھا کہ میرے بچوں کو پیٹ بھر کر روٹی مل رہی تھی۔ میری بیگم میرے کام سے بہت خوش تھیں۔ شام کو گھر آتی تو وہ مجھے بہت سا کھانا اور پھل وغیرہ دے دیا کرتیں۔ میں دوسرے دن وہی کھانا بچوں کو دوپہر میں دے دیا کرتی تھی۔ مجھے اپنے گھر میں کھانا پکانے کی ضرورت کبھی کبھار ہی پیش آتی تھی۔ میرے گھر میں پانی پینے کا برتن تک نہیں تھا لیکن اس عورت نے میری بہت مدد کی۔ چند ہی مہینوں میں میرے گھر میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہو گئی تھی۔

کھڑکی

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ”کیا تم نے اس شخص کے بارے میں پڑھا جس نے دیوار کے اس پار دیکھنے والی چیز ایجاد کی ہے؟“

دوسرا دوست: ”نہیں، لیکن وہ کون سی چیز ہے جس سے دیوار کی دوسری طرف دیکھا جا سکتا ہے؟“

پہلا دوست: ”کھڑکی۔“

حماقت

ایک مشہور ہسپانوی رقاصہ سے کسی شخص نے طنزاً پوچھا۔

”عورتیں اتنی حسین ہو کر اس قدر احمق کیوں ہوتی ہیں؟“

”قدرت عورتوں کو حسن اس لئے دیتی ہے کہ مرد ان سے محبت کریں اور حماقت اس لئے کہ وہ مردوں سے محبت کر سکیں۔“

بستہ

ڈاکٹر (پہلوان سے): ”آپ کا کندھا کیسے اترا؟“

پہلوان: ”غلطی سے اپنے بچے کا بستہ اٹھا لیا تھا۔“

کچھ عرصے بعد وہ لوگ امریکا شفٹ ہو گئے تو میں نے اختر کالونی میں مکان لے لیا۔ دوسرے گھر میں کام بھی مل گیا۔ تنخواہ بھی اچھی تھی اور مالکوں کے ہاں سے چیزیں بھی بہت ملتی تھیں۔ انہی دنوں میری زندگی میں ایک اور انقلاب برپا ہو گیا۔ حادثاتی طور پر میری ملاقات ایک پولیس والے سے ہو گئی۔ اس روز میں بہت اداس تھی۔ گھر اور گاؤں بہت یاد آ رہے تھے۔ میں اپنی اداسی دور کرنے کے لیے سمندر کے ساحل پر چلی گئی۔ چلتے چلتے بہت دور نکل آئی اور وہیں ریت پر بیٹھ کر سمندر کو دیکھنے لگی۔ مجھے وہاں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مجھے یکایک بچوں کا خیال آیا تو گھبرا کر اٹھ کھڑی

ہوئی۔ دیکھا تو ایک پولیس والا مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گئی تو وہ بارعب آواز میں بولا۔ ”اے کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہی ہو۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”دیکھ بھائی مجھے تنگ مت کر۔ میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔“

”میں تم جیسی عورتوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑی اچھی جگہ ڈھونڈی ہے اپنی پریشانی دور کرنے کی۔“

”میری بات کا یقین کرو۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ بس میرا دل گھبرا رہا تھا‘ اس لیے یہاں چلی آئی۔“

اس نے مجھ سے چند سوالات کیے پھر اسے کچھ کچھ یقین آ گیا۔ کہنے لگا۔ ”تم جوان ہو‘ خوب صورت ہو۔ تمہیں اس طرح یہاں اکیلے نہیں آنا چاہیے۔ یہاں طرح طرح کے لوگ پھرتے ہیں۔ آؤ‘ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“

”نہیں بھائی‘ میں چلی جاؤں گی۔ آپ تکلیف نہ کریں۔“

”تمہیں میرے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ میں تمہارا گھر دیکھوں گا۔ تمہارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں گا اور جب تک میری انکوائری پوری نہیں ہو جاتی‘ اس وقت تک میں تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔“

میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی جھے مجبوراً اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے گھر تک آنا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دروازے سے ہی واپس چلا جائے گا لیکن وہ موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کرتے ہوئے بولا۔

”کیا چائے کے لیے بھی نہیں پوچھو گی۔“

میں نے مجبوراً اسے اندر بلا لیا۔ اس کے لیے چائے بنائی۔ اس دوران میں اس نے مجھ سے کرید کرید کر سب باتیں پوچھ لیں۔ میری کہانی سننے کے بعد وہ بولا۔ ”واقعی تمہارے ساتھ ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔“

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا گیا۔ دوسرے دن پھر آیا۔ کہنے لگا۔ ”تمہارا یہاں تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔ کیا تم میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔“

”میں...... میں بھلا آپ کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہوں۔“ میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میرے گھر میں بیوی بچے ہیں۔ ملازم ہیں۔ تمہارے لیے جگہ بھی نکل ہی آئے گی۔ میں تو نے اس خیال سے کہا تھا کہ وہاں تم محفوظ ہوگی۔“

”لیکن آپ کی بیگم! کیا وہ مجھے اپنے گھر میں جگہ دے سکیں گی۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اپنی رشتے دار ظاہر کروں گا تو وہ کچھ نہیں کہہ سکے گی۔“

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ کیا مجھے اس شخص کی بات مان لینی چاہیے۔ میرے دل میں لالچ پیدا ہو گیا۔ اس کی پیشکش ہر لحاظ سے پرکشش تھی۔ اس کا گھر میرے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ہو سکتا تھا۔ میرے بچوں کو بھی اچھا ماحول مل جائے گا۔ وہ پڑھ لکھ جائیں گے۔ میں بھی کچھ پس انداز کر سکوں گی۔ اس معاملے پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں نے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ میں اپنا کام نہیں چھوڑوں گی۔ بہانہ یہ بنایا کہ مجھ پر بہت قرضہ ہے۔ وہ اتارنا ہے۔“

ان صاحب نے نہ جانے اپنی بیوی کو کیا بتایا اور کہا کہ وہ دوسرے دن ہی مجھے لینے آ گئی۔ بچے بھی ساتھ تھے۔ میں نے پہلے تو دکھانے کے لیے تھوڑی سی ٹال مٹول کی‘ پھر ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ ان لوگوں نے میری خوب آؤ بھگت کی۔ صبح میں کام پر جانے کے لیے نکلی تو صاحب پھر میرے پیچھے پیچھے آ گئے اور بولے کہ مجھے درخشاں چوکی جانا

ہے۔ تمہیں راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔ میں گھر کے گیٹ سے باہر نکلی اور ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ راستے میں صاحب نے واپسی کا ٹائم پوچھا۔ میں نے بتا دیا تو بولے۔ ”ٹھیک ہے۔ میں پانچ بجے تمہیں لے لوں گا۔“

میں شام کو کام کر کے کوٹھی سے باہر آئی تو صاحب ماروی کو اسٹور کے پاس کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے کہا۔ ”آپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں گھروں میں کام کرنے والی ایک معمولی عورت اور آپ پولیس افسر۔ کسی نے مجھے آپ کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔“

کہنے لگے۔ ”یہاں سڑک پہ کھڑے ہو کر باتیں کرنا ٹھیک نہیں۔ تم جلدی سے میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

انہوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گھر جانے کی بجائے سمندر کی طرف چل دیے۔ بہت اچھے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے۔ ”مبارک ہو میراں‘ آج تمہارے بچوں کا اسکول میں ایڈمیشن ہو گیا۔ میں نے کتابیں‘ کاپیاں اور یونیفارم وغیرہ سب دلوا دیا ہے۔“

خوشی کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے جذبات میں آ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“

انہوں نے بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولے۔ ”میراں! میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ جس طرح میرے بچے اسکول جاتے ہیں‘ اسی طرح تمہارے بچے بھی اسکول جائیں گے۔“

ہم کافی دیر تک ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے۔ مجھے ان کے ساتھ چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے۔ عورت کی چھٹی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ جلد مرد کی نگاہوں کا مفہوم بھانپ لیتی ہے۔ میں تو پہلے روز ہی جان گئی تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ عنایتیں بے سبب نہ تھیں۔ ان کے پیچھے بھی کوئی غرض چھپی ہوئی تھی۔

گھر سے کچھ فاصلے پر انہوں نے مجھے اتارا۔ کہنے لگے۔ ”تم چلو‘ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔“ میں سمجھ گئی کہ موٹر سائیکل پر آنے جانے والی بات بیوی سے چھپائی جا رہی تھی۔ اس کے بعد یہ روز کا معمول بن گیا۔ وہ روزانہ مجھے صبح کام پر چھوڑتے اور شام کو واپس لے آتے۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ایک دن پھر وہ مجھے سمندر کے کنارے لے گئے۔ کافی دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ ”میراں‘ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

میں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے اس لیے خاموش رہی۔ وہ بولے۔ ”تم مجھے اچھی لگتی ہو۔“

میرے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”شکر ہے کہ میں بھی کسی کو اچھی لگی۔“

اس کے بعد انہوں نے کچھ نہ کہا‘ بس خاموشی سے اٹھ کر چل دیے۔ اس دن میں نے ان کی نظروں میں اپنے لیے ڈھیر سارا پیار محسوس کیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں مجھے پیار کرنے لگے تھے لیکن امین سے دھوکا کھانے کے بعد میں اتنی جلدی کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ صاحب کی بیوی بہت سخت تھی۔ وہ نہ جانے مجھے کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے بہت زیادہ جھگڑا کیا تو میں اس کا گھر چھوڑنے پر تیار ہو گئی لیکن اس کے بچوں نے ایسا نہیں ہونے دیا کیونکہ وہ میرے بچوں سے بہت گھل مل گئے تھے۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ اس نے بہت دفعہ مجھے گھر سے نکالنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کے بچے آڑے آ جاتے۔

میں جب بھی جانے کا نام لیتی تو صاحب کی حالت غیر ہو جاتی۔ وہ گڑگڑانے لگتے اور کہتے۔ ”ہم

سب کو تمہارے ساتھ بہت پیار ہوگیا ہے۔ تمہارے جانے کی بات سن کر ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’صاحب‘‘ میں بہت مجبور ہوں۔ آپ مجھے تنگ مت کریں۔ میں کوئی مکان کرائے پر لے لوں گی۔‘‘

صاحب نے میری ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے کہ تم یہاں آرام سے رہو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔‘‘

ایک دن صاحب اور ان کے بیوی بچے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں نے سوچا کہ گھر صاف کرلوں۔ میں نے پورے گھر کی صفائی کی۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ آ گئے۔ صاحب نیچے کسی کام سے رک گئے۔ بیوی اوپر آئی۔ میں نے سلام کیا تو تڑک کر بولی۔ ’’کیا تمہارے باپ کا گھر ہے کس سے پوچھ کر گھر صاف کیا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بہنیں، بھائیوں کے گھر ہوں تو وہ گھر باپ کا ہی ہوتا ہے۔‘‘

یہ سنتے ہی وہ مجھ پر جھپٹ پڑی اور مجھے مارنا شروع کردیا۔ میرے بیٹے نے مجھے بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی مارنے لگی۔ اتنی دیر میں صاحب بھی آ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تو بولی۔ ’’اس سے کہو کہ یہ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے چلی جائے۔‘‘

صاحب نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میراں میری چچازاد ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اس لیے یہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔‘‘

بیوی نے غصے سے کہا۔ ’’اگر ایسی ہی ہمدردی ہے تو شادی کیوں نہیں کرلیتے۔‘‘

صاحب نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ تم نے کہہ دیا تو شادی بھی ہوجائے گی۔‘‘

اس کے بعد صاحب نے مجھے اور بچوں کو ساتھ لیا اور باہر چلے گئے۔ ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا، پھر صاحب کہنے لگے۔ ’’میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم مجھ سے شادی کرلو۔‘‘

میں بہت غصے میں تھی۔ اس کی بیوی نے میری اچھی خاصی بے عزتی کردی تھی لہٰذا میں نے سوچے سمجھے بغیر ہاں کردی۔ دوسرے روز ہی صاحب نے مجھ سے نکاح کرلیا۔ اس کی بیوی بہت روئی، چیخی چلائی مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے مجھ سے جھگڑنا شروع کردیا۔ ایک دن کہنے لگی۔ ’’میراں، تو اس گھر سے چلی جا ورنہ میں تیرے بچوں کو زہر دے دوں گی۔‘‘

میرے میاں ڈر گئے۔ انہوں نے کرائے کا مکان ڈھونڈا اور میں اس گھر میں شفٹ ہوگئی۔ میاں بھی میرے ساتھ ہی آ گئے۔ چلتے وقت بیوی سے کہا۔ ’’تم اپنے گھر میں آرام سے رہو۔ میں بھی اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ واپس نہیں آؤں گا۔‘‘

دو چار دن بعد میاں کا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے انہیں سمجھایا۔ ’’آپ ان لوگوں سے قطع تعلق نہ کریں۔ کم از کم بچوں کا ہی خیال کرلیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔‘‘

میرے سمجھانے پر وہ راضی ہوگئے۔ اب میری زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ میاں بڑی خوبصورتی سے دونوں بیویوں سے نباہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے نرسنگ کا کورس کروا دیا ہے۔ اب لوگ مجھے ڈاکٹر بہن کہتے ہیں۔ میرے بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ بیٹا نویں اور بیٹی آٹھویں میں پڑھتی ہے۔ دونوں کو شوبز کی دنیا میں آنے کا بہت شوق ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ پہلے یہ تعلیم مکمل کرلیں۔ امین کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی تیسری بیوی اسے کھانا بھی نہیں دیتی۔ وہ ٹھیلوں سے چاول چھولے کھاتا ہے۔ جو میرا دوست تھا، وہ مرگیا۔ منہ بولے بھائی کے بیٹے کا بھی انتقال ہوگیا۔ بہن ابھی تک جادو ٹونے کر رہی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا میاں مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔

جنون

حمود الدین ناز

زیبو کا بچپن بھرپور انداز میں گزر رہا تھا لیکن خوشیوں کی اس سنہری دھوپ پر غم کی بدلی چھا گئی۔ رضیہ کو جانے کیسا روگ لگ گیا کہ وہ آہستہ آہستہ گھلنے لگی۔ دینو نے ہر ممکن کوشش کی، حتیٰ اسے شہر بھی لے گیا مگر کوئی بھی مرض کی صحیح تشخیص نہ کرسکا اور......!

اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز کہانی

زیبو نے جب دینو کے گھر جنم لیا تھا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ جب دائی ماں نے اس ننھی سی جان کو اس کی گود میں ڈالا تو اسے یوں لگا جیسے قدرت نے اسے جہاں کی ساری خوشیاں ننھی زیبو کی صورت اس کی جھولی میں ڈال دی ہوں۔ اس نے جوش و جذبات میں اسے سینے سے لگالیا اور بار بار چومنے لگا۔ سارا گاؤں دینو کے اس والہانہ پن پر نثار ہو رہا تھا۔ آخر یہ سب کیوں نہ ہوتا۔ آج شادی کے بارہ سال بعد اس کے آنگن میں یہ پھول مہکا تھا، دینو نے زیبو کو دائی ماں کی گود میں ڈالا اور صاف ستھرے کلف لگے کپڑے پہن کر چوہدری رحمت کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆

’’سلام چوہدری صاحب!‘‘ دینو کی آواز میں خوشی کی کپکپاہٹ واضح تھی۔

’’وعلیکم السلام! دینو تجھے بہت بہت مبارک ہو۔ اب تو تو خیر سے باپ بن گیا ہے۔‘‘ چوہدری رحمت مسکرا کر بولا تو دینو یوں گڑبڑا گیا جیسے اس کی چوری پکڑ لی گئی ہو۔

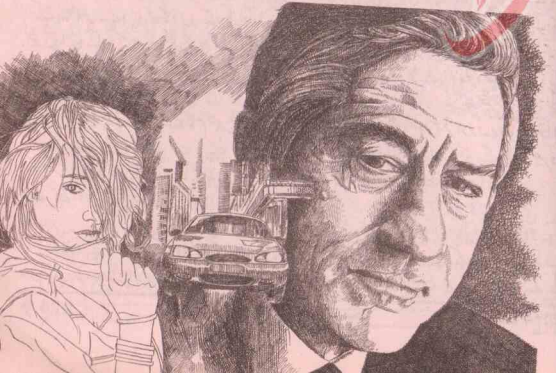

"بس...... سرکار آپ کو کیسے......" دینو حیرت زدہ رہ گیا۔

"ارے دینو! ہم اس علاقے کے زمیندار ہیں۔ ہم سے بھلا کوئی بات کیسی چھپی رہ سکتی ہے۔ اور پھر تو ہمارا مزارع ہے، جا منشی سے پانچ سو روپے لے لینا اور گاؤں بھر میں مٹھائی بانٹ دینا، اور ہاں مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے دھڑک چلے آنا...... سمجھا کہ نہیں۔" چوہدری رحمت مسکرا کر بولا اور دینو حیرت اور خوشی کے جذبات اپنے دل میں سمیٹ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مائی باپ! آپ کے پہلے ہی ہم پر بہت احسان ہیں۔" دینو کی آواز لرزنے لگی۔

"چل اوئے! اب زیادہ باتیں نہ بنا، جا تیری بیوی تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ لے پانچ سو روپے، اب کہاں تو منشی سے پیسے گننے کی خاطر دوڑے گا۔" یہ کہہ کر چوہدری نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دینو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دینو چوہدری کو ڈھیروں دعائیں دیتا ہوا حویلی سے باہر آ گیا۔ ذرا دیر بعد وہ مٹھائی کا ٹوکرا سر پر اٹھائے گاؤں جا رہا تھا۔

دینو کا اصل نام تو دین محمد تھا مگر اس نے ہوش سنبھالتے ہی ماں باپ کے منہ سے خود کو دینو کہتے سنا، اس لیے دین محمد گاؤں کے دیگر لوگوں کی طرح اس کے ذہن سے بھی محو ہو گیا۔ دینو کے ماں باپ بھی چوہدری رحمت کے مزارع تھے۔ اس نے سنا تھا کہ اس کی کئی نسلیں اسی زمین پر آباد رہی ہیں بس چوہدریوں کے نام تبدیل ہوتے رہے۔ چوہدری رحمت سے پہلے چوہدری کرامت اس زمین کا مالک تھا چوہدری کرامت سے پہلے اور شاید یہ سلسلہ کئی نسلوں سے چل رہا تھا۔

دینو اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھی، اس لیے ماں باپ کا سارا پیار سمٹ کر اس کے حصے میں آ گیا تھا۔ دینو بڑا ہوا تو روایت کے مطابق ایک غریب مزارعے کی بیٹی رضیہ کو اس کی بیوی بنا کر اس کے حوالے کر دیا گیا۔ رضیہ سے شادی کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے ماں باپ انتقال کر گئے تو دینو نے رضیہ کے آنچل میں پناہ ڈھونڈ لی۔ رضیہ نے بھی ہر دکھ سکھ میں اس کا ساتھ دیا لیکن ایک دکھ ایسا بھی تھا جس سے دینو کو نکالنا اس کے بس میں نہ تھا اور یہ دکھ اولاد کا تھا۔ شادی کو دسواں سال گزرا تو دینو کی طبیعت میں چڑچڑا پن عود کر آیا۔ گو کہ کبھی اس نے رضیہ کو اس بات کا طعنہ نہ دیا مگر رضیہ اس کی طبیعت کی بے چینی کو شدت سے اپنی روح پر محسوس کر رہی تھی۔ جانے کہاں کہاں اس نے علاج کروایا حتیٰ کہ تعویذ گنڈے بھی کرا لیے مگر رحمت خداوندی جوش میں نہ آئی۔ دینو خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ دسواں سال گزرنے کے بعد اب تو گاؤں کے دیگر بڑوں نے بھی دینو پر دوسری شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا تھا۔ یہ زور شادی کے چوتھے سال سے ہی شروع ہو گیا تھا مگر اب تو اس میں شدت آ گئی تھی دینو جب بھی یہ صورتحال دیکھتا تو اس کا دل کڑھنے لگتا تھا مگر رضیہ سے محبت نے اس کو اس انتہائی اقدام سے باز رکھا۔ شاید اللہ تعالیٰ بھی دینو کو آزما رہا تھا اس لیے شادی کے گیارہویں سال جب دائی ماں نے اس کو اولاد کی خوشخبری سنائی تو ایک لمحے کے لیے تو اسے یقین نہ آیا کہ کیا کرے۔ وہ تو رضیہ پر دل و جان سے فدا ہوا جا رہا تھا۔ رضیہ کا بغیر اجازت پلنگ سے پیر اتارنا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تھا اور رضیہ اس انجانی خوشی اور دینو کے اس ڈھیروں پیار کو پا کر جیسے خوشی سے نہال ہو گئی۔

☆☆☆

شادی کے بارھویں سال جب ننھی زیبو کی وجہ سے دونوں میاں بیوی کے لیے ہر دن عید سے زیادہ خوبصورت تھا، دینو کی چاہت رضیہ کے لیے

اور بڑھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ زیبو ماں، باپ کی محبت کی چھاؤں میں پرورش پانے لگی۔ رضیہ نے کبھی اس سے کوئی غیر ضروری فرمائش نہ کی تھی مگر دینو اس کے باوجود کچھ نہ کچھ رضیہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ جب سے زیبو بڑی ہونے لگی تھی تو دینو نے جیسے زیبو کی ہر خواہش کی تکمیل کو اپنی زندگی کا حاصل بنا لیا تھا۔ ایسے میں چوہدری رحمت نے بھی اس کی بہت مدد کی۔ چوہدری رحمت اور اس کی بیوی زلیخا وقتاً فوقتاً زیبو کے لیے کچھ نہ کچھ دینو کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ زیبو بلا کی حسین اور خوبصورت بچی تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی جا رہی تھی اس کا رنگ روپ نکھرتا جا رہا تھا۔

چوہدری رحمت کی اپنی بیوی زلیخا سے کوئی اولاد نہ تھی لیکن اس بات نے بھی دونوں میاں بیوی کے تعلقات میں فرق نہ آنے دیا۔ شاید اس کی وجہ ایک بڑی جائیداد بھی ہو سکتی تھی جو زلیخا اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی۔ چوہدری رحمت [illegible] اچھا بندہ تھا مگر چوہدریوں والی روایتی کمزوریاں اس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔ شراب اور شباب اس کے لیے ناگزیر تھے۔ گو کہ وہ یہ سب زلیخا سے چھپ کر کرتا تھا مگر اب ایسا بھی نہ تھا کہ زلیخا کو اس کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ چونکہ وہ حالات کا رخ دیکھ رہی تھی، اس لیے اس نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر لی۔ چوہدری رحمت نے اپنی اس کمزوری کو پورا کرنے کے لیے گاؤں سے باہر ایک حویلی بنا رکھی تھی جہاں ہر روز شام میں وہ موجود ہوتا تھا اور رات گئے اپنی حویلی لوٹ آتا تھا۔

☆☆☆

زیبو کا بچپن بھرپور انداز میں گزر رہا تھا لیکن خوشیوں کی اس سنہری دھوپ پر غم کی بدلی چھا گئی۔ رضیہ کو جانے کیسا روگ لگ گیا کہ وہ آہستہ آہستہ گھلنے لگی۔ شاید وہ دینو کو یہ ایک خوشی دینے کے لیے زندہ بچی تھی۔ دینو نے ہر ممکن کوشش کی، کئی حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھایا، حتیٰ اسے شہر بھی لے گیا مگر کوئی بھی مرض کی صحیح تشخیص نہ کر سکا اور آخر ایک دن رضیہ دینو جیسے محبت کرنے والے شوہر اور زیبو جیسی پیاری سی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو بھر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے جا سوئی۔ اس حادثے نے دینو کو جیسے بکھیر کر رکھ دیا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید خود بھی رضیہ کے ساتھ جان دے دیتا مگر اب تو اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی جان زیبو بھی تھی۔ زیبو کی وجہ سے اس نے جینے کا فیصلہ کر لیا۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ وہ جب بھی زمینوں پر ہوتا تو زیبو کو پڑوس میں موجود اپنے دوست رمضان کے گھر چھوڑ دیتا تھا۔ رمضان کی بیوی سلمیٰ زیبو کا اپنی اولاد کی طرح خیال رکھتی تھی۔ کئی بار گاؤں کے بڑوں اور خود رمضان اور اس کی بیوی سلمیٰ نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا تا کہ زیبو کی بہتر انداز میں پرورش ہو سکے مگر دینو تو دوسری شادی کے نام سے ہی خوف زدہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زیبو کو سوتیلی ماں کا عذاب بھگتنا پڑے۔ زیبو کی پرورش کو اس نے بھی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ وہ جب تھکا ہارا گھر پہنچتا تو زیبو کی معصوم باتیں اس کی ساری تھکن اتار دیتی تھیں۔ وہ زیبو کو گود میں بھر کر سرشار ہو جاتا تھا۔

یونہی وقت گزرتا چلا گیا۔ بڑھاپے کی تھکن اس پر غالب آتی جا رہی تھی مگر زیبو کے بہتر مستقبل کی خواہش نے اسے مشین بنا رکھا تھا۔ ایک دن جیسے اس پرسکون زندگی میں ہلچل مچ گئی۔

"بھا دینو! اپنی زیبو سیانی ہو گئی ہے، اب تو اس کی شادی کی فکر کر۔" رمضان کی بیوی سلمیٰ نے ایک دن دینو سے کہا تو دینو چونک پڑا۔

"اچھا! اتنا وقت بیت گیا۔ ہماری زیبو اتنی بڑی ہو گئی ہے۔" دینو حیرت سے بولا تو سلمیٰ مسکرا دی اور پھر تو جیسے دینو کی زندگی کا محور ہی

بدل گیا اب وہ خیالوں میں بھی زیبو کو سرخ جوڑے میں دیکھتا تھا۔

☆☆☆

نہ جانے کیوں اسے اب ہر منظر دلکش محسوس ہوتا تھا۔ ساون کی دوپہروں میں اس کا دل کرتا تھا کہ درختوں پر جھولے ڈال کر خوب اونچی اونچی پینگیں لے۔ اب تو خواب بھی آنے لگے تھے جس میں ایک شہزادہ اس کے پاس آتا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر کہتا۔ ''زیبو! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔'' اور...... اور...... وہ بے طرح شرما جاتی تھی۔ اب تو اس نے خود ہی گھر سے باہر بے ضرورت نکلنا بند کر دیا تھا اور بغیر چادر کے تو وہ گھر سے باہر قدم بھی نہ نکالتی تھی کیوں کہ اسے خود میں ہونے والی تبدیلیوں کا احساس ہو گیا تھا اور کچھ احساس اسے گاؤں کے جوانوں کی نظروں نے بھی دلا دیا تھا لیکن زیبو کو گاؤں کے ان اجڈ گنوار جیسے جوانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے خوابوں کا محور تو وہ انجانا شہزادہ تھا جو ہر روز سپنے میں اس کے پاس آ کر چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کہتا 'زیبو مجھے تم سے محبت ہے۔''

☆☆☆

''اوئے بالے! دینو کی بیٹی کو دیکھا ہے۔ قسم اللہ کی کیا روپ نکالا ہے اس نے۔ کیا ہرنی جیسی آنکھیں کیا......'' فیکا جس کا اصل نام رفیق تھا' بولے جا رہا تھا۔

''اوئے بس بس...... تو تو پورا شاعر ہو گیا ہے...... اگر اتنی ہی پسند ہے تو شادی کا پیغام دے دے۔'' بالا ہنس کر بولا۔

''چھوڑ یار! وہ کہاں ہمیں گھاس ڈالے گی۔ ڈھنگ سے تو بات بھی نہیں کرتی پھر ہم سے شادی کیا خاک کرے گی۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔'' فیکے نے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

''اوئے! تیرے جیسے شیر جوان کو وہ کیوں منہ نہ لگائے گی۔ تو دینو سے بات کر کے تو دیکھ میرا خیال ہے دینو مان جائے گا۔'' بالا اطمینان سے بولا۔

''نہیں بالے! دینو تو وہی کچھ مانتا ہے جو زیبو چاہتی ہے اور زیبو مجھ سے بھی......'' فیکے نے کچھ کہنا چاہا۔

''یار تو تو ہر مسئلے میں ناں ضرور کرتا ہے۔ تو دینو سے بات کر کے تو دیکھ۔ دینو نے ساری عمر کیا اپنی بیٹی کو شوکیس میں سجا کر رکھنا ہے اور اگر دینو نے انکار کر دیا پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔'' بالا فیکے کے ہاتھ سے بیڑی چھین کر کش لگاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

''بیٹی زیبو! ادھر آ......'' دینو نے زیبو کو آواز دی۔

''ابھی آئی ابا!'' زیبو نے باورچی خانے سے آواز دی پھر روٹی کی چنگیری کو کپڑے سے ڈھانپ اور کھانا اٹھا کر دینو کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

''یہاں بیٹھ جا۔ مجھے تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔'' دینو نے اپنے پاس جگہ بناتے ہوئے کہا۔

''ابا تو سکون سے کھانا کھا لے۔ پھر آرام سے باتیں کر لینا۔'' زیبو مسکرا کر بولی تو دینو جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد زیبو برتن باورچی خانے میں رکھ کر دینو کے پاس آ بیٹھی۔

''ہاں ابا! اب بول وہ کیا بات ہے جس کے لیے تو اتنی جلدی میں ہے۔'' زیبو دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

''بیٹی! ہر ماں باپ پر یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ جب بیٹی جوان ہو جائے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ بیٹا اب تو سیانی ہو گئی ہے۔ اب تیرے بھی ہاتھ پیلے ہو جانا چاہئیں۔'' دینو ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا تو زیبو بول پڑی۔

''ناں ابا! میں نے ابھی نہیں کرنا شادی وادی ابھی تو میں تیری خدمت کروں گی۔'' زیبو جلدی سے بولی۔

''اوہو بیٹا! بیٹی کی شادی بھی ماں باپ کی خدمت ہے اور پھر شادی کے بعد بھی تو تو شوہر کے ساتھ مل کر میری خدمت کر سکتی ہے۔'' دینو ہنس کر بولا۔

''ناں ابا! بس میں نے ابھی نہیں کرنا شادی۔'' زیبو مچل گئی۔

''دیکھ زیبو! کل مجھے فیکے کا ابا ملا تھا وہ چاہتا ہے کہ تو اس کی بہو بن جائے۔'' دینو نے کہا۔

''ناں ابا' میں نے کہہ دیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی اور...... اور فیکے سے تو بالکل نہیں وہ......'' وہ کہتے کہتے رک گئی مگر دینو کی سمجھ میں سب کچھ آ چکا تھا' اس لیے خاموشی سے اٹھ گیا۔ زیبو فیکے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کے گاؤں کا لڑکا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے لاڈ نے اسے بالکل بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر برائی اس کے اندر موجود تھی۔ یہ ایسی بات نہ تھی کہ زیبو تک نہ پہنچتی اس لیے اس نے فیکے سے شادی کے لیے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

''بالے! میں نے کہا تھا ناں کہ سالی نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔ کل میرے ابا نے دینو سے بات کی تھی۔ دینو نے بیٹی سے پتا کرنے کے بعد ابا کو صاف جواب دے دیا۔'' فیکا غصے میں کھول رہا تھا۔

''اوئے فیکے! تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ تیرے یار ابھی مرے تو نہیں ہیں ناں۔ تو فکر نہ کر۔ کر لیں گے ہم تیری رانی کا بندوبست۔ چل شاباش ذرا ٹکڑی تو نکال۔'' بالے نے سگریٹ میں سے تمباکو نکالتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر سگریٹ میں چرس بھرنے لگے۔

☆☆☆

''اوئے کریمے! اتنے دن ہو گئے کوئی موج میلا نہیں ہوا۔ کیا تو صرف بیٹھ کر ہی کھاتا رہے گا۔'' چوہدری رحمت آج کافی دنوں بعد گاؤں سے باہر والی حویلی پہنچے تھے۔

''ج ج...... جی سرکار! آپ حکم تو کریں۔ آپ ہی کافی دنوں سے حویلی نہیں آئے ہیں۔'' کریما گھگھیا کر بولا۔

''ہاں...... چوہدرانی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل کوئی بندوبست کر۔'' چوہدری رحمت مسکرا کر بولے تو کریما فوراً کمرے سے نکل گیا ذرا دیر بعد ہی وہ ایک ٹرے میں ولایتی شراب کی بوتل رکھے حاضر ہوا۔

''اوئے کریمے! خالی بوتل تو رگوں میں انگارے بھر دے گی۔ کچھ اور ہونا چاہیے۔'' چوہدری رحمت آنکھ دبا کر کریمے کو ایک واہیات سا اشارہ کر کے بولے تو کریمے نے بے حیائی سے دانت نکال دیے۔

''ہاں ہاں سرکار! کیوں نہیں۔'' کریما چوہدری رحمت کے قدموں میں جا بیٹھا۔

''لیکن کریمے اب کے مال نیا ہونا چاہیے۔ سمجھ رہا ہے ناں بات کو۔'' چوہدری رحمت جام بناتے ہوئے بولے۔

''ہاں چوہدری صاحب! ابھی ایک لڑکی ہے میری نظر میں۔ دینو کو جانتے ہیں ناں آپ' اس کی بیٹی ہے زیبو۔ سرکار غضب کی چیز ہے۔ آپ دیکھیں گے تو...... سرکار آگے کیا کہوں۔'' کریما آہستہ سے بولا۔

''اوئے سوچ لے' کوئی پھڈا نہ پڑ جائے۔ دینو ہمارا خاص مزارع ہے۔'' چوہدری رحمت کچھ پریشان لہجے میں بولے۔

''اوہو چوہدری صاحب! پہلے کوئی مسئلہ ہوا ہے کیا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ زبان بند کرنے کے طریقے ہمیں آتے ہیں۔'' کریما مسکرا کر بولا تو چوہدری نے اطمینان سے گردن ہلا دی۔

چوہدری رحمت کی یہ حرکتیں اب حد سے تجاوز کرنے لگی تھیں۔ اب تو بات غریب مزارعوں تک آ پہنچی تھی۔ اس معاملے میں کریما ان کا دست راست تھا۔ غریب مزارعوں کی بیٹیوں کو گاؤں سے باہر حویلی میں بلایا جاتا تھا جہاں چوہدری رحمت ان کی عزت سے کھیلتا تھا اور پھر دھونس دھمکیوں سے ان کی زبان پر تالے ڈال دیے جاتے تھے۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا تھا اور اب تک پانچ مزارعوں کی بیٹیاں چوہدری رحمت کی ہوس کا شکار ہو چکی تھیں اور اب چھٹا شکار زیبو تھی۔

☆☆☆

''بالے! کوئی ترکیب نکال۔ یار ایسا نہ ہو وہ ہاتھ سے نکل جائے۔'' فیکا بالے کو جھنجوڑ کر بولا۔

''اچھا اچھا! سوچتے ہیں۔'' بالے اطمینان سے بولا۔

''اب سوچنے کا وقت گزر گیا۔ اب کام کا وقت ہے۔ تو مجھے مشورہ دے۔'' فیکا بالے کے اطمینان سے سلگ اٹھا۔

''ایک طریقہ ہے۔'' بالا خلا میں کہیں گھورتے ہوئے بولا۔

''بول جلدی بول۔'' فیکا جلدی سے بولا۔

''ایسا کر کل جب وہ دینو کا کھانا لے کر کھیتوں میں جائے تو تو اسے راستے میں روک لے اور کہہ دے کہ تو اس سے محبت کرتا ہے۔ بس۔'' بالا آہستہ سے بولا۔

''بس! ناممکن، وہ کبھی نہ مانے گی۔ میں جانتا ہوں اسے۔ وہ الٹا مجھ پر چڑھائی کر دے گی، اور کوئی ترکیب بتا۔'' فیکا جلدی سے بولا۔

''تو یار اس کا ایک بالکل آسان حل ہے۔ زیبو کو اٹھا لیتے ہیں پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' بالا اطمینان سے بولا۔

''اوئے کہیں کوئی پسوڑی نہ جائے۔'' فیکا ذرا گھبرا کر بولا۔

''واہ میری جان۔ تو تو یوں گھبرا رہا ہے جیسے یہ تیرا پہلا کام ہے۔ ابے سب جانتا ہوں میں تیرے بارے میں۔'' بالا قہقہہ لگا کر بولا۔

''بالے! زیبو ذرا وکھرے ٹائپ کی لڑکی ہے سوچ لے۔'' فیکا مسکرا کر بولا مگر گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''اوئے سارا وکھرا پن نکل جائے گا۔ ابھی میں جا رہا ہوں۔ اگر تیرا من کرے تو مجھے بلوا لینا پھر پروگرام بنا لیں گے۔'' بالا بے دلی سے بولا۔

''اوئے یار تو تو ناراض ہو گیا۔ چل اب مان جا ایسا کرتے ہیں کہ ایک ہفتے بعد کا پروگرام رکھ لیتے ہیں کیوں کہ ابھی تو دینو نے رشتے سے انکار کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زیبو کے اغوا کا شک ہم پر جائے۔ سمجھ رہا ہے ناں بات کو۔'' فیکا مسکرا کر بولا تو بالا بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

''سلام چوہدری صاحب!'' زیبو نے جب چوہدری رحمت کو سلام کیا تو وہ چونک گئے اور پھر وہ جیسے سب کچھ بھول گئے۔ کیا حسن تھا وہ۔ لانبا قد لچکیلی شاخ کی طرح بل کھاتا ہوا سرخ و سفید بدن، رنگ ایسی کہ یوں محسوس ہو جیسے اگر چھو کر دیکھا تو میلی ہو جائے گی۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں سلیقے سے لگا کاجل۔ گھنیرے سیاہ بال، چھوٹی سی نازک ناک اور انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹ۔

''جی چوہدری صاحب! آپ نے بلایا تھا۔'' زیبو چوہدری رحمت کی محویت دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

''آں...... ہاں...... وہ...... دراصل...... دیکھ زیبو...... ادھر آ...... میرے پاس آ کر بیٹھ۔'' چوہدری رحمت کو جب لفظ نہ ملے تو اس نے ایک اور حربہ آزمایا۔ چوہدری رحمت کے حکم سے انکار کی ہمت کس میں تھی، اس لیے زیبو خاموشی سے

چوہدری کے برابر جا بیٹھی۔ چوہدری رحمت جو زیبو کے حسن سے پہلے ہی گھائل ہو گیا تھا یوں زیبو کے پاس آ کر بیٹھنے پر تو جیسے بے ہوش سا ہونے لگا۔ اتنا مکمل حسن اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور وہ بھی اتنے قریب سے۔

''زیبو...... تیرے کپڑے کتنے سستے سے ہیں۔ تیرے پاس تو کوئی چیز بھی ڈھنگ کی نہیں ہے۔'' چوہدری رحمت کے ہاتھ زیبو کے بدن پر رینگنے تو زیبو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چوہدری صاحب! یہ...... یہ...... آپ کیا کر رہے ہیں۔'' زیبو حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے بولی۔

''زیبو! میرا دل کرتا ہے کہ تجھے مالا مال کر دوں۔ تجھے سونے سے لاد دوں...... تجھے......'' چوہدری رحمت ترنگ میں بولا۔

''ناں چوہدری صاحب! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کا شکریہ۔ اب میں چلتی ہوں۔'' زیبو مڑتے ہوئے بولی۔

''زیبو! مجھ سے شادی کرے گی۔'' نہ جانے کیسے ایک لمحے میں چوہدری رحمت نے فیصلہ کر لیا۔

''چوہدری صاحب! یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' زیبو پریشانی سے بولی۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ چوہدری کی اس بات پر حیرت کا اظہار کرے یا غصے کا۔

''زیبو! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تو مجھ سے شادی کر لے۔''

''میں تجھے خوش کر دوں گا۔'' چوہدری تو جیسے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس وقت زیبو کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت چوہدری کو صاف انکار کر دیتی تو شاید اسے محفوظ گھر پہنچنے کی حسرت ہی رہ جاتی کیوں کہ اسے یہاں آ کر چوہدری کی فطرت کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ آخر کو وہ ایک عورت تھی اور ایک عورت مرد کی نظر بہت اچھی طرح پہچانتی ہے۔

''چوہدری صاحب! آپ کی بیوی موجود ہے اور میں کسی عورت پر سوکن نہیں جا سکتی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں۔'' زیبو نے پتا پھینکا تو ایک لمحے کے لیے چوہدری کو سانپ سونگھ گیا۔

''وہ...... وہ...... دراصل...... دیکھ زیبو...... تجھے تو پتا ہے تیری چوہدرانی کتنا بیمار رہتی ہے اوپر سے بڑھاپا بھی ہے۔ اس کو تو اپنی بیماری سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ میرا خیال کیا خاک رکھے گی۔'' چوہدری مسکین سی صورت بنا کر بولا تو زیبو کا دل چاہا کہ ایک زوردار تھپڑ چوہدری کے منہ پر دے مارے اور پوچھے کہ تو اب کون سا جوان رہا ہے۔ تیرا مقصد کون سا خیال رکھوانا ہے۔ تجھے تو عیاشی کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ وہ یہ سب کچھ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ اس سے زیادہ اس کے بس میں نہ تھا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس وقت وہ چوہدری کے شکنجے میں تھی اور اس شکنجے سے آزادی کے لیے اسے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا تھا۔

''اچھا چوہدری جی! میں سوچ کر جواب دوں گی۔'' زیبو آہستہ سے بولی تو چوہدری رحمت کے ہونٹوں پر سارے جہاں کی خباثت مسکراہٹ کی صورت میں ناچنے لگی۔

☆☆☆

زلیخا بیگم کی موت گاؤں کے کسی بھی فرد کے لیے غیر متوقع نہ تھی۔ زلیخا بیگم گزشتہ پانچ سالوں سے بیمار تھیں بلکہ اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جو انہیں دیکھتا ان کی مشکل آسان ہونے کی دعا کرتا تھا اور پھر شاید اللہ تعالیٰ نے یہ دعائیں سن لیں اور ان کی مشکل آسان ہو گئی۔ میاں بیوی زندگی بھر کے ساتھی ہوتے ہیں۔ انسیت تو انسان کو جانور

سے بھی ہوجاتی ہے جو چند ماہ ساتھ رہتا ہے۔ زلیخا بیگم تو پھر بھی انسان تھی۔ ان کی جدائی کا اثر چوہدری رحمت پر بھی ہوا مگر وہ مرد ذات تھا اس لیے کچھ ہی عرصے میں وہ سب بھول بھال گیا اور اپنے پرانے شدت سے محسوس ہوتی تھی' وہ چاہتا تو زیبو کو اٹھوا کر اس کی عزت کو داغ لگا سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے زیبو کے لیے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے درد کا سا احساس ہوتا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی معصوم کہ دیکھنے والے کا دل کرتا تھا کہ اس نازک سی گڑیا کو اپنے من مندر میں بٹھا کر اس کی پوجا کرے۔ چوہدری بھی اس کی پوجا کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

''میری رانی...... کہاں چلی گئی...... ادھر سن تو۔'' فیکا اچانک راستے میں آیا تو زیبو کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دینو کو کھانا دینے کھیتوں میں جارہی تھی کہ اچانک فیکے نے اس کا راستہ روک لیا زیبو نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

''فیکے! میرا راستہ چھوڑ دے۔ ابا کھانے کا انتظار کررہا ہوگا۔'' زیبو جلدی سے بولی اس کے لہجے میں سختی عود کر آئی تھی۔

''اور ہم جو اپنی رانی کا یہاں صبح سے کھڑے انتظار کررہے ہیں۔'' فیکا لوفرانہ انداز میں بولا تو زیبو کا خون کھول اٹھا۔

''فیکے شرافت سے میرا راستہ چھوڑ دے ورنہ......'' زیبو نے دھمکی دی مگر اسے اپنے الفاظ خود کھوکھلے سے محسوس ہوئے۔

''ورنہ!...... ورنہ کیا ہوگا میری رانی۔'' فیکا اس کے ورنہ سے محظوظ ہوتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

''فیکے! دیکھ میں شرافت سے کہہ رہی ہوں۔ دیکھ۔'' زیبو فیکے کو قریب آتا دیکھ کر گھبرا کر بولی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

''ارے کہاں چلی میری جان! اپنے چاہنے والے کو یوں چھوڑ کر جارہی ہے۔'' فیکے نے آگے بڑھ کر زیبو کا بازو پکڑ لیا۔ زیبو کے لیے یہ برداشت سے باہر تھا وہ بپھری ہوئی ناگن کی طرح پلٹی اور اس کا ہاتھ فیکے کے گالوں پر سرخ نشان چھوڑ گیا۔ چٹاخ کی آواز ابھری اور پھر معدوم ہوگئی۔

''بہت غرور ہے تجھے خود پر۔ آج میں تجھے بتاؤں گا کہ فیکا ہے کیا چیز!'' فیکے نے کہا اور زیبو کو اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔ ایک لمحے کے لیے تو زیبو فیکے کا یہ ردعمل دیکھ کر سناٹے میں رہ گئی پھر جب اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا مگر چیخ اس کے حلق میں ہی ڈوب گئی۔ بالے کا سخت ہات اس کے منہ پر تھا۔ وہ ہاتھ پیر مارنے لگی مگر کہاں ایک کمزور لڑکی اور کہاں دو توانا مرد' اس کی مدافعت بھی کمزور پڑنے لگی اور جب انسان بہت مجبور ہوجائے تو آنسو ہی اس کا واحد سہارا رہ جاتے ہیں زیبو بھی رودی مگر ان سنگ دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ زیبو کو یوں بے بسی سے رونے سے انہیں طمانیت کا احساس ہونے لگا' جوار کی قد آدم فصل تیار تھی اس لیے کسی کو اس سانحے کا علم نہ ہوسکا۔ فیکا اور بالا زیبو کو گاؤں سے دور ایک کھنڈر میں لے آئے جو شاید کسی مندر کی باقیات تھا۔ یہاں آکر اس شیطانی کھیل کا آغاز ہوگیا جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ زیبو گڑگڑاتی رہی روتی رہی مگر وہاں کون اس کی سننے والا تھا۔ وہ دونوں کو اللہ' رسول کے واسطے دیتی رہی مگر وہ نہ مانے۔ اس نے مدافعت کرنا چاہی مگر دو جوان مردوں کے آگے ایک کمزور سی لڑکی کی مدافعت کیا معنی رکھتی تھی۔ فیکا اور بالا شیطان بن گئے تھے۔ وہ اس کے جسم کو بھنبھوڑ رہے تھے لیکن اچانک زیبو کی آہیں رک گئیں' اس کے آنسو رک گئے اور جب آنسو بہنا چھوڑ دیں تو وہ آنسو اندر ہی اندر دل پر گرنے لگتے ہیں جو ایک طوفان کو جنم دیتے

ہیں۔ زیبو کے آنسو بھی اس کے دل پر گر رہے تھے جب شیطانیت کا کھیل ختم ہوا تو ان درندوں کو انجام کی فکر ستانے لگی۔

''دیکھ زیبو! اگر تو اپنے باپ کی زندگی چاہتی ہے تو اس ساری بات کو بھول جانا جو یہاں ہوئی ہے ورنہ......'' فیکا مسکرا کر بولا مگر زیبو کے کان بھلا کہاں اس کی بات سن رہے تھے۔ اس کے تو کانوں کے ساتھ ساتھ بدن بھی سن ہوچکا تھا۔ بس تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک دبی دبی سی آہ اس کے ہونٹوں سے خارج ہوجاتی تھی جو اس کے وجود میں زندگی کی حرارت کا پتا دیتی تھی۔ پتا نہیں سانس کی یہ ڈور بھی اب تک کیوں سلامت تھی ورنہ تو سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ فیکا اور بالا خاموشی سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے کافی دیر بعد تک وہ بے ہس و حرکت پڑی رہی پھر اپنے شکستہ اور بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ کر سنبھلتی ڈگمگاتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی۔

☆☆☆

''بول زیبو! آج میں تیرا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔ دیکھ میں کتنا تنہا ہوں۔ زیبو میری بات مان جا۔'' چوہدری رحمت جیسے رو دینے کو تھا۔ زیبو کی گردن بے اختیار اثبات میں ہلنے لگی' اب اس کے پاس بچا بھی کیا تھا جس پر وہ ناز کرتی۔ وہ تو ایک عام سی لڑکی سے بھی گئی گزری تھی یہ تو بہت بڑی بات تھی کہ اسے گاؤں کے چوہدری شادی کا پیغام دے رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ چوہدری کو اپنے اوپر گزرنے والے طوفان کی خبر دے' اسے بتائے گی کہ فیکے اور بالے نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے مگر وہ خاموش رہی اور جب ایک دن زیبو خاموشی سے چار لوگوں کی موجودگی میں چوہدری رحمت کی دلہن بنی تو بوڑھے دینو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے تو کبھی یہ نہ چاہا تھا کہ اس کی پھول جیسی بچی کی شادی ایک بوڑھے آدمی سے ہو مگر اب وہ کیا کرسکتا تھا جبکہ زیبو بھی اس رشتے پر خوشی سے راضی تھی۔

☆☆☆

زیبو کی چوہدری سے شادی کی خبر سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اب زیبو کا نام زیبو نہیں چوہدرانی ہوگیا تھا۔ بالا اور فیکا ایک درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

''یار بالے! مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں زیبو چوہدری کو نہ بتادے۔'' فیکا کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

''اوئے پاگل ہوگیا ہے تو! اب وہ کسی کو کچھ نہیں بتاسکتی۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ خود جانتی ہے کہ چوہدری رحمت اسے حویلی سے باہر لا پھینکے گا۔ ارے میں تو کہتا ہوں زیبو ٹھیک لڑکی ہے ہی نہیں' اس نے چوہدری کو پھانس لیا ہے۔ وہ چوہدرانی بن چکی ہے ورنہ تو خود بتا کہ زیبو تو چوہدری سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ اب اس بوڑھے کھوسٹ میں سوائے دولت کے اور بچا ہی کیا ہے۔'' بالا ہنس بولا تو فیکے کے دل سے خوف بھاپ بن کر نکل گیا۔

☆☆☆

''فیکے مجھے تجھ سے بہت ضروری بات کرنا ہے مجھے چوہدرانی نے بھیجا ہے۔ کل رات دو بجے تم اور بالا دونوں حویلی آجانا۔ چوہدری صاحب رات بارہ بجے تو سو جاتے ہیں۔'' بشیرن آہستہ سے فیکے سے بولی تو بالے کا چہرہ کھل اٹھا۔ بشیرن حویلی کی پرانی ملازمہ تھی۔

''اوئے...... اوئے فیکے! میں نہ کہتا تھا۔'' بالے نے کہنا چاہا۔

''اچھا اچھا اب بس کر۔ جاؤ بشیرن! ہم آجائیں گے۔'' فیکے کی آنکھوں میں زیبو کا سراپا گھوم گیا۔ لذت کی ایک لہر سی ان کے وجود میں اٹھی۔ بشیرن اجازت لے کر باہر نکل گئی۔

"واہ بھئی واہ! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ وہ اس بوڑھے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ اب سوچ! وہ ایک جوان لڑکی ہے اور چوہدری کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی ہے۔ اب کیا وہ......" بالے کے ہونٹوں نے ایک واہیات سا جملہ اگلا اور پھر دونوں خیال ہی خیال میں اگلی رات کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔

☆☆☆

وہ سامنے دیوار کو تک رہی تھی۔ چوہدری رحمت اس کے پہلو میں بے دم سا پڑا سو رہا تھا' اس نے ایک نظر چوہدری پر ڈالی اور پھر اپنی نظریں پھیر لیں۔ اس کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو دو بجانے والی تھی' اچانک گھڑی نے دو بجنے کا اعلان کیا تو اس نے ایک نظر چوہدری پر ڈالی اور ایک چادر سے خود کو اچھی طرح لپیٹ کر باہر آ گئی سامنے اسے دو ہیولے کھڑے نظر آئے۔

"فیکے اور بالے! آ گئے تم لوگ۔" زیبو آہستہ سے بولی تو فیکا آگے بڑھ آیا۔

"ہاں جان من! ہم آ گئے ہیں۔ چلو کس کمرے میں چلنا ہے۔" فیکا جذبات سے مخمور لہجے میں بولا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" زیبو آہستہ سے بولی پھر انہیں لیے ایک کمرے میں چلی آئی۔

"بیٹھو فیکے۔" زیبو آہستہ سے بولی۔

"ارے چھوڑ زیبو بیٹھنے کو۔ کوئی کام کی بات کر۔"

بالے کے ہاتھ زیبو کی طرف بڑھے مگر اچانک ہی زیبو کا ہاتھ اٹھا اور حویلی کے سناٹے میں ایک زوردار تھپڑ کی آواز گونج اٹھی۔

"زے...... زے...... زیبو...... یہ کیا کر رہی ہے۔" بالا اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔

"کتے! کمینے! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہیں رنگ رلیاں منانے کے لیے بلایا ہے۔ کتو! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے یونہی چوہدری کے بوڑھے جسم کو اپنے جوان اور خوبصورت جسم کی بلی نہیں دی تھی۔ میرے جسم کا رواں رواں انتقام کی آگ میں جھلس رہا ہے اور یہ سب ایسے ہی ممکن نہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ انتقام کیا ہوتا ہے۔" زیبو چلانے لگی اور وہ دونوں پے در پے صدمات سے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ خالی خالی نظروں سے زیبو کو تک رہے تھے۔ زیبو بری طرح چیخ رہی تھی ایسے میں چوہدری گھبرایا ہوا کمرے میں آ پہنچا۔

"ارے زیبو! کیا ہو گیا تجھے۔ کیا ہوا تجھے۔ اور کون ہیں یہ۔" چوہدری رحمت زیبو کو چلاتا دیکھ کر پریشانی سے بولا' ایسے میں ایک خیال بالے کے ذہن میں لپکا۔

"چوہدری صاحب! دراصل بات یہ ہے۔" بالے نے کہنا چاہا۔

"اوئے بکواس نہ کر! دیکھ نہیں رہا کہ چوہدرانی کی طبیعت خراب ہے اور...... اور یہ تم دونوں اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو۔" چوہدری زیبو کو سنبھالتے ہوئے دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"چوہدری صاحب! آج چوہدری خاندان کی عزت کا جنازہ نکل گیا ہوتا۔ چوہدری صاحب آج میری عزت لٹ گئی ہوتی۔ یہ دونوں کمینے یہاں چھپے بیٹھے تھے میں جیسے ہی پانی پینے باہر آئی' انہوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے اور...... اور...... انہوں نے میرے ساتھ۔" زیبو پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو چوہدری کا خون کھول اٹھا اور آنکھیں غصے سے شعلے برسانے لگیں۔

"اوئے کتو! حرامیو! میرے ٹکڑوں پہ پلنے والو! اوئے تم نے میری ہی عزت پر ڈاکا ڈالنا

چاہا۔" چوہدری رحمت بپھر کر بولا تو بالا اور فیکا چوہدری کے قدموں میں جا گرے۔

"چوہدری صاحب! یہ سب جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے یہ۔ ہمیں چوہدرانی نے خود بشیرن سے بلوایا تھا کہ رات میں آ جاؤ۔" بالا گھبرا کر بولا۔

"اوئے میں تجھے بتاؤں گا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔" چوہدری رحمت تیزی سے دیوار پر لگی اپنی رائفل کی طرف لپکا۔ بالے اور فیکے نے چوہدری کو اس حالت میں دیکھا تو گھبرا کر زیبو کے قدموں میں جا گرے۔

"ناں ناں! چوہدری صاحب یہ ناں کریں۔ ان کتوں کے لیے صرف چند لمحے کی اذیت ہی کافی نہیں ہے۔ شیدے...... تیرے کتے کب سے بھوکے ہیں۔" زیبو بلند آواز سے بولی تو شیدا جو یہ ہنگامہ سن کر وہاں آ کھڑا ہوا تھا' آہستہ سے زیبو کے پاس آ گیا۔ فیکے اور بالے کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

"ناں...... ناں...... چوہدرانی جی! ہمیں معاف کر دو خدا کے واسطے۔" فیکا دہشت زدہ آواز میں چیخا۔

"نہیں فیکے! تم لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرو گے۔ شیدے! اپنے کتوں کو مزید دو روز تک بھوکا رکھو اور تیسرے دن ان کے لیے غذا کا انتظام موجود ہے۔" زیبو قہقہہ لگا کر بولی۔ فیکا اور بالا چیختے چلاتے رہے مگر محافظ انہیں باہر لے جا چکے تھے۔ دو دن بعد بھوکے کتے بھیڑیے بنے بالے اور فیکے کو بھنبھوڑ رہے تھے اور زیبو یہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ کب تک کوئی زیبو ان بالوں اور فیکوں کے انتقام کے لیے یوں کسی قبر رسیدہ کی سیج کی زینت بن کر اپنی جوانی لٹاتی رہے گی۔

❖......❖......❖

مشترک

آج میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں آپ سے شادی کر کے خوش نہیں ہوں۔" بیوی نے کہا۔

"چلو! ٹھیک ہے۔" شوہر نے جواب دیا۔ "ہم میں ایک بات تو مشترک نکلی۔"

ابا حضور

ایک شخص گھر میں بیٹھا گانا گا رہا تھا۔ اس کی بیگم نے اس کو گاتے دیکھ کر کہا۔ "تم کیا گا سکتے ہو، اگر گانا سننا ہے تو میرے ابا حضور کا سنو۔ وہ جب گاتے ہیں تو اڑتے پرندے گر جاتے ہیں۔"

شوہر نے کہا۔ "تمہارے ابا حضور منہ میں کارتوس رکھ کر گاتے ہیں؟"

مشورہ

ایک جج نے وکیل سے کہا کہ "اگر وہ چاہے تو ملزم کو عدالت سے علیحدہ جا کر بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وکیل اکیلا واپس آیا تو جج نے پوچھا۔ "ملزم کہاں ہے؟"

وکیل نے کہا۔ "وہ بھاگ گیا ہے...... میں اسے اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔"

ہدایات

پیرس کی ایک سڑک کے کنارے گاڑی آہستہ چلانے کی ہدایات اس طرح درج تھیں۔

"گاڑی آہستہ چلائیں اور اس شہر کی خوب صورتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ گاڑی تیز چلائیں اور شہر کی جیلیں دیکھیں۔"

احساس کی قید

خوف، دہشت اور تجسس کے مارے ایک شخص کی کہانی ---- جس کو یقین تھا کہ اس کی موت اس کی پیدائش والے دن ہی آئے گی۔

سیدہ عطیہ زاہراہ

ایک پُر اسرار لڑکی کی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

محاورے بنانے والے بھی کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ میرا لنگوٹیا یار تھا۔ جب یاری کا دور آتا ہے تو لنگوٹی کون باندھتا ہے۔ خیر ہشام اور فیصل بھی لنگوٹیا یار تھے۔ بچپن کی دوستی بڑی پائیدار ہوتی ہے۔ چنانچہ پانچ سال کے بعد جب فیصل ہشام کو ملا تو ہشام اسے بڑے پیار سے گھر لے آیا۔ یہ ایک بارش بھرا دن تھا اور اس وقت رات کو بھی کھلی بارش ہو رہی تھی۔ ہشام کی دوسری نویلی بیوی اوپری منزل میں سو رہی تھی۔

فیصل کو دیکھ کر ہشام حیران رہ گیا تھا۔ تروتازہ، سرسبز شاداب رنگیلا فیصل سوکھ گیا تھا۔ زندگی سے بھرپور فیصل کی یہ کیفیت ہشام کے لیے بڑی حیرت ناک تھی۔ لیکن اس کے پس منظر میں جو کہانی فیصل نے سنائی وہ بھی کم حیرت ناک نہیں تھی۔ فیصل گاؤں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں سے ہشام اسے اپنے گھر لایا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر فیصل نے اسے بتایا۔

''بالکل غیر اختیاری طور پر میں نے اپنے کرائے دار امداد خاں کے گھر اس لڑکی کو بے لباس دیکھ لیا تھا، جس کے سینے پر مجھے ایک گولی کا نشان نظر آیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا اور اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئیں۔ میں وہاں سے بھاگ گیا۔ لیکن اس کے بعد میں بے سکون ہو گیا۔ مجھے وہ لڑکی ہر وقت نظر آنے لگی۔ آنکھیں بند کرتا تو اس کی شعلہ بار آنکھیں گھورتی نظر آتیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی بے حد حرمتی کا بدلہ لینا چاہتی ہو۔ پھر ایک دن میں اپنی خالہ کے گھر گیا۔ خالہ بیمار تھیں۔ میری خالہ زاد بہن انیلا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ شاذ یہ مجھ سے پیار کرتی تھیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ انیلا جوان تھی اور میرا ذہن کبھی کبھی اس کے لیے بھٹک جاتا تھا۔ خالہ کے گھر جب میں کھانے کے بعد سونے کے لیے آیا تو میرا بستر برآمدے میں بچھا ہوا تھا چھوٹے سے آنگن میں چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میں ایک سگریٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ کمرے میں خالہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر انیلا کی چارپائی تھی۔ میں نے کروٹ بدل کر کھلے ہوئے دروازے سے اسے دیکھا تو میرے دیکھنے کا انداز بدل گیا، میں کیا بتاؤں، جب سے میں نے دروازے کے شگاف سے اس حسینہ کو دیکھا تھا تب سے یہ حالت تھی کہ ہر نوجوان لڑکی ملبوس ہونے کے باوجود میرے تصور میں لباس سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ میں غیر شعوری طور پر سینے کے اس سیاہ داغ کو تلاش کرتا تھا اور جب اس سیاہی سے دو آنکھیں گھورنے لگتیں تو میں فوراً ہی گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا۔

مگر داغ اجلے چاند پر یا گورے بدن پر نمایاں ہوتا ہے اور انیلا گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ اس لیے وہاں کوئی داغ نمایاں نہیں ہو سکا، میں اس کے جسم کے سانس لیتے ہوئے نشیب و فراز میں گم ہو گیا۔ اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں آنکھوں سے گناہ گار بن رہا ہوں۔ کیونکہ ان آنکھوں کا پہلا گناہ اتنا سنگین تھا کہ اس کے پیشِ نظر ملبوس انیلا کو دیکھتے ہوئے قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ معمولی سی جرات دید بھی گناہ میں شامل ہو سکتی ہے۔

اتنے میں اس نے کروٹ لی۔ چارپائی کراہنے لگی۔ پھر اس نے میری جانب دیکھا یک بیک میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ اس اجنبی حسینہ کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ بستر انیلا کا تھا۔ وہ جسم بھی اور وہ چہرہ بھی انیلا کا تھا۔ مگر وہ آنکھیں انیلا کی نہیں تھیں۔ دروازے کے شگاف سے نکل کر انیلا کے چہرے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں اور مجھے غرا کر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کروٹ لیٹے رہنا میرے لیے محال ہو گیا۔ میں کروٹ بدل کر آنگن میں پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھنے لگا۔

اجلی ٹھنڈی چاندنی میں وہ آنکھیں گم ہو گئیں۔ مگر ذرا دیر کے لیے پھر جیسے ہی چاند بدلی میں چھپنے لگا اور ملگجا سا اندھیرا پھیلنے لگا مجھے کسی کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی اسی کے ساتھ ایک پراسرار سرگوشی ابھری۔

''فیصل!''

''ارے باپ رے۔'' میں اچھل کر چارپائی کی پائینتی چلا گیا اور سرہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ انیلا تھی۔

میرے اس طرح خوف زدہ ہو کر اچھل پڑنے سے انیلا بھی سہم گئی تھی۔ اس نے کمرے کی جانب دیکھا کہ کہیں خالہ نہ اٹھ گئی ہوں۔ وہ بے چاری بدستور گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ میرے دہشت زدہ ہونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ میں بھلا کیا جواب دیتا۔ ایک عورت کے سامنے اپنی کمزوری کیسے ظاہر کرتا۔ مجھے اپنی خفت مٹانے کا یہی ایک راستہ نظر آیا کہ میں پوری مردانگی سے اس پر چھا جاؤں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور ہمیشہ میری بن کر رہنے کے خواب دیکھتی ہے۔

صبح ہونے سے پہلے وہ اپنے بستر پر چلی گئی اور میں تھکے ہوئے کھلاڑی کی طرح نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ایسی گہری نیند آئی تھی کہ دن کے ایک بجے

آنکھ کھلی۔ خالہ اپنی چارپائی پر بیٹھی مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا اور ان کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ ان سے باتیں کرنے کے دوران میں انیلا کو بھی کنکھیوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ صبح ہی غسل سے فارغ ہو کر لباس بدل چکی تھی۔ اس کلی میں ایسا نکھار آ گیا تھا کہ بار بار اسے دیکھنے کے بعد بھی جی نہیں بھرتا تھا۔ اب میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا، مگر امی کا حکم تھا کہ آج شام تک میں واپس پہنچ جاؤں۔ میں نے خالہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا کہنے لگیں کہ میں امی کو وہاں بھیج دوں وہ انہیں دیکھ کر چلی جائیں گی۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ امی وہاں آ جائیں گی اور اس بار انیلا کو اپنی بہو بنانے کی بات پکی کر لیں گی۔

میں نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور تین بجے انیلا سے اس وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا کہ میں چند ہی دنوں میں اسے دلہن بنا کر وہاں سے لے جاؤں گا۔ اس سے رخصت ہو کر میں لاری اڈے پہنچا تو وہاں لانگ روٹ پر چلنے والی لاریوں کی ہڑتال شروع ہو گئی تھی۔ حسن پور پہنچنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اور وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ ایک ٹرک احمد نگر جا رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے مجھ سے کہا کہ وہ چھ میل تک حسن پور کی سڑک پر جائے گا۔ اس کے بعد اس کا راستہ بدل جائے گا۔ چھ میل پر ایک دوراہا تھا۔ وہیں سے ایک اور کچی سڑک حسن پور کو جاتی تھی۔ پیدل چلنے یا چھکڑے پر جانے والوں کے لیے قریب ترین راستہ تھا یعنی حسن پور وہاں سے صرف نو میل کے فاصلے پر تھا۔

ڈرائیور نے مجھ سے بیس روپے لیے اور مجھے وہاں تک پہنچا دیا۔ جس وقت میں نے کچے راستے پر سفر شروع کیا تو اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ بدل امنڈ امنڈ کر بارش کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ میں اس امید پر آگے بڑھنے لگا کہ شاید کوئی چھکڑا یا کوئی ہمسفر مل جائے تو راستہ آسانی سے طے ہو جائے گا۔

دو میل کے بعد مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ راستے میں ایک بھی متنفس نہیں ملا۔ رات کی گہری تاریکی ہر طرف مسلط ہو گئی تھی۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ میں ایک اجنبی حسینہ کی غراتی ہوئی آنکھوں سے خوف زدہ تھا تو تم غلط سمجھ رہے ہو کیونکہ پھر کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس حسینہ نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مجھے نامعلوم ذرائع سے نقصان پہنچایا تھا پھر میں خوف زدہ کیسے ہوتا۔ دراصل میرے اندر ایک احساس جرم تھا کہ میں نے کسی کو کپڑوں سے بے نیاز دیکھ کر ایک گناہ کیا ہے۔ یہ گناہ مجھے تڑپاتا تھا اور میں چونک چونک کر ان گھورتی ہوئی آنکھوں کو یاد کرنے لگتا تھا۔ اب تو انیلا کے وجود نے میرے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا تھا اور میں دل ہی دل میں ہنستے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس حسینہ نے گھور کر صرف دروازے کی جانب دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی نہیں دی تھی، مجھے اس گناہ کے احساس کو ذہن سے جھٹک دینا چاہیے۔

میں اندھیرے راستے پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی وقت بارش شروع ہو گئی۔ میں تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ میری رفتار کے ساتھ ساتھ ہوائیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ آس پاس کے درختوں کی پتیاں شور مچا رہی تھیں۔ میں آگے بڑھتے ہوئے دور دور تک اِدھر اُدھر دیکھتا جا رہا تھا کہ شاید کسی آبادی یا کسی مکان کی روشنی نظر آ جائے۔ تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اچانک بجلی کوندی تو ایک ڈاک بنگلہ نظر آ گیا۔

اس ڈاک بنگلے میں دو کمرے تھے۔ چوکیدار نے ایک کمرا میرے لیے کھولتے ہوئے بتایا کہ دوسرے کمرے میں ایک صاحب اور بیگم آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں وہ میرے کمرے میں ایک لالٹین چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اس کے بعد پلنگ پر بچھی ہوئی چادر اٹھا کر اسے تہ بند کی طرح باندھ لیا اور گیلے

کپڑے نچوڑ کر کرسیوں پر پھیلائے پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

باہر بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ درختوں سے ٹکرانے والی ہوائیں یوں شور مچا رہی تھیں جیسے بہت ساری بدروحیں چیخ رہی ہوں۔ میں کسی بدروح کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے آنکھیں بند کر کے انیلا کو یاد کرنے لگا۔ اس ٹھنڈی رات میں اس کے جسم کی گرمی مجھے تڑپانے لگی۔ میں بڑی دیر تک اس کی ایک ایک آواز اور اس کی خود سپردگی کے انداز کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا رہا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ لگ جائے تو پھر وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا کہ ہم کتنی دیر تک سوتے رہے۔ اچانک ہی مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا، یوں جیسے کوئی بھاری پتھر سا رکھا ہو۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔

وہ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

سرہانے میز پر رکھی ہوئی لالٹین کی لو بھڑک رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو گیا تھا اور اس کی روشنی ساتھ چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس بھڑکتی ہوئی جلتی بجھتی روشنی میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی اجنبی حسینہ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں ایک تیز چمکتا ہوا خنجر تھا۔ وہ ملبوس تھی۔ مگر اس کا سینہ کھلا ہوا تھا اور وہ سوراخ، اس سوراخ میں آہستہ آہستہ سے خون رس رہا تھا۔

میں ہکا بکا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ شدید حیرانی سے میری آنکھیں پھیل گئی تھیں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ نفرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لالٹین کی بھڑکتی ہوئی روشنی کبھی اسے اجاگر کر رہی تھی اور کبھی پل بھر کے لیے تاریکی میں چھپا رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ میرے پاؤں کی طرف سے گھوم کر بائیں طرف آنے لگی۔

میرے کانوں میں بارش کی ٹپاٹپ اور بدروحوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ مجھ پر لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ وہ قریب آ گئی تھی۔ اپنی ہتھیلی پر خنجر تول رہی تھی جہاں اس کے سینے میں سوراخ تھا، ٹھیک اسی جگہ وہ میرے سینے کو نشانے کے لیے تک رہی تھی پھر اس نے خنجر کے دستے کو مٹھی میں بھینچ لیا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں فوراً ہی کروٹ بدل کر پلنگ کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔ خنجر دستے تک بستر کے گدے میں پیوست ہو گیا تھا۔ وہ خنجر میری آنکھوں کے اتنے قریب تھا کہ میں اس کے ہاتھی دانت کے سفید دستے کو واضح طور سے دیکھ سکتا تھا، اور ہاتھ بڑھا کر اس خنجر کو چھین سکتا تھا۔ مگر میرے پلٹ کر دیکھتے ہی اس نے خنجر کو بستر سے کھینچ لیا اور واپس گھوم کر میرے پاؤں کی طرف سے دائیں طرف آنے لگی۔ کیونکہ میں پلنگ کے دائیں طرف تھا۔

میرے پاؤں کی جانب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رک گئی۔ پل بھر کی تاریکی نے اسے چھپا لیا۔ پھر لالٹین کی لو بھڑک کر اسے واضح کرنے لگی۔ شانوں پر بکھری ہوئی سنہری زلفیں ہوا کے زور پر رہ رہ کر اڑتی جا رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

میرے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ حملہ کرنے کا وہی انداز تھا۔ وہ اپنی ہتھیلی پر خنجر تول رہی تھی اور میرے ننگے سینے کو نشانے کے لیے تک رہی تھی۔ پھر اس نے خنجر کے دستے کو مٹھی میں جکڑ کر مجھے نشانے پر رکھا۔ دوسری بار بھی میں بال بال بچا۔ پھرتی سے کروٹ بدل کر دوسری طرف چلا آیا۔

وہ پیوست ہونے والے خنجر کو واپس کھینچ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اب اس کی آنکھوں میں نفرت نہیں تھی، گہری سنجیدگی تھی۔ آہ! وہ خوب صورت مقناطیسی آنکھیں وہی آنکھیں مجھے سحر زدہ کر رہی تھیں مجھے کمزور بنا رہی تھیں۔ میں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں بے دست پا ہو کر رہ گیا ہوں۔

پھر اس کے لب ہلنے لگے۔ بادلوں کی گرج

میں اس کی رس بھری آواز گڈمڈ ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ اسی وقت لالٹین کی لو آخری بار بھڑک کر بجھ گئی۔

کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں وہ کس طرف سے حملہ کرے، جہاں وہ آخری بار نظر آئی تھی وہاں میں نے لات چلا دی تاکہ وہ دور چلی جائے لیکن وہ اس طرف نہیں تھی۔ شاید کسی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ اس اندھا کر دینے والی تاریکی میں نہ دیکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس بار کس طرف سے خنجر کی دھار آزمانے آئے گی۔

میں بوکھلا کر پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چاروں سمت گھومنے لگا اور اِدھر اُدھر تاریکی میں مکے بازی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں چیختا بھی جا رہا تھا۔

”خبردار! میرے قریب نہ آنا۔ تم مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتیں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ مجھے بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ ارے دوڑو یہ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے بچاؤ، خدا کے لیے مجھے اس چڑیل سے بچاؤ۔“

میری چیخوں سے سارا ڈاک بنگلہ گونجنے لگا۔ برآمدے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر چوکیدار دروازہ پیٹنے لگا۔

”دروازہ کھولو! صاحب جی، دروازہ کھولو۔“

”کیا بات ہے۔“ کسی شخص کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”تم کون ہو، کیوں چیخ رہے ہو۔ چیخنا ہی ہے تو دروازہ کھول کر کہیں دور چلے جاؤ۔“

ان کی آوازیں سن کر مجھ میں حوصلہ پیدا ہوا۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹین بھی تھی۔ جس کی روشنی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ میں پلنگ سے چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور دوڑتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ کر اسے کھولنے لگا۔ جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ذرا دیر بعد اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا کہ دروازے کو تو میں نے اندر سے چٹخنی لگا کر بند کیا تھا۔ میں نے چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھلتے ہی چوکیدار ہاتھ میں لالٹین لیے ایک شخص کے ساتھ اندر چلا آیا۔

وہ شخص مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں بھی حیرانی سے اسے دکھا رہا تھا۔ وہ امداد خان تھا۔ میرا کرایہ دار۔۔۔ وہی کرایہ دار جس کے ہاں جا کر میں نے دروازے کے شگاف سے جھانک کر اس ستم گر حسینہ کو دیکھا تھا جو ابھی میرے کمرے میں خنجر بکف آئی تھی۔

مگر اب وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ لالٹین کے بھڑک کر بجھتے ہی غائب ہو گئی تھی۔ میں انہیں بتانے لگا کہ کس طرح ایک دوشیزہ ہاتھ میں خنجر لیے میرے کمرے میں آئی تھی۔

”صاحب جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں لگی ہیں۔ پھر کوئی لڑکی کمرے کے اندر کیسے آ سکتی ہے؟“

امداد خان لالٹین لے کر پلنگ کے قریب آیا۔ پلنگ کے گدے پر دو بار خنجر پیوست ہو چکا تھا۔ مگر وہاں خنجر کے پیوست ہونے کا نشان تک نہ تھا۔ امداد خان امداد نے کہا۔

”آپ نے خواب دیکھا ہے۔ دیکھیے، یہاں خنجر کا کوئی نشان نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کے سینے میں ایک سوراخ تھا، یہ بات کیسے تسلیم کر لی جائے۔ کیا سوراخ ہونے کے بعد کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ سوراخ سے خون رس رہا تھا۔ بتائیے یہاں کہیں خون کا دھبہ نظر آ رہا ہے؟“

میں پریشان ہو کر فرش پر خون کے دھبے تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ پراسرار دوشیزہ اپنی موجودگی کا کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جو کچھ مجھ پر بیتی ہے وہ محض ایک خواب تھا۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ایک بار وہ حملہ کرنے کے دوران اس قدر میرے قریب آئی تھی کہ میں نے اس کی سانسوں کی گرمی کو بھی محسوس کیا تھا۔ میں کیسے مان لیتا کہ وہ ایک خواب ہے۔

امداد خان نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا

”سوا چار ہو گئے۔ اب تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے اگر آپ خوف زدہ ہیں تو یہ چوکیدار صبح تک اس کمرے میں آپ کے ساتھ رہے گا۔ میں آپ کا ساتھ دیتا۔ مگر میرے ساتھ کی عورتیں آپ کی چیخیں سن کر خوف زدہ ہو گئی ہوں گی۔“

اس کے ساتھ عورتیں ہیں یہ سن کر میرا ذہن اس لڑکی کی طرف چلا گیا۔ اگر وہ امداد خان کی عزیزہ ہے تو یقیناً وہ بھی یہاں موجود ہو گی۔ میں نے پوچھا۔

”آپ کے ساتھ کتنی عورتیں ہیں؟“

”دو۔۔۔ ایک میری بیوی اور دوسری میری سالی۔ ہم حسن پور جا رہے ہیں۔ راستے میں بارش کے آثار دیکھ کر اس ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے۔“

اتنے میں پاس والے کمرے سے کسی عورت کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ وہ امداد خان کو آوازیں دے رہی تھی۔ امداد خان تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جو لڑکی میرے بند کمرے میں آئی تھی، وہی پاس والے کمرے میں موجود ہے یا نہیں۔ میں بھی امداد خان کے پیچھے کمرے سے باہر آیا۔

دوسرے کمرے سے ایک عورت بھاگی آ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا،

اس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ وہ وہی خنجر تھا۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ عورت امداد خان کے قریب آ کر رک گئی اور ہانپتی ہوئی بولی۔

”عالیہ اپنے بستر پر نہیں ہے۔ یہ۔۔۔ یہ خنجر اس کے بستر کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ وہ کہاں چلی گئی اس اندھیری رات میں وہ کہاں جا سکتی ہے میں جانتی ہوں۔ تم نے اسے پریشان کیا ہے۔ تم نے اسے کہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ امداد خان نے ڈانٹ کر کہا۔

”میں تو گہری نیند سو رہا تھا، فیصل صاحب کی چیخیں سن کر یہاں بھاگا آیا۔ میں نے اس کے بستر کی جانب دیکھا تک نہیں کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے۔“

دونوں میاں بیوی آپس میں تو تو، میں میں کرنے لگے۔ میں دہشت زدہ نظروں سے اس خنجر کو دیکھ رہا تھا۔ میں چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ یہ اسی لڑکی کا خنجر ہے۔ جسے تم لوگ عالیہ کہہ رہی ہو۔ وہی لڑکی یہ خنجر لے کر مجھے قتل کرنے آئی تھی، مگر مگر اس عالیہ پر الزام لگانے سے پہلے میں اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی دوسری لڑکی ہو اور بعد میں مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔

امداد خان کی بیوی کہہ رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ میری بہن کو تلاش کرو نہ جانے وہ اس ویرانے میں کہاں بھٹک رہی ہو گی میرے اللہ وہ بھی کیسی نڈر ہے اس اندھیرے میں نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔“ میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے فوراً ہی کہا۔

”امداد بھائی! ہمیں فوراً ہی انہیں تلاش کرنا چاہیے وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔“ میں اپنے کمرے میں آ کر کپڑے پہننے لگا۔

چوکیدار نے میرے پاس آ کر کہا۔

”صاحب جی! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کہتے ہیں اس کمرے میں ایک لڑکی خنجر لے کر آئی تھی۔ ادھر دوسرے کمرے میں بھی ایک لڑکی خنجر چھوڑ کر گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں خود حیران ہوں۔ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کروں گا۔“

میں نے بوڑھے چوکیدار سے لالٹین لے لی۔

امداد خان نے اس سے لاٹھی مانگ لی۔ پھر ہم دونوں اس کی تلاش میں نکل گئے۔

بارش تھم گئی تھی۔ آسمان اب تک ابر آلود تھا، جس کی وجہ سے گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم لالٹین کی روشنی میں کیچڑ آلود راستوں سے گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں گھاس کے قطعے تھے ورنہ پتھریلی زمین اور اونچے اونچے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ امداد خان رہ رہ کر عالیہ کو پکار رہا تھا۔ جنگل کے سناٹے میں عالیہ کا نام گونج رہا تھا اور ٹیلوں اور پہاڑوں سے ٹکرا کر لہراتا ہوا ہماری طرف واپس آ رہا تھا۔ امداد خان نے پریشان ہو کر کہا۔

''لعنت ہے اس لڑکی پر نہ جانے کہاں جا کر مر گئی ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اس طرف جائیں۔ میں ادھر آتا ہوں۔ مگر آپ تو پہلے ہی سہمے ہوئے ہیں۔''

مجھے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ میں نے جھلا کر کہا۔

''میں بزدل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اگر وہ آپ کے ساتھ پیش آتا تو آپ بھی اس اندھیرے میں دہشت سے چیخنے لگتے۔۔۔ بہرحال آپ اُدھر جایئے۔ میں اِدھر تلاش کرتا ہوں۔''

میں لالٹین لے کر جانے لگا۔ اس نے کہا۔

''مگر آپ عالیہ کو پہچانیں گے کیسے؟''

''میں پہچانتا ہوں۔'' بے اختیار میں نے کہہ دیا۔ دراصل میرے دماغ میں بھی یہی بات تھی کہ عالیہ وہی پراسرار حسینہ ہے۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''عالیہ کو پہچاننا مشکل ہے کیا۔ اس ویرانے میں دس بیس لڑکیاں تو ہوں گی نہیں، ملنا ہو گا تو وہی ایک ملے گی، میں پہچان لوں گا۔''

یہ کہہ کر میں دوسری طرف چلا گیا۔ اس وقت میرے دل میں کسی طرف کا خوف نہیں تھا۔ اس کا خنجر ڈاک بنگلے میں رہ گیا تھا۔ ایک کمزور لڑکی کو قابو میں کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اگرچہ وہ پراسرار قوتوں کی مالک تھی۔ بند کمرے میں چلی آئی تھی۔ سینے میں سوراخ تھا۔ وہاں سے خون رستا رہتا تھا پھر بھی وہ زندہ تھی۔ مگر حیرت زدہ کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ امداد خان کی عزیزہ تھی۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہو گا کہ اس کے سینے سے خون رستا ہے یا نہیں۔'' یہ تو صریحاً بچکانہ باتیں تھیں۔ دوسروں سے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کی نظروں میں خود کو پاگل ثابت کیا جائے۔

میں لالٹین ہاتھ میں لیے ایک ٹیلے کے بعد دوسرے ٹیلے کے پیچھے اسے تلاش کرتا رہا۔ پھر وہ مجھے مل گئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ وہ انسانی روپ میں آ کر بڑے ہی ڈرامائی انداز میں مجھے متاثر کرنا اور میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ اس وقت میں سمجھا کہ وہ اچانک ہی مل گئی ہے۔

وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی دیکھ کر ٹھٹک گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ ہو بہو وہی تھی، میرے خون کی پیاسی۔ مگر اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے کی جفاشعار حسینہ نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

''کیا تم مجھے پہچان رہی ہو، لو اچھی طرح پہچان لو۔'' میں نے لالٹین اونچی کر کے اپنے چہرے کے قریب کر لیا۔

اس نے ایک نگاہ غلط سے مجھے دیکھا اور پلٹ کر پہاڑی کی طرف بھاگنے لگی۔ میں نے للکار کر کہا۔

''رک جاؤ۔ عالیہ رک جاؤ۔ تم مجھ سے بھاگ کر نہیں جا سکو گی۔''

میں بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ وہ بلندی پر جانے والی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر بھاگتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی پلٹ کر میری طرف دیکھ رہی تھی اور پھر مجھے قریب پہنچتے دیکھ کر پھر بھاگنے لگتی تھی۔ میں اس سے تیز دوڑ رہا تھا۔ مگر کیچڑ اور پھسلن کی وجہ سے کہیں کہیں میری رفتار سست پڑ جاتی تھی۔ وہ تو ایسے بھاگ رہی تھی جیسے اسے بھاگنے کی قطعی پروا نہ ہو۔

کچھ اونچائی پر پہنچ کر زمین ہموار ہو گئی وہ آگے بھاگتے بھاگتے کیچڑ میں پھسل کر گر گئی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ پھر وہ پکڑی جانے کے خوف سے فوراً ہی اٹھ گئی۔ میں ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف جھپٹا۔ وہ گرفت میں آتے آتے رہ گئی۔ میں نے جھلا کر پھسلنے اور گرنے کے اندیشوں کو فراموش کر دیا۔ ایک بار تیزی سے دوڑ لگائی اور چند قدموں کے فاصلے پر پہنچ کر اسے پکڑ ہی لیا۔

اف! میں نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ ہم سے ایک قدم آگے گہری کھائی تھی اگر میں اسے پکڑ نہ لیتا تو پھر اس کی ہڈیاں پسلیاں بھی نہ ملتیں۔ وہ اپنے بازو کو جھٹکے دے دے کر خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

''چھوڑو۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔ مجھے مر جانے دو مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے اس کے بازو کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

''ابھی تو تم مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ اب خود مرنا چاہتی ہو۔ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے، میں تمہیں کیوں مارنا چاہتی ہوں گی۔ تم کون ہو۔ کیوں میرا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہو۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ اپنی مرضی سے جان دینا چاہتی ہوں۔ تم مجھے روکنے والے ہوتے کون ہو؟''

''کیا تم مجھے نہیں پہچانتی ہو۔ کیا تم تھوڑی دیر پہلے ایک خنجر لے کر میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔''

وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرنا بھول گئی۔ مجھے شدید حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم۔۔۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تمہیں نہیں جانتی ہوں کہ تم کہاں رہتے ہو۔ پھر میں تمہارے کمرے میں کیسے آ گئی۔ تمہیں دھوکا ہو رہا ہے۔ تم کہاں رہتے ہو۔ میں تو ڈاک بنگلے سے آ رہی ہوں۔''

''میں بھی ڈاک بنگلے سے آ رہا ہوں۔ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے وہ خنجر بھی دیکھا ہے جس سے تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ پھر ناکام ہونے کے بعد اسے اپنے بستر پر چھوڑ کر چلی آئیں۔''

''تم پاگل ہو!'' وہ چیخ کر بولی۔

''وہ۔۔۔ وہ میں نے اپنے بہنوئی کو مارڈالنے کے لیے وہ خنجر اپنے پاس رکھا تھا۔''

''امداد خان کو۔۔۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ ایک جھٹکے سے بولی اور پھر خود کو میری گرفت سے چھڑانے لگی۔

''تم اسے کیوں مارنا چاہتی تھیں۔''

''مجھے مر جانے دو۔ پھر اسی بے غیرت سے جا کر پوچھنا۔''

''نہیں، میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں بتاؤ۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔''

اس نے بے بس ہو کر مجھے دیکھا شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ میری مضبوطی گرفت سے اسے نجات نہیں ملے گی وہ سر جھکا کر ایک ہتھیلی اپنی آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔

فیصل اتنا کہہ کر رک گیا اور ہشام کو دیکھنے لگا۔ ہشام بھی سر جھکائے، ایک ہتھیلی اپنی آنکھوں پر رکھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے۔'' فیصل نے پوچھا۔

''کیا تم بور ہو رہے ہو ہشام!''

ہشام نے چونک کر سر اٹھایا اور جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہیں یہ کہانی اتنی۔۔۔ سوری کہانی نہیں، تمہاری آپ بیتی اتنی دلچسپ ہے کہ کوئی بور نہیں ہو سکتا میں دراصل عالیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ابھی تمہاری آپ بیتی جاری ہے۔ لیکن میں پہلے ہی فیصلہ سنا دوں کہ آخر کار وہ ایک مظلوم لڑکی ثابت ہو

گی۔ یہ تمہارا وہم ہے کہ وہ تمہیں قتل کرنا چاہتی تھی۔"

وہ بڑی اداسی سے طنزیہ انداز میں مسکرایا پھر کھانسنے لگا۔ بیماری اور نقاہت کی وجہ سے اسے کھانسنے میں ایسی تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ بار بار اپنے سینے اور گردن کو سہلانے لگتا تھا۔

ٹن۔۔۔ٹن۔۔۔ٹن، دیوار گھڑی تین بجا رہی تھی۔

فیصل نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔

"چار بجے، ڈاک بنگلے میں امداد خان نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھ کر کہا تھا کہ سوا چار ہو چکے ہیں۔ اس طرح وقت کا حساب لگایا جائے تو عالیہ نے ٹھیک چار بجے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ میں چار بجے پیدا ہوا تھا اس عورت نے میری موت کا بھی وہی وقت مقرر کیا ہے۔"

"تم کہتے ہو کہ وہ مظلوم ہے۔ ہاں میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ کیونکہ وہ رو رہی تھی عورت جہاں خنجر سے نہیں مار سکتی وہاں اپنے آنسوؤں سے مار دیتی ہے۔ اتنی حسین لڑکی کو روتے دیکھ کر میں پگھل گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دوسرے ہاتھ میں، میں نے اس کے گداز بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کا بھرا بھرا نرم بازو مجھے سمجھا رہا تھا کہ اس کے آگے بھی وہ بہت سی قیامتیں چھپائے ہوئے ہے۔ چند لمحوں تک میرا ذہن دروازے کے شگاف سے جھانکتا رہا اور ہولے ہولے لرزتا رہا۔ خوف سے نہیں، جذبات کی ہلچل سے لرزتا رہا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی غراتی ہوئی آنکھوں نے کبھی مجھے دھمکی دی تھی اور کچھ دیر پہلے وہ اس دھمکی پر عمل بھی کر چکی تھی۔

میں سب کچھ بھول گیا۔ اس روتی ہوئی مظلوم لڑکی کو کھینچتے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کے پاس لایا اور اس پر جبراً اسے بٹھاتے ہوئے بولا۔

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔ میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے بتاؤ۔"

"نہیں کوئی میرے کام نہیں آ سکتا۔ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ کوئی میری تنہائی اور بدنصیبی کو سمجھنے والا نہیں ہے۔"

"ایسا نہ کہو تمہاری ایک بہن ہے۔"

"ہاں، وہ بہن بھی ہے اور دشمن بھی۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اور نفرت بھی اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ والدین کی وفات کے بعد وہی میرا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ مگر میرے بہنوئی کی نیت خراب ہے۔ پہلے پہل بہنوئی کے رشتے سے اس نے چھیڑ چھاڑ کی تو میں مذاق سمجھ کر ٹال گئی۔ یوں بھی مجھ پر امی کی دعائیں ہیں۔ انہوں نے مرتے وقت دعا کی تھی کہ میں ہمیشہ عزت و آبرو سے رہوں گی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ شریف اور پاک باز لڑکیوں کی ایک ہمزاد ہوتی ہے۔ ہمیں کسی کے شیطانی ارادوں کا علم ہو یا نہ ہو مگر ہماری ہمزاد کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے۔ وہ ہماری لاعلمی میں ہماری حفاظت کرتی ہے۔ اگر کوئی ہمیں بری نیت سے دیکھے تو وہ ہمارے اس دشمن سے انتقام ضرور لیتی ہے۔"

میں اس کے قریب بیٹھا تھا۔ فوراً ہی ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ماں کی زبان سے سنی ہوئی باتیں کہہ رہی تھی۔ میں اس کی تصدیق کر سکتا تھا۔ لیکن کیسے کرتا۔ یہ کیسے کہتا کہ میں نے چھپ کر اسے دیکھا ہے اور جب اسے دیکھا ہے، تب سے ایک گناہ پر پچھتا رہا ہوں۔ پچھتاوا تو ایک رسمی چیز ہے۔ ورنہ گناہ کی حقیقت یہ ہے کہ جتنی بار ہم پچھتاتے ہیں اتنی ہی بار پچھتانے کے دوران وہ گناہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہمارے سامنے مجسم ہوتا ہے۔ کپڑوں سے بے نیاز ہو کر ہمارے تحت الشعور میں چھپی چھپی انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ میں اس کے سامنے اعتراف نہ کر سکا کہ میں نے اسے کس حال میں دیکھا ہے۔ وہ اب بھی لباس میں ہو کر بھی میرے سامنے بے لباس تھی۔

بہرحال میں نے بھی ہمزاد کے متعلق بزرگوں سے سنا ہے پھر یہ کہ چشم دید واقعات سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ عالیہ بالکل معصوم اور بے ضرر تھی۔

لیکن اس کی ہمزاد مجھے نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ عالیہ کی لاعلمی میں وہ نادیدہ ہستی میرے بند کمرے میں چلی آئی تھی۔

ویسے میں تنہا گناہ گار نہیں تھا، عالیہ کے بیان کے مطابق امداد خان بھی مجرم تھا۔ اس پر بھی عالیہ کی ہمزاد کا عتاب نازل ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"پھر تم خودکشی کیوں کر رہی ہو کیا تمہاری ہمزاد امداد خان سے انتقام نہیں لے سکتی۔" وہ ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش رہی پھر اس نے جواب دیا۔

"ہاں۔ انتقام لے رہی ہے۔ جب سے میں آپا کے ہاں آئی ہوں اور جب سے اس کی نیت بدلی ہے اس وقت سے وہ اختلاج قلب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی اس پر دورہ پڑتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ برے خیال کو دل میں جگہ نہ دو۔ ورنہ میرا صبر تمہیں اس سے بھی زیادہ اذیت میں مبتلا کر دے گا۔ وہ ہنس کر کہنے لگا کہ یہ سب جاہلوں کی سی باتیں ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اسے لو بلڈ پریشر ہے۔ شراب کا ایک پیگ پینے کے بعد خون کا سرکولیشن اعتدال پر آ جاتا ہے۔ پھر مہینوں اسے اختلاج قلب کی شکایت نہیں ہوتی۔

یہ تو اپنا اپنا نظریہ اور اپنی اپنی سوچ ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ اس طرح راہ راست پر نہیں آ رہا ہے تو میں نے آپا سے شکایت کر دی۔ آپا محتاط ہو گئیں۔ اپنے خاوند کی طرف سے بھی اور میری طرف سے بھی۔ میں جو ایک بہن تھی۔ اب انہیں سوکن نظر آنے لگی۔ میری وجہ سے آئے دن میاں بیوی کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ وہ کچھ دنوں کے لیے سیدھا ہو گیا۔ گھر میں آتا تو مجھ سے باتیں کرتا نہ نظریں ملاتا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ چلو جان چھوٹی۔

لیکن یہ میری بھول تھی۔ ایک دن میں نے اس کی چوری پکڑ لی۔ ایک شام میں اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہی تھی کہ وہ دروازے پر ایک شگاف سے جھانکنے لگا۔

میں نے دروازے پر آہٹ سن کر اس طرف دیکھا تو مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہی ذلیل آدمی ہے۔ کسی دوسرے کو کیا معلوم کہ میرا کمرہ کون سا ہے۔ وہی جانتا تھا کہ میں شام کو لباس تبدیل کر کے اپنی سہیلی کے ہاں دعوت میں جانے والی ہوں۔ مجھے اس کی اس ذلیل حرکت پر بے اختیار رونا آ گیا۔ میں اسے کوسنے اور بددعائیں دینے لگی۔ میں نے دل کی گہرائی سے کہا کہ اگر امی کی بات سچ ہے اگر ہمزاد کوئی خیالی، ہستی نہیں ہے تو اللہ کرے کہ میری ہمزاد اس سے انتقام لے۔ ایسا انتقام لے کہ اس کی زندگی اس کے لیے عذاب بن جائے۔"

عالیہ کی باتیں سن کر مجھے پسینہ آنے لگا۔ امداد خان محفوظ تھا۔ اس کی بددعاؤں کا اثر مجھ پر ہونا تھا اسی لیے اس کی ہمزاد میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کس طرح اپنی غلطی کی تلافی کر سکتا ہوں۔ کس طرح ایک پاک باز لڑکی کی بددعا کو دعا میں بدل سکتا ہوں۔ اس کے کسی کام آ کر، اس کی زندگی بچا کر ہاں، وہ میری احسان مند ہو گی۔ میرے متعلق اچھی رائے رکھے گی تو اس کے ہمزاد میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔

میں سوچ رہا تھا اور اس کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

اس دن کے بعد میں محتاط رہنے لگی۔ دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے میں صرف بددعا دے کر مطمئن نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ احتیاطی تدابیر بھی ضروری تھیں۔ ایسے آدمی کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ ہزار عذاب نازل ہونے کے باوجود نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ امداد خان بھی تنہائی میں مجھ جیسی کمزور لڑکی پر غالب آ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں اپنے پاس ایک خنجر چھپا کر رکھنے لگی۔

آج ڈاک بنگلے میں ہم پہنچے تو کمرا ایک تھا اور ہم تین تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جس کمرے میں،

میں رات گزاروں۔ وہاں امداد خان موجود ہے۔ آپا بھی یہ نہیں چاہتی تھیں۔ آپا نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں جا کر سو جائے۔ مگر شاید اس نے چوکیدار کو پہلے سے سکھا پڑھا دیا تھا۔ چوکیدار نے کہا کہ اگر آدھی رات تک کوئی دوسرا مسافر نہ آیا تو وہ کمرہ امداد خان کو سونے کے لیے مل جائے گا۔ دو گھنٹے کے بعد ہی پتا چلا کہ وہاں کوئی دوسرا مسافر آ گیا ہے۔''

ہم دونوں بہنیں مجبور ہو گئیں۔ آپا نے مجھے پلنگ پر سونے کے لیے کہا۔ انہوں نے اپنا اور امداد خان کا بستر فرش پر بچھا لیا۔ ہم تینوں ہی تھکے ہوئے تھے۔ آپا نے ایک پہرے دار کی طرح جاگنے کی کوشش کی مگر انہیں نیند آ گئی۔ امداد خان بھی شاید سو گیا تھا۔ مگر میں اس کی موجودگی میں نہیں سو سکتی تھی۔ میری آنکھیں بند ہوتیں تو پھر میں چونک کر اسے دیکھنے لگتی تھی۔ آدھی رات کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ شیطان جاگ رہا ہے اور میری طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ آپا کو اٹھا دوں۔ مگر ان کے تھکے ہوئے چہرے اور گہری نیند کو دیکھ میرا دل محبت سے بھر گیا۔ میں نے انہیں پریشان کرنے کے بجائے تکیہ کے نیچے سے خنجر نکال کر امداد خان کو خاموش دھمکی دی کہ میرے قریب آؤ گے تو جان سے جاؤ گے۔ میرے تیور دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ دال نہیں گلے گی لہٰذا وہ چپ چاپ دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گیا۔

میں خنجر کو بستر پر اپنے قریب رکھ کر سوچنے لگی کہ ایسا کب تک ہو گا۔ اس طرح کیسے زندگی گزرے گی۔ کیا میں امداد خان کو اس خنجر سے مار سکتی ہوں۔ کیا میں اپنی بہن کا سہاگ اجاڑ سکتی ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہاتھوں سے اپنی اس بہن کو بیوہ نہیں بنا سکتی۔ جو ماں بن کر میری پرورش کر رہی ہے اور نہ بہن کے ساتھ رہ کر اس گھر کو تباہ کر سکتی ہوں۔ امداد خان نے صبح ہی موقع پا کر مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اس سے شادی کر کے راضی ہو جاؤں تو وہ آپا کو طلاق دے دے گا۔ اللہ! وہ کتنی کمینگی سے سوچ رہا تھا اور وہ اس لیے سوچ رہا تھا کہ میں اس کے گھر میں رہتی تھی۔ مجھے دیکھ دیکھ کر وہ للچاتا رہتا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کہیں ڈوب مروں گی۔ موت کو گلے لگانے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کیونکہ اس دنیا میں عزت آبرو سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں گی مجھے سینکڑوں امداد خان ملیں گے۔

میں سوچ رہی تھی۔ میرے دل میں مر جانے کی خواہش آندھی طوفان کی طرح زور پکڑ رہی تھی۔ میں اسی وقت بستر سے اٹھ کر بھاگ جاتی، مگر میں سمجھ رہی تھی کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مجھے بھاگتے دیکھ کر وہ آپا کو جگا دے گا یا باہر رات کے اندھیرے میں جا کر مجھے پکڑ لے گا۔ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے میں چپکی پڑی رہی اور اسے دیکھتی رہی کہ جب وہ خراٹے لے گا تو میں وہاں سے اٹھ کر چلی جاؤں گی۔

اس کے خراٹوں کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں سونا نہیں چاہتی تھی مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہستی تھپ تھپک کر مجھے سلا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ میں اپنے ارادے کے خلاف سو گئی۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی اپنی غفلت کا احساس ہوتے ہی سب سے پہلے میرے ہاتھ نے خنجر کو تلاش کیا وہ تو میرے ہاتھ کے نیچے ہی رکھا تھا مگر اس وقت نہیں تھا۔ میں نے تکیہ کے نیچے دیکھا۔ پھر اپنے آس پاس تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا میں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر امداد خان کی جانب دیکھنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اسی نے غائب کیا ہے۔ لیکن بظاہر وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ اس وقت چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔

میں نے چونک کر عالیہ کو دیکھا۔ چار بج کر پانچ منٹ۔ یہ وہی وقت تھا جب اس کی ہمزاد خنجر لے کر میرے کمرے میں آئی تھی اور وہی خنجر عالیہ کے پاس سے غائب ہو گیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ میں اندر سے لرز رہا تھا۔ بہت ساری حقیقتیں مجھ پر واضح ہو گئی تھیں۔ خنجر کا غائب ہونا۔ اس کی ہمزاد کا بند کمرے میں چلے آنا۔ یہ تمام ایسی سچائیاں تھیں کہ ان پر کوئی دوسرا یقین نہ کرتا۔ مگر میں ان سچائیوں پر ایمان لے آیا ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''وقت دیکھ کر مجھے پتا چلا کہ رات گزرنے والی ہے۔ اگر اب میں نے یہاں سے نکلنے میں دیر کی تو حسن پور پہنچ کر مجھے ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔ میں اسی وقت بستر سے اٹھ گئی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔'' ہشام نے ہاتھ اٹھا کر فیصل سے کہا۔

''سوری میں مداخلت کر رہا ہوں۔ تم یہ کہہ رہے ہو کہ عالیہ کے بستر سے جو خنجر غائب ہوا تھا۔ اسی خنجر سے اس کی ہمزاد تمہیں ہلاک کرنے آئی تھی۔ بعد میں وہ اسے عالیہ کے بستر کے نیچے پھینک کر چلی گئی۔ امداد خان کی بیوی نے اسے پلنگ کے نیچے سے ہی اٹھایا تھا۔ لیکن فیصل! میں کہتا ہوں کہ ہر عمل اور ردعمل کی مادی وجوہات ہوتی ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے۔ عالیہ نے سوتے وقت خنجر کو اپنے ہاتھ کے پاس رکھا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ نیند کی حالت میں ہاتھ اِدھر سے اُدھر کرتے وقت وہ خنجر پلنگ کے نیچے گر پڑا ہو۔'' فیصل نے جواب دیا۔

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمزاد کے وجود کو تو ایک طرف رکھو۔ لوگ تو خدا کے وجود پر بھی بحث کرتے ہیں اور اگر کوئی محیر العقول واقعہ پیش آ جائے تو اس کے مادی اسباب تلاش کرتے ہیں۔ تم اپنے طور پر سوچ رہے ہو کہ نیند کی حالت میں عالیہ کے ہاتھ سے وہ خنجر پلنگ کے نیچے گر گیا تھا لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے اس خنجر کو اس کے ہمزاد کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔ تم اسے وہم، خواب پریشان کا نام دو گے۔ مگر ذرا صبر کرو۔ چار بجنے دو، تمہاری کوٹھی کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود جب وہ یہاں آئے گی تو تم تمام اعتراضات بھول جاؤ گے۔

آہ! ہشام میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ میں اس حقیقت کو سمجھ رہا ہوں کہ آج اس کے خنجر کی زد سے خود کو نہیں بچا سکوں گا۔ یہ آخری چالیس منٹ رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد میری ہستی کا چراغ گل ہو جائے گا۔

ہشام نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ تین بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے تسلی دی۔

''تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ بیماری نے تمہیں کمزور کر دیا ہے۔ لیکن میں تو کمزور نہیں ہوں۔ خطرے کے وقت میں تمہارے لیے ڈھال بن جاؤں گا۔'' اس نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

''نہیں میں ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں کسی کی دوستی اور قربانی کام نہیں آتی۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں میرے یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جو کچھ مجھ پر بیتی ہے تم اسے غور سے سن لو اور آخری بار مجھ پر جو بیتے گی۔ اس کے تم چشم دید گواہ بن جاؤ۔''

باہر زور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بارش کا جلترنگ بج رہا تھا۔ ہشام نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''تم تو اپنی غلطی کی تلافی کے لیے عالیہ کے کسی کام آنا چاہتے تھے کیا اس ہمزاد سے پیچھا چھڑانے کے لیے تم نے عالیہ سے نیکی نہیں کی؟''

''کی تھی۔'' اس نے کہا۔

''عالیہ کی آپ بیتی سننے کے بعد میں اس کے ذرا قریب آ گیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا کہ میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی توقع کے خلاف ایک چونکا دینے والی بات

کہی۔

”عالیہ! میں تم سے شادی کروں گا۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ شاید وہ یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ کہیں میں اسے خودکشی سے باز رکھنے کے لیے بہلا تو نہیں رہا ہوں۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”اب میں کسی امید سے خود کو بہلا نہیں سکتی۔ تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔“

”میں تمہیں بہلانا یا دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ صاف اور سیدھی بات کہہ رہا ہوں، تم عزت و آبرو سے رہنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں اپنی شریک حیات بناؤں گا۔ آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد میں تمہیں اپنی دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ تم اپنی آپا اور بہنوئی کی محتاج نہیں رہو گی۔ تمہارا اپنا ایک گھر ہوگا۔ یہ باتیں میں پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں انکار ہے، اگر میں تمہیں پسند نہیں ہوں تو میرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لو۔“

اس کا نازک سا ملائم ہاتھ میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ چند لمحوں تک میں انتظار کرتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے اپنا ہاتھ مجھے پورے اعتماد سے سونپ دیا ہے تو میں نے اسے اپنے بازوؤں کے احاطے میں لے لیا۔ وہ خود بخود آگے کو جھکی اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر رونے لگی۔ وہ خوشی کے آنسو تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار دلیری سے کسی لڑکی کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ویسے تو انیلا کے سلسلے میں بھی یہی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے میں جانتا تھا کہ امی فوراً راضی ہو جائیں گی۔ کیونکہ وہ ان کی بہن کی بیٹی ہے۔ لیکن عالیہ کے لیے مجھے ان کی مخالفتوں کا سامنا کرنا تھا۔ اس وقت وہ میری آغوش میں تھی اور میں دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا کہ اس نازنین کے لیے میں ساری دنیا چھوڑ دوں گا۔ مگر اسے چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہ لاؤں گا۔

سورج کے سامنے چراغ کو کون پوچھتا ہے۔ میں بھی اس ماہ پیکر کے سامنے اس سانولی سلونی لڑکی کو بھول گیا اور اسے لے کر ڈاک بنگلے میں آ گیا۔ وہاں میں نے امداد خان کو خوب باتیں سنائیں۔ خوب شرمندہ کیا تا کہ آئندہ وہ اپنی وفادار بیوی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی کا خیال دل میں نہ لائے۔ حالانکہ میں بھی انیلا جیسی وفادار لڑکی کی عزت سے کھیل کر اب عالیہ کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ مگر دوسروں کو شرمندہ کرتے وقت انسان کو اپنی غلطیاں یاد نہیں آتیں اور یاد بھی آتی ہیں تو وہ انہیں قربانی کے عظیم جذبے سے تعبیر کرتا ہے جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا کہ میں عالیہ کو زندگی کے مصائب سے بچانے، خودکشی سے باز رکھنے اور اس کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنا رہا ہوں۔

میں نے عالیہ کی بہن سے تمام باتیں طے کر لیں اور ان سے صاف کہہ دیا کہ میری امی اس شادی کی مخالفت کر سکتی ہیں۔ مگر میں صاحب جائیداد ہوں امی کی مخالفت کے باوجود اگلے جمعہ کو عالیہ سے نکاح پڑھاؤں گا اور اسے لے جا کر عیش و آرام سے رکھوں گا۔

عالیہ کی بہن برسوں سے اسی انتظار میں تھی کہ کوئی رشتہ آئے تو وہ دو بول پڑھا کر عالیہ کو اپنے خاوند کی نظروں سے دور کر دے۔ وہ راضی ہو گئی اور ہم حسن پور آ گئے۔

اس روز شام تک میں یہی کوشش کرتا رہا کہ امی کے سامنے کسی طرح عالیہ کا ذکر کروں۔ میری جرات نہ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ رات کو ان کے پاؤں دباتے ہوئے بات چھیڑوں گا۔ رات کو ایسا ہوا کہ خلافِ معمول امی جلدی سو گئیں۔ دوسری صبح اطلاع آئی کہ خالہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ سگی خالہ کا انتقال ہو جائے اور میں اپنی شادی کی بات کروں۔

خالہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر میں نے انیلا کی طرف دھیان دیا۔ اب وہ اس دنیا میں تنہا اور بے سہارا رہ گئی تھی۔ اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کر مجھے اپنے جرم کا احساس ہوا کہ میں

اس بے سہارا لڑکی کو پہلے ہی برباد کر چکا ہوں۔ اس کی آہ و زاری فریاد بن کر مجھ سے انصاف طلب کر رہی تھی اور انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ میں اس لڑکی کو اپناؤں جس کے جذبات سے میں کھیل چکا تھا۔

امی اسے اپنے ساتھ حسن پور لے آئیں۔ میں دوراہے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ عالیہ سے منہ موڑتا تو اپنی غلطی کی تلافی کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ دوسری طرف انیلا دن رات میری نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔ ماں کی موت کا غم تازہ تھا، اس لیے وہ میری تنہائی میں نہیں آتی تھی۔ ویسے سوگ منانے کے دوران بھی وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔

”اب میرا کیا ہوگا؟“

میں اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔ اصل بات یہ تھی کہ عالیہ میں زیادہ کشش تھی۔ وہ جوان تھی اور حسین بھی۔ اس کے برعکس انیلا ایک باسی پھول تھی۔ ایسے وقت انسان حق و انصاف کو نظر انداز کر کے اپنے جذبات کو ترجیح دیتا ہے۔ میں نے اپنے وعدے کے مطابق عالیہ سے شادی کر لی۔

ہم نے جو مکانات کرائے پر اٹھا رکھے تھے ان میں سے ایک مکان خالی تھا۔ بعد نماز جمعہ ہمارا نکاح ہوا اور میں شام سے پہلے ہی عالیہ کو اس مکان میں لے آیا۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ آج یا کل ظاہر ہو جاتی۔ مگر اسی وقت امی کو خبر ہو گئی۔ شاید امداد خان نے رقیب بننے کا فرض ادا کیا تھا۔ ابھی میں دلہن کو خواب گاہ لے جا ہی رہا تھا کہ وہ پہنچ گئیں۔ میں اسے خواب گاہ میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آیا۔ ان کا سامنا ہوتے ہی میں نے ندامت سے گردن جھکا لی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے غم و غصہ سے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔

”مجھے خبر ملی تو مجھے یقین نہیں آیا کہ تم ماں سے چھپ کر زندگی کی اتنی بڑی خوشی پوری کرو گے اور اس خوشی میں ماں کو دودھ کی مکھی سمجھ کر ایک طرف پھینک دو گے۔ پھر یہ خوشی کیسی؟ میری بہن کو مرے کل چھ دن ہوئے ہیں۔ تم نے کیا سوچ کر شادی کی ہے۔ کیا تم اسی انتظار میں بیٹھے تھے کہ میری بہن مرے گی تو تم جشن مناؤ گے۔“

وہ ایسے طعنے دے رہی تھیں کہ میں جواباً کچھ نہیں کہہ سکا۔ انہوں نے کہا۔

”شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اچھی طرح دیکھ سمجھ کر لڑکی پسند کی جاتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم جسے بیاہ کر لائے ہو وہ آسیب زدہ ہے؟“

میں نے گھبرا کر امی کو دیکھا۔ پھر ہکلاتے ہوئے کہا۔

”نن۔۔۔نہیں امی۔۔۔! آ۔۔۔آپ سے کسی نے غلط کہا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ امداد خان نے آپ کے پاس آ کر الٹی سیدھی لگائی ہے۔ وہ عالیہ کا دشمن ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ وہ ڈانٹ کر بولیں۔

”کسی امداد خان سے میرا کیا واسطہ۔ کیا میں عالیہ کو نہیں جانتی ہوں۔ عالیہ ہی کیا میں اپنے ہر کرایہ دار کے حالات سے واقف ہوں۔ تم تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے کرایہ وصول کرنے جاتے ہو، میں تو برسوں سے ان کے ہاں جاتی ہوں اور کرایہ وصول کرتی ہوں۔ آج سے دو سال پہلے سے عالیہ پر جن آتے ہیں۔ میں نے ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک عامل صاحب جن اتارنے کے لیے کچھ پڑھ رہے تھے اور وہ وحشیانہ انداز میں چیخیں مار رہی تھی۔ اپنے بالوں کو نوچ رہی تھی اور اپنے لباس کو پھاڑ ڈالنا چاہتی تھی۔ عامل صاحب کے چیلوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ تماشا محلے کی دوسری عورتوں نے بھی دیکھا ہے۔ تم خود ہی سوچو، اتنی حسین لڑکی سالوں سے بن بیاہی کیوں بیٹھی تھی۔ کوئی اس کا رشتہ مانگنے کیوں نہیں آیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس کے جال میں پھنسو گے تو میں پہلے ہی تمہیں اس کی اصلیت بتا دیتی۔ میں تو محض اس لیے خاموش تھی کہ جوان لڑکوں کے سامنے پرائی بہو، بیٹیوں کی

باتیں نہیں کی جاتیں۔“

میرے دل پر ایک خوف سا طاری ہو رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ عالیہ نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ مجھ سے بات چھپائی ہے۔ یعنی جن والی بات چھپا کر ایک ہمزاد کی کہانی گھڑلی تھی۔ ڈاک بنگلے میں اس کے بستر سے خنجر غائب نہیں ہوا تھا۔ وہ جھوٹ بولتی ہے۔ وہ خود ہی جناتی قوت کے سہارے میرے کمرے میں آئی تھی۔“

ہشام نے پھر مداخلت کی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو تم تو عجیب آدمی ہو۔ ابھی تو کسی ہمزاد کے وجود پر ایمان لے آئے تھے اور اب کہہ رہے ہو کہ کسی جناتی قوت کے سہارے وہ تمہارے بند کمرے میں آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے اس لیے تم جو کچھ کہتے ہو، اس کی تردید بھی کر دیتے ہو۔“

”ہاں۔“ فیصل نے کہا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔ عالیہ جتنی بار نئے روپ میں آئی، اتنی ہی بار میرے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ ویسے مجھے امی کی باتیں زیادہ ٹھوس اور مستحکم معلوم ہوئیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ جس لڑکی پر جن آتے ہیں اسے کوئی انسان بیوی کے طور پر حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی چھپ کر نظر بازی کر سکتا ہے۔ لیکن میں ایسا کر چکا تھا۔ تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا یا سنا ہوگا کہ جس پر جن آتے ہیں اس لڑکی کے حلق سے بھاری بھرکم مردانہ آواز نکلتی ہے۔ جیسے کوئی جن بول رہا ہو۔“

”ہاں میں نے سنا ہے۔ کبھی دیکھا نہیں ہے۔“ ہشام نے کہا۔

فیصل نے کہا۔

”میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جن اسی لڑکی کے ذریعے بولتے ہیں اور اسی لڑکی کو معمول بنا کر انتقام لیتے ہیں۔ عالیہ ایک جن کی امانت تھی۔ میں نے اسے کپڑوں سے بے نیاز دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ جن عالیہ کو معمول بنا کر مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔

اور وہ عالیہ جو بڑے بڑے ڈرامائی انداز میں اتنی کم مدت میں میری دلہن بن کر آئی تھی تو اس میں بھی کوئی راز تھا۔ کوئی خطرہ تھا جس کا اشارہ مجھے ایک ماں کی زبان سے مل رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

”فیصل! تم نے میرا دل دکھایا ہے۔ پھر بھی میں تمہاری سلامتی چاہتی ہوں۔ میری باتوں کا یقین کرو۔ اس روز عامل صاحب بھی اس جن کے سامنے بے بس ہو گئے تھے۔ عالیہ نے دو آدمیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود اپنا گریبان پھاڑ ڈالا تھا اور تب اس کے جسم کے ایک حصے میں پیسہ برابر سیاہ داغ نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی عامل صاحب نے کہا کہ وہ مجبور ہیں۔ جن اس سیاہ داغ کے ذریعہ یہ اشارہ چھوڑ کر گیا ہے کہ عالیہ اس کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ بعض لڑکیوں کے جسم پر بچپن سے ایسا داغ ہوتا ہے اور وہ بچپن ہی سے کسی جن سے منسوب ہو جاتی ہیں۔“

میں سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سیاہ داغ میرے دماغ سے چپک گیا تھا۔ جس طرح ایک دکان کا سائن بورڈ بتاتا ہے کہ اس دکان کا مالک فلاں شخص ہے۔ اسی طرح وہ سیاہ داغ بتا رہا تھا کہ وہ لڑکی فلاں کی ملکیت ہے۔ امی نے کہا۔

”میں جا رہی ہوں۔ اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ اب تم بچے نہیں ہو کہ میں تمہیں زبردستی کھینچ کر لے جاؤں۔ تم تو ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہو گئے ہو۔ اسی لیے تو ماں کو احمق سمجھ کر اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔“

میں شش و پنج میں رہ گیا۔ امی کے ساتھ جاؤں یا نئی دلہن کی آغوش میں۔ میں نے پلٹ کر خواب گاہ کی جانب دیکھا۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ نئی دلہن کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اس لیے بڑی ہی التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے امی سے کہا۔

”عالیہ کو یہاں لا کر تنہا چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے۔ آپ چلیے میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔“

انہوں نے کہا۔

”تم نہیں آؤ گے، میں جانتی ہوں۔ تم پر اس کا جادو چل گیا ہے۔ میں ابھی جا کر تمہارے لیے دعا مانگوں گی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے، مگر کوئی ایسی عبرت حاصل ہو کہ تم آئندہ اس لڑکی کا نام لینا چھوڑ دو۔ میں دعا کروں گی۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ میں بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سہاگ رات میں مچلنے والی آرزوؤں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ نہ شادی کی خوشی تھی، نہ مہکتے ہوئے حنائی بدن کی کشش تھی۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا اسی وقت میرے شانے پر عالیہ کا ہاتھ آیا۔ پھر اس کی اداسی میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یہ جھوٹ ہے۔ مجھ پر کسی کا سایہ نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ مجھ پر کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔ پہلے آپا بھی یہی سمجھتی تھیں کہ مجھ پر کسی غیبی قوت کا سایہ ہے۔ میں شرم سے انہیں حقیقت نہ بتا سکی۔ وہ جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے کراتی رہیں۔ آخر کار ایک ڈاکٹر نے انہیں حقیقت بتا دی۔ مجھے ہسٹیریا کا مرض ہے۔ بعض لڑکیوں کو عین شباب کے عالم میں ایسا ہوتا ہے۔ میں شادی سے پہلے تمہیں یہ بات کیسے بتا سکتی تھی۔ شرم و حیا بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپا سمجھ گئی تھیں کہ شادی ہوتے ہی یہ مرض ختم ہو جائے گا اور مجھ پر کبھی دورہ نہیں پڑے گا۔“

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور الجھ رہا تھا۔ وہ لڑکی اپنی ذات میں ایک عجائب گھر تھی۔ ہر پہلو سے ایک نیا چہرہ۔ ایک نئی پریشانی لے کر آتی اور سوچنے کا انداز بدل دیتی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ وہ بڑے ارمانوں سے دلہن بن کر آئی ہے۔ مجھے اس کے جذبات کو سمجھنا چاہیے۔

میں کرسی سے اٹھ گیا اور اتنی دیر میں پہلی بار پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اس وقت مجھے وہ پرائی لگی۔ جیسے وہ میری نہیں ہے کسی دوسرے کی ہے۔ اس کے باوجود میرے اندر ایک جذبہ بول رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ کے دائرے میں اسے سمیٹ لیا اور اسے اسی طرح سمیٹے ہوئے خواب گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ ایسے وقت میرے اندر ایک کپکپی سی محسوس ہوئی۔ وہ جذباتی کپکپاہٹ نہیں تھی، کوئی اور بات تھی۔ کوئی انجانا سا مبہم سا خوف تھا۔ میں سہاگ کی سیج پر ایسے جا رہا تھا جیسے کسی انجانے دشمن سے نبرد آزما ہونے جا رہا ہوں۔

وہ سیج پر لجاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اسے بازوؤں میں لینا چاہا تو وہ ذرا کترا کر روشن بلب کی طرف دیکھنے لگی۔ اشارہ تھا کہ میں بتی بجھا دوں اندھیرا کر دوں۔

اندھیرا۔۔۔ میں اتنا احمق نہیں تھا کہ اندھیرا کر کے کسی خطرے کو دعوت دیتا۔ جب تک روشنی تھی وہ میرے لیے معصوم اور بے ضرر تھی۔ صرف روشنی میں ہی میں اس پر اعتماد کر سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں کھینچ کر کہا۔

”روشنی رہے گی۔ مجھے تاریکی پسند نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر میں اس پر جھک گیا۔ میرے ہونٹ اس کے لبوں سے متعارف ہونے لگے۔ میں جذبات سے مغلوب نہیں تھا کیونکہ محتاط رہنے کا جذبہ زیادہ حاوی تھا۔ مگر اس کی سانسیں سلگنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اس کی دونوں بانہیں میری گردن میں حمائل ہو گئیں۔ وہ ہر آن لہرلہرا ابھر رہی تھی۔ بپھر رہی تھی۔ مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی میری سانسیں رکنے لگیں۔ میری گردن آہنی شکنجے میں تھی۔ میں کیسے یقین کر لیتا کہ ایک عورت کی بانہوں میں اتنی قوت ہو گی۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی بانہوں کو اپنی گردن سے الگ کیا اور اسے پرے دھکیل دیا، اور اپنی گردن سہلانے لگا۔

اف! عورت جو بظاہر کمزور نظر آتی ہے۔ کیا اس کے اندر اتنی قوت چھپی ہوتی ہے۔ میں نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بستر پر پڑی تھی۔ اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے شرمانے کے انداز میں

خود کو چھپا رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میری قمیص کے دامن کو پکڑ رکھا تھا۔ یعنی دامن تھام کر فریاد کرنے کا انداز تھا کہ تم نے مجھے چھوڑ کیوں دیا۔

پھر اس نے بڑی آہستگی سے میرے دامن کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ خاموش ہاتھ کی خاموش ادا مجھے پکار رہی تھی۔ اوہ! ایک عورت میرے لیے چیلنج بن گئی تھی اور۔۔۔ اور میں بالکل ٹھس ہو گیا تھا۔ میرے اندر تمام جذبے سو گئے تھے اور وہ خاموشی سے ایک مرد کو للکار رہی تھی۔ میں نے پھر جرات کی۔ پھر ایک بار خطرہ مول لے کر اس کے قریب چلا گیا۔ تقریباً اس پر چھا گیا۔ اس طرح کہ میرا ہاتھ اس کے جسم پر بھٹک رہا تھا اور دماغ کہیں اور بھٹکتا جا رہا تھا۔ ہاتھ کی انگلیاں اور دماغ دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ بڑی دیر کے بعد میرا ہاتھ اس مقام پر پہنچا جہاں وہ سیاہ داغ تھا۔ میں تو پہلے ہی سرد تھا۔ میرے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے فوراً ہی ہاتھ وہاں سے ایسے کھینچ لیا جیسے وہ داغ ایک جلتا ہوا انگارہ ہو۔ ایک دمکتا ہوا سائن بورڈ جو کہہ رہا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہے۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی، میں ہزار کوششوں کے باوجود اس کے جسم کے حصول سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے تنفس میں ایسی تیزی تھی۔ ایسی آواز تھی جیسے غرا رہی ہو۔ اس کے ناخن میرے جسم میں پیوست ہو گئے تھے۔ پھر وہ جیسے ہی میرے شانوں کو دانتوں سے چبانے لگی، میں مارے دہشت کے چیخ پڑا۔

"چھوڑو مجھے۔ چھوڑو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ عالیہ تمہاری ہے۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ اب میں اس کے قریب نہیں آؤں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں اسے کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

میں نے اپنی پوری اور آخری قوت صرف کرتے ہوئے اسے پرے ہٹایا اور اچھل کر پلنگ سے نیچے آ گیا۔

وہ چیخیں مارتی ہوئی بیٹھ گئی اور بال نوچنے لگی۔ کسی درندے کے منہ سے شکار نکل جائے تو وہ کیسے جھلاتا ہے۔ ویسے ہی وہ جھلا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور وحشت زدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی میری طرف لپکی۔ میں وہاں سے اچھل کر بھاگا۔ بھاگتے وقت مجھے اتنا ہوش تھا کہ دروازے کو بند کر دوں۔ خواب گاہ سے نکلتے ہی میں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا اور جتنی تیزی سے دوڑ سکتا تھا وہاں سے دوڑ لگاتا چلا گیا۔ مکان سے نکلتے وقت اس کے چیخنے اور دروازہ پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر اب میں اس سے ہمدردی کرنے کے لیے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ میں قسمیں کھا رہا تھا کہ اب کبھی اس کے قریب نہیں جاؤں گا۔"

ہشام نے کرسی پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم پھر اس کے قریب کبھی نہیں گئے۔"

"نہیں، ہمارا سامنا ہوا۔ مگر وہ میاں بیوی کا ازدواجی رشتہ قائم نہ ہوا۔"

ہشام ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ پھر ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنس رہے ہو۔" فیصل نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں مجھے ہنسنا نہیں چاہیے۔ تمہاری بدنصیبی پر رونا چاہیے۔ اتنی حسین لڑکی کے قریب جا کر بھی اس کی قربت سے محروم ہو گئے۔ تم اچھے خاصے پڑھے لکھے جاہل ہو۔ اس نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے اور ایسی لڑکیاں شادی کے بعد یکلخت نارمل ہو جاتی ہیں۔ کیا شادی کے بعد کا مطلب تم نہیں سمجھے تھے۔ اگر تم ازدواجی وظیفہ ادا کر دیتے تو اسے سہاگ کی سیج پر دورہ نہ پڑتا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں؟"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ اگر اس کی ہمزاد یا اس پر قابض ہونے والا جن مجھ سے انتقام نہیں لینا چاہتا ہے اگر وہ محض ہسٹیریا کا دورہ ہے تو پھر وہ اپنے ساتھ خنجر کیوں لائی تھی؟"

"خنجر۔۔۔" ہشام نے تعجب سے کہا۔

"تم نے خنجر کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ کیا وہ خنجر چھپائے ہوئی تھی۔"

"ہاں رخصتی کے وقت جو اٹیچی وہ ساتھ لائی تھی اور اسے خواب گاہ میں لے جا کر رکھا تھا اس میں وہ خنجر رکھا تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں کپڑے پھاڑتی میری طرف نہیں، بلکہ میرے پیچھے رکھی ہوئی اٹیچی کی طرف جا رہی تھی۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ جاتا تو اس رات وہ پھر سے حملہ کرتی۔ اس وقت مجھے اس خنجر کا علم نہیں تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا میں واقعات کی ترتیب سے بتاتا ہوں۔ اگر تم اِدھر اُدھر کے سوالات کرو گے تو میں بہت سی باتیں بھول جاؤں گا۔

دیکھو ہشام! تم بار بار مادی اسباب پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ عالیہ کسی پراسرار قوت کے زیرِ اثر میرا پیچھا نہیں کر رہی ہے اور میں کہتا ہوں کہ ذرا صبر کرو۔ جب وہ چار بجے تمہاری کوٹھی کے بند دروازوں سے گزر کر یہاں آئے گی تو تم ساری مادیت بھول جاؤ گے۔"

ہشام نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ تمہاری آپ بیتی ہونے تک اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم بتاؤ کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ عالیہ کو خواب گاہ میں قید کرنے کے بعد تم کہاں گئے؟"

"مجھے کہاں جانا چاہیے۔ یہ میں خود نہیں جانتا تھا۔ بس میں تیزی سے دوڑنے کے انداز میں چلتا جا رہا تھا۔ ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ ہوں۔ کیونکہ تنہا ویران راستوں میں اس بات کا خدشہ تھا کہ پھر وہ کہیں سے چلی آئے گی۔ میں نے تو یونہی گھبراہٹ میں خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا تھا ورنہ یہ تماشا تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ بند دروازے سے بھی گزر کر چلی آتی ہے۔

دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ راستے ویران ہوتے جا رہے تھے۔ میں ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں گاہکوں کی بھیڑ تھی۔ میں چائے کا آرڈر دے کر ایک کونے کی میز پر چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہاں بیٹھ کر کتنی پیالیاں چائے پی اور کتنے سگریٹ پھونکتا رہا۔ جب ذہن صحیح معنوں میں کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ تدبیر سوجھی کہ کسی جن کے انتقام سے محفوظ رہنے کے لیے مجھے ایک باکمال عامل کا سہارا لینا چاہیے۔ میں نے فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر چائے کا بل ادا کیا۔ باہر آیا تو راستے کی ویرانی دیکھ کر پتا چلا کہ میں گھنٹوں ہوٹل میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس وقت تقریباً دو بج رہے تھے۔ میں ایک رکشے پر بیٹھ کر ایک مشہور و معروف عامل کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے عامل کو شروع سے اب تک کے حالات بتائے۔ یعنی اس وقت سے جب میں نے پہلی بار دروازے کے شگاف سے جھانک کر اسے دیکھا تھا۔ پھر ڈاک بنگلے کا واقعہ بتایا۔ اس کے بعد سہاگ کی رات کی تفصیل بیان کی اور امی نے جو باتیں کہی تھیں۔ وہ بھی من و عن دوہرا دیں۔ عامل نے کہا۔

"آپ کی امی درست کہتی ہیں اور آپ کو پیش آنے والے حالات بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس لڑکی پر کسی جن کا سایہ ہے اور وہ جن لڑکی کو معمول بنا کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تمہارے ستارے اچھے ہیں یا پھر تمہاری امی کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اسی لیے تم اب تک محفوظ ہو۔ جب تک تم اس جن کو یقین نہیں دلاؤ گے کہ تم نے اس لڑکی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ وہ تمہارا پیچھا کرتا رہے گا۔ اس کا یہی ایک راستہ ہے کہ تم اسے طلاق دے دو اور مزید یقین دہانی کے لیے جتنی جلدی ہو سکے کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لو۔

عامل نے نہایت ہی معقول مشورہ دیا تھا۔ جب میں اس کے پاس سے واپس ہوا تو خیال ہی خیال میں عالیہ کو طلاق دیتے ہوئے بڑی تقویت حاصل ہو رہی تھی کہ یقیناً اب تمام بلائیں مجھ سے دور ہو جائیں گی اور میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے ایک خوش گوار زندگی گزاروں گا۔

دوسری لڑکی کے متعلق سوچتے وقت انیلا کا خیال آیا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے لیے کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ اس لڑکی کو اپنی دلہن بنانے کی خوشی کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ غریب بھی تھی۔ بے سہارا بھی تھی ایسی لڑکیاں جو آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ صرف وقتی دلچسپی ہوتی ہے۔ پھر ان کے متعلق سوچنے کو جی نہیں چاہتا۔

میں اپنے معیار کے مطابق کسی حسین لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایسی حسین لڑکی جیسی عالیہ تھی۔ یعنی میں عالیہ کا بدل تلاش کر رہا تھا۔ میرے تصور میں کتنے ہی حسین چہرے آئے۔ میں نے خیال ہی خیال میں کتنی ہی حسین لڑکیوں کو اپنی آغوش کی زینت بنایا۔ لیکن ۔۔۔ لیکن ان کے لیے بھی جذبات نہیں مچل رہے تھے۔ جس طرح میں سہاگ کی سیج پر عالیہ کے قریب سرد تھا۔ اسی طرح اب بھی میرے اندر برف جمی ہوئی تھی۔

میں گھبرا کر چلتے چلتے رہ گیا۔ انیلا، عالیہ اور تمام خیالی لڑکیاں میرے لیے مٹی کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ میرے احساسات و جذبات اس طرح مردہ ہو گئے تھے کہ مجھے ان میں کوئی دلچسپی، کوئی رنگینی یا کسی طرح کی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

کوئی بھی مرد کیا ایسی کمزوری برداشت کر سکتا ہے۔

میرے اندر جو تبدیلی بتائی تھی وہ بڑی توہین آمیز تھی، وہ مجھ میں۔ ایسا انقلاب کیسے آ گیا۔

آہ۔۔۔! اگر وہ عالیہ پر قابض ہونے والا مجھے زندہ مرد مگر سرد بنا رہا تھا تو یہ عجیب وغریب ظالمانہ انتقام تھا۔ میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ عالیہ اٹیچی سے خنجر نکال کر اسے میرے سینے میں اتار دیتی۔

نہیں میں یہ شرمندگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود کو آزمانے کے لیے سوچ کر ستی گلیوں میں چلا گیا۔ خیالی گناہوں کے بازار میں ایک گناہ گار کا کردار ادا کرنے لگا۔ کچھ تو حرارت محسوس ہو۔ جا کے وہ برف پگھلے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ایسی وہ عالیہ کا آسیب مجھے خوامخواہ پریشانیوں میں رہا تھا۔ میں تمام رات انیلا کے پاس رہا۔ خوش خبری سنائی کہ کل میں عالیہ کو طلاق دے دوں گا اور اس سے شادی کر لوں گا۔

دوسری صبح میں عالیہ کی بہن کے پاس گیا اور اسے صاف صاف کہہ دیا۔

”میں ایک آسیب زدہ لڑکی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا آپ میرے ساتھ چلیے میں ابھی اسے طلاق دے دوں گا۔“

پہلے تو وہ بگڑنے لگی اور کہنے لگی کہ وہ اپنی بہن کی زندگی برباد نہیں ہونے دے گی جب میں نے اسے رات کا واقعہ بتایا کہ کس طرح وہ وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ کرنا چاہتی ہے تو اس کی بہن پریشان ہو گئی اور قسمیں کھانے لگی اور مجھے یقین دلانے لگی کہ اس کی بہن آسیب زدہ نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ اس مکان میں آئی جہاں میں عالیہ کو چھوڑ کر گیا تھا۔ راستے میں وہ مجھے سمجھاتی رہیں، التجائیں کرتی رہیں کہ اس وقت اگر میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ نہ کیا تو ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

ہم مکان میں پہنچے تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عالیہ نہائی دھوئی نئے لباس میں بن سنور کر بیٹھی ہوئی تھی، وہ ایسی حسین، ایسی دلنشین لگ رہی تھی کہ سیدھی دل میں آ کر، دل میں بیٹھ کر دل نشینی کا مفہوم ادا کر رہی تھی۔ دن کی روشنی میں اسے دیکھ کر کسی طرح کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مگر وہ کھلا ہوا دروازہ۔۔۔ میں نے اس کی بہن سے کہا۔

”دیکھیے آپ کہتی ہیں کہ یہ آسیب زدہ نہیں ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جو دروازہ باہر سے بند تھا، اسے کھول کر یہ کیسے باہر آ گئی۔“

عالیہ مجھے غصے اور شاکی نظروں سے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں پوچھ رہی تھیں کہ ”میں اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔۔۔“

”نہیں میں نے خود ہی کھولا ہے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”فیصل تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے جن نے آ کر مجھے بند کمرے سے آزاد کر دیا تھا۔“

”عالیہ پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو۔ فیصل کو اس کی امی نے سمجھایا ہے کہ تم پر جن کا سایہ ہے۔ کل سے یہ اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں کہ تمہیں طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔“

عالیہ نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ اس کا غصہ اور اس کا طنزیہ انداز سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بڑی آہستگی سے ایک فریادی کی طرح بولنے لگی۔

”کیا یہ انصاف ہے فیصل! تم میرے مجازی خدا ہو کر میری بدنصیبی کو نہیں سمجھتے۔ دنیا والوں نے مجھے آسیب زدہ کہا تو تم نے یقین کر لیا اور مجھے جنون کی حالت میں سنبھالنے اور سہارا دینے کے بجائے یہاں تنہا بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا یہ انصاف ہے؟“

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا، ایسی فریاد اور ایسی التجا تھی کہ میں اس کے متعلق دوسرے پہلو سے سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یعنی یہی کہ اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ ایک ذرہ بھی آسیب زدہ نہیں نظر آ رہی تھی دل نہیں مانتا تھا کہ وہ حسین منہ جبیں، قیامت خیز شباب کی منہ بولتی تصویر میری دشمن ہو سکتی ہے۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کر سکتی ہے نہیں کم از کم اس وقت اسے دیکھ کر اس پر کوئی الزام لگانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”میں اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوش پڑی رہی۔ ہوش آیا تو رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ مجھ پر دورہ پڑا تھا اور سب سے زیادہ تکلیف دہ احساس یہ تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں نے باہر نکل کر تمہیں بلانا چاہا تو دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں تمہیں آوازیں دیتی رہی، تنہا کمرے میں روتی اور چیختی رہی۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ تم اس مکان سے چلے گئے ہو۔

صبح میں نے باہر نکلنے کے لیے تدبیر کی۔ میں نے سوچا کہ دروازے کے جس حصے میں چٹخنی لگی ہے اگر اس حصے کو کسی چیز سے کاٹ دیا جائے تو دروازہ کھل جائے گا۔ یہ تدبیر ذہن میں آتے ہی میں نے خنجر نکال کر اس کی نوک سے چٹخنی کے اطراف لکڑی کے حصے کو کھود کھود کر دروازے کو۔۔۔“

”خنجر۔۔۔!“ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گھبرا کر بولا۔

”تم۔۔۔ تم یہاں بھی خنجر لے کر آئی ہو۔ خود کو اتنی معصوم ظاہر کرتی ہو۔ کیا کوئی شریف اور معصوم لڑکی اپنے ساتھ خنجر لیے پھرتی ہے۔ وہ بھی شادی کی رات، سہاگ کے کمرے میں، میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ کبھی کوئی دلہن اپنے میکے سے خنجر لے کر آتی ہے۔“

اس کی بہن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

”یہ کیا حماقت ہے عالیہ! تم وہ خنجر اپنے ساتھ یہاں کیوں لائی ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ فیصل اپنی امی کی باتوں میں آ کر مجھے آسیب زدہ سمجھیں گے تو میں اسے اپنے ساتھ نہ لاتی۔“

”مگر تم اسے اپنے ساتھ کیوں رکھتی ہو۔“

وہ چند لمحوں خاموش رہی۔ اپنی بہن کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”آپا۔۔۔! میں آپ سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ مگر اب اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ مجھے اپنی خاوند کی غلط فہمی دور کرنی ہے۔ شادی سے ایک دن پہلے امداد بھائی نے مجھے دھمکی دی تھی کہ مجھے شادی کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ جب بھی انہیں موقع ملا، وہ میری عزت۔۔۔ میں۔۔۔ میں کیا بتاؤں۔ آپ کو بتا کر میں آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ جب میری شادی ہو جائے گی تو میں فیصل کو یہ سب کچھ بتا دوں

گی اور وہ خنجر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ امداد بھائی کو قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کبھی عزت پر بن آتی اور بچاؤ کا راستہ نہ ملتا تو میں وہ خنجر اپنے سینے میں اتار لیتی۔ آپا میں آپ کا سہاگ اجاڑنے کے لیے امداد بھائی کو نہیں مار سکتی تھی۔ پھر میں اپنا سہاگ اجاڑنے کے لیے فیصل پر قاتلانہ حملہ کیسے کر سکتی ہوں۔ وہ تو میں نے اپنی موت کا سامان کیا ہے، کیا اتنی سی بات فیصل کی سمجھ میں نہیں آ سکتی ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے مجھے چپ سی لگ گئی۔ میں اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اس کی بہن نے کہا۔

"فیصل! اب تمہاری غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے طلاق کا خیال دل سے نکال دو۔ عالیہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے وہ تمہاری جان کی دشمن نہیں بن سکتی۔ تمام شکوک و شبہات دل سے نکال کر ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزارو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ عالیہ کو ہسٹیریا کے مرض سے جلدی نجات مل جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ خنجر تیسری بار میرے سامنے آیا ہے، پہلی بار ڈاک بنگلے کے بند کمرے میں، دوسری بار اسی ڈاک بنگلے میں عالیہ کے بستر کے نیچے، تیسری بار سہاگ کے کمرے میں۔ اب میں وہ خنجر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اسے اپنے پاس چھپا کر رکھوں گا۔ اگر عالیہ آسیب زدہ نہیں ہے تو پھر بھی وہ خنجر ہمارے درمیان نہیں آئے گا اور اگر وہ کسی آسیبی اثر کے تحت پھر بھی وہ ہتھیار لے کر میرے سامنے آئے گی تو میں کسی پس و پیش کے بغیر اسے طلاق دے دوں گا۔ میں کچھ عرصے تک عالیہ کو آزماؤں گا۔ دو مہینے، چار مہینے، چھ مہینے، جب تک مجھے اطمینان نہیں ہو گا اس وقت تک میں اس کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزاروں گا۔ یہ اسی مکان میں رہے گی اور میں وہاں امی کے ساتھ رہوں گا۔ اگر یہ عالیہ کو منظور ہے تو یہاں رہے، اگر نہیں ہے تو ابھی مجھ سے رشتہ توڑ کر چلی جائے۔ یہاں رہنے کی صورت میں، میں اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ لیکن میں اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا۔ اسے آزمانا بے حد ضروری تھا۔ وہ آزمائش سے گزر کر ہی اپنی سچائی ثابت کر سکتی تھی۔ اس کی بہن نے مجھے سمجھایا کہ میں عالیہ کے ساتھ اس مکان میں ازدواجی زندگی گزارتے ہوئے بھی اسے آزما سکتا ہوں مگر اب میں کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

عالیہ ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ اس مکان میں رہنے لگی۔ میں کبھی کبھی دن کی روشنی میں وہاں جاتا تھا وہ پیار و محبت سے التجائیں کر کے مجھے روکنے کی کوششیں کرتی تھی مگر میں چلا آتا تھا۔ اسے دیکھ کر پیاس بڑھتی تھی۔ مگر وہ پیاس انیلا بجھا دیا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کے خواب دیکھ رہی تھی اور میں اسے ٹال رہا تھا۔ اسے یہ کہہ کر سمجھا دیا کرتا تھا کہ عالیہ کی کوئی کمزوری ہاتھ آئے گی تو میں اسے طلاق دے کر اس سے شادی کر لوں گا۔

تین ماہ کے بعد امی کا انتقال ہو گیا۔ انیلا نے اور دو ماہ تک صبر کیا۔ پھر وہ لڑنے جھگڑنے لگی کہ جلدی شادی کر دو کیونکہ ایک جوان مرد اور ایک جوان عورت کا ایک مکان میں تنہا رہنا مناسب نہیں۔ محلے کے لوگ باتیں بناتے ہیں۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ باتیں بنانا اور لڑنا جھگڑنا سیکھ گئی ہے۔ عورت اپنی آخری پونجی دے کر مرد سے لڑنے کا حق حاصل کر لیتی ہے۔ اس لیے وہ بیاہتا نہ ہونے باوجود بیوی کے تمام حقوق حاصل کر رہی تھی۔

دوسری طرف عالیہ صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ان دنوں صوم و صلوۃ کی پابند ہو گئی تھی۔ کئی بار میں نے اسے کلام پاک کی تلاوت کرتے اور نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ دس ماہ کے عرصے میں بوڑھی ملازمہ نے بتایا کہ صرف دو بار اس پر جن آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ دو ماہ اور انتظار کر لوں۔ اگر اب بھی اس پر جن آیا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا تو میں اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کر لوں گا۔

میں دو ماہ تک انیلا سے پیچھا چھڑانے کے لیے حسن پور سے باہر چلا گیا۔ میری تاریخ پیدائش ۲۸ جنوری ہے۔ میں ۲۶ جنوری کو واپس آ گیا۔ اس رات انیلا نے مجھ سے خوب جھگڑا کیا۔ مجھے جھوٹا اور فریبی کہنے لگی۔ میں نے اسے دو چار ہاتھ جما دیے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے کی طرح مرعوب ہو کر بستر پر چلی آئے گی۔ لیکن وہ تو شیرنی بن گئی تھی۔ مار کھا کر لڑاکا عورتوں کی طرح مجھے نوچنے کھسوٹنے لگی۔ مجھے دھمکیاں دینے لگی کہ اگر میں نے شادی نہ کی تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ میں نے اس کی اچھی طرح مرمت کر دی ایسے کرارے ہاتھ لگائے کہ وہ چکرا کر گر پڑی۔

آدھی رات گزر چکی تھی ۲۷ تاریخ شروع ہو گئی تھی۔ میں اپنا سوٹ کیس کھول کر اس خنجر کو تلاش کرنے لگا جس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور جسے میں عالیہ سے مانگ کر لایا تھا۔ وہ سوٹ کیس میں نہیں تھا۔ میں اسے دوسرے سامان میں تلاش کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے کی تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا ہے میرے جنم دن کو صرف چوبیس گھنٹے رہ گئے تھے۔ ٹھیک ایک سال پہلے وہ خنجر میری زندگی کو للکارنے آیا تھا۔ ٹھیک چار بجے میں نے زندگی کی پہلی سانس لی تھی اور وہ خنجر چار بجے ہی میری آنکھوں میں اترنا چاہتا تھا۔ میں نے گھبرا کر انیلا سے پوچھا۔

"وہ خنجر کہاں ہے، جو اس سوٹ کیس میں رکھا تھا۔"

وہ مار کھانے کے بعد فرش پر اوندھے منہ پڑی کراہتی جا رہی تھی۔ اس نے مجھے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم۔ اپنی سگی سے جا کر پوچھو۔"

"اس سے کیا پوچھوں۔ یہاں تم رہتی ہو۔ وہ تو یہاں کبھی نہیں آئی۔"

"آئی تھی۔ پرسوں تمہیں پوچھنے آئی تھی۔ میں اسے یہاں بٹھا کر چائے بنانے گئی تھی۔ وہ تو تمہاری بیاہتا ہے نا۔ یہاں تمہاری کسی بھی چیز کو ہاتھ لگائے گی تو میں اسے روکوں گی؟ اچھا ہے اللہ کرے کہ وہ خنجر لے گئی ہو۔ تمہارے لیے وہی ٹھیک ہے جو تمہارا قیمہ بنانا چاہتی ہے۔"

میں نے غصے سے آگے بڑھ کر اسے ایک ٹھوکر ماردی۔ وہ دوسری طرف کراہتی ہوئی الٹ گئی۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اگلی رات میں نے اپنے دوست کے ہاں گزاری۔ تم الیاس کو جانتے ہو نا۔ کبھی وہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔ میں نے اسے تمام باتیں بتا دیں اس نے بھی تمہاری طرح یہ دعوا کیا کہ عالیہ آسیب زدہ نہیں ہے۔ وہ خنجر میرے ہی ہاتھوں سے گم ہو گیا ہے۔ پرسوں عالیہ اور انیلا دونوں ہی الیاس کے ہاں آ کر میرے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی جانتی تھیں کہ الیاس میرا گہرا دوست ہے۔ الیاس نے انہیں تسلی دی تھی کہ میں دو ایک دن میں واپس آ جاؤں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کر دو تا کہ عالیہ، یہاں قدم نہ رکھ سکے۔ الیاس مجھے نادان اور احمق سمجھ کر مسکرانے لگا۔ میرے اطمینان کے لیے اس نے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ میرے ساتھ بیٹھ کر آدھی رات تک تاش کھیلتا رہا۔ پھر اپنے بستر پر جا کر سو گیا۔ ہم دونوں کے پلنگ کے درمیان چار قدم کا فاصلہ تھا۔ اس کے سونے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ کمرے میں سو پاور کا بلب روشن تھا۔ رات کو بھی دن کا اجالا سا تھا۔ پھر بھی میں سونا نہیں چاہتا تھا۔

جب نصیب سونے لگتے ہیں تو انسان بھی سونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی میری آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ غنودگی غالب آ جاتی تھی۔ پھر میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

اس کے بعد وہی سینے کا بوجھ۔۔۔ جیسے پہلی بار ڈاک بنگلے کے کمرے میں کسی کی آمد پر محسوس ہوا

تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھاری پتھر رکھ دیا گیا ہے، یا کوئی میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا ہے۔ یکلخت میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ایک کھڑکی کے آدھے شیشے پر چاند کی زرد روشنی تھی۔ اس روشنی کی دھندلاہٹ میں، میں نے عالیہ کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں خنجر لیے کھڑی تھی۔

وہی ہاتھ دانت کے دستے والا کنجر تھا۔ وہی آدھ کھلے سینے پر داغ تھا۔ اب وہ سوراخ نہیں تھا۔ اب وہ داغ بھی نہیں تھا۔ بلکہ اس سینے پر کسی کے نام کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس کی گھورتی ہوئی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرف نظر آرہی تھیں۔

پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ میرے پیروں کی طرف سے گھوم کر بائیں طرف آنے لگی۔ میں دہشت زدہ سا آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا۔

''عالیہ۔۔۔ عالیہ! ہوش میں آؤ۔ میں تمہارا خاوند ہوں۔ تمہارا مجازی خدا ہوں۔ باز آجاؤ۔ میرے قتل سے باز آجاؤ۔''

لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا حلق خشک ہوگیا تھا۔ زبان تالو سے چپک گئی تھی اور وہ بالکل قریب آگئی تھی۔ اپنی ہتھیلی پر خنجر کو تول رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھی دانت کے دستے کو مضبوطی سے جکڑ لیا اور مجھ پر حملہ کردیا۔

میں چیختا ہوا پلٹ گیا۔ پلٹ کر لڑھکتا ہوا پلنگ سے نیچے گر گیا اور ذبح ہونے والے بکرے کی طرح پاؤں جھٹک جھٹک کر چیخنے لگا۔

''کیا ہوا فیصل۔۔۔ کہاں ہو تم؟''

اندھیرے میں الیاس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ میرے قریب آگیا اور مجھے جھنجھوڑنے لگا۔

''ہوش میں آؤ فیصل! گھبراؤ نہیں میں تمہارے پاس ہوں۔''

''وہ۔۔۔ وہ آئی ہے۔ اس کمرے میں ہے۔ بتی جلاؤ، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ بتی نہ بجھانا۔''

''میں نے تو نہیں بجھائی تھی۔'' الیاس نے کہا۔

''پتا نہیں کیسے اندھیرا ہوگیا۔ ٹھہرو میں لائٹ آن کرتا ہوں۔''

وہ ماچس کی تیلی جلا کر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا اور جلتی ہوئی تیلی کی روشنی میں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس تیلی نے کمرے کو اس حد تک روشن کردیا تھا کہ وہ نظروں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔

سوئچ آن کرنے کے بعد بھی بلب روشن نہیں ہوا۔ شاید باہر سے کسی نے مین سوئچ آف کیا تھا۔ الیاس نے دوسری تیلی جلا کر کہا۔

''دیکھو دروازہ اندر سے بند ہے۔ وہ کس طرح آسکتی ہے اور یہاں سے کیسے جاسکتی تھی۔ تم نے یقیناً خواب دیکھا ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ تمہارے جنم دن کی ہر صبح چار بجے تمہیں قتل کرنے آیا کرے گی۔

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی عورت کی ہلکی سی چیخ ابھری اور ڈوب گئی۔

''کون ہے؟'' الیاس دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ میں دوڑتا ہوا مین سوئچ کے پاس پہنچ گیا۔ اسی وقت الیاس کی آواز آئی۔

''میں نے پکڑ لیا ہے کہاں جائے گی بچ کے۔''

میں نے سوئچ آن کردیا پھر برآمدے کی روشنی میں، میں نے عالیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی خنجر تھا۔ مگر اس کے دونوں ہاتھ الیاس کی گرفت میں تھے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے جا رہا تھا اور وہ چیخ رہی تھی۔

''چھوڑ دو مجھے۔ میں فیصل کی دشمن نہیں ہوں۔ میں اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے یہاں آئی تھی۔''

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ الیاس نے کہا۔

''ٹھہرو فیصل! پہلے اس کی باتیں سن لو۔''

''باتیں کیا خاک سنوں۔ کیا اب بھی تم یہ کہو گے کہ یہ عورت آسیب زدہ نہیں ہے۔''

الیاس نے اسے پلنگ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ مگر عالیہ مار کھا کر غصے سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جھلا کر بولا۔

''آسیب زدہ میں نہیں ہوں وہ تمہاری داشتہ ہے جس کے ساتھ تم اپنا منہ کالا کرتے ہو۔ اس کے ساتھ شادی کے جھوٹے وعدے کرتے ہو۔ پرسوں اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب اگر تم نے شادی سے انکار کیا تو وہ تمہیں قتل کردے گی۔ اس نے تمہارے سوٹ کیس سے یہ خنجر نکال کر رکھ لیا تھا۔ میں اس کے خطرناک ارادے سے تمہیں آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ آج دس بجے مجھے پتا چلا کہ تم واپس آگئے ہو۔ بوڑھی ملازمہ تمہارے ہاں گئی تو معلوم ہوا کہ تم انیلا سے لڑ جھگڑ کر گئے ہو۔ میں سمجھ گئی کہ تم الیاس بھائی کے ہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ خنجر انیلا کے پاس ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔ بہتر یہی ہے کہ انیلا اپنے ارادے پر عمل کرے تو میں اسے موقع پا کر پکڑ لوں۔ یہ سوچ کر میں تمہارے گھر کے باہر ایک درخت کے پیچھے کھڑی رہی۔ چار بجنے سے کچھ دیر پہلے انیلا گھر سے نکلی۔ میں بھی اس کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں آئی۔ وہ یہاں کی کھڑکیوں اور دروازوں کو بند دیکھ کر ناکام لوٹ رہی تھی مگر میں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ خنجر پھینک کر مجھے مارنے لگی۔ میں کیا کروں۔ اس کے مقابلے میں کمزور تھی۔ اس لیے وہ مجھے دھکا دے کر بھاگ گئی۔ میرا سر ایک دیوار سے ٹکرایا تو حلق سے چیخ نکل گئی۔ اسی وقت الیاس بھائی کے للکارنے کی آواز آئی میں زمین پر پڑا ہوا خنجر اٹھا رہی تھی کہ انہوں نے آکر مجھے پکڑ لیا۔

''بہت عمدہ کہانی ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں حقارت سے کہا۔

''تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتوں کا یقین کر لوں گا۔ پہلے تم اپنے پاس خنجر رکھنے کا یہ جواز پیش کرتی تھی کہ تمہیں امداد خان کی طرف سے خطرہ ہے۔ آج یہاں امداد خان تمہاری عزت سے کھیلنے نہیں آیا۔ اس لیے اس خنجر کو انیلا کے سر تھوپ رہی ہو۔''

''میں پہلے ہی سمجھتی تھی کہ تم مجھ پر کبھی اعتبار نہیں کرو گے۔ ایک ثبوت حاصل کرنے کے لیے میں یہاں آئی تو پھر مجھ پر الزام لگ گیا۔ میں ہار گئی فیصل! میں اپنی بدنصیبی سے ہار گئی ہوں۔ اتنے صبر اور انتظار کے بعد بھی میرے نصیب نہیں بدلے۔''

''بدلیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اسی آسیب کے سائے میں رہ کر تمہارے نصیب بدلیں گے۔ میں چاہوں تو اس خنجر کے ساتھ تمہیں پولیس کے حوالے کرسکتا ہوں۔ مگر اس طرح عدالت میں بار بار پیشی ہوگی تو بار بار تمہارا سامنا ہوگا اور اب میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس

پاگل

ایک پاگل امریکن سے۔ ''تم جاپانی ہو ناں؟''

امریکن: ''نہیں، میں امریکن ہوں۔''

پاگل: ''نہیں، تم جاپانی ہو۔''

امریکن: ''نہیں میں امریکن ہوں۔''

پاگل: ''نہیں تم جاپانی ہو۔''

امریکن: ''ہاں، ہاں...... میں جاپانی ہوں۔''

پاگل: ''مگر، تم لگتے تو امریکن ہو۔''

کرایہ

ہوٹل کے مالک نے مسافر کو کمرہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کمرے کا کرایہ دس روپے اس لئے زیادہ ہے کہ کمرے کی کھڑکی سے آپ دور دور تک نظارہ کرسکتے ہیں۔''

مسافر نے جواب دیا۔ ''پھر آپ دس روپے فوراً کم کردیں، کیوں کہ میری نظر کمزور ہے۔ نظارہ نہ کرسکوں گا۔''

لیے تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ میں پورے ہوش وحواس میں رہ کر تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ مذہب کی رو سے تین ماہ کے عرصے میں خوب سوچ سمجھ کر طلاق دی جاتی ہے۔ میں تمہیں ایک سال تک اچھی طرح سمجھنے اور پرکھنے کے بعد طلاق دے چکا ہوں۔ کل صبح تمہیں طلاق نامہ کے ساتھ مہر کی پوری رقم مل جائے گی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

میں منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پلنگ سے اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کہا۔

''میں جا رہی ہوں۔ مگر میری زندگی برباد کر کے تم بھی سکون سے نہیں رہ سکو گے۔''

اس کے لہجے میں ایک چیلنج تھا۔ اس وقت میں نے اس چیلنج کو اہمیت نہیں دی۔ لیکن اب۔۔۔ اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔

یہ ایک سال۔۔۔ پورا ایک سال۔۔۔ میں نے آج کے انتظار میں گزارا ہے۔

ہر مہینہ۔۔۔ ہر دن اور ہر لمحہ وہ میرے اندر بیٹھ کر بولتی رہی کہ میں آؤں گی خنجر بکف آؤں گی۔

میری بھوک مر گئی۔ میری آرزوئیں اور میری خوشیاں مر گئیں۔ میں بیمار رہنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی گئیں۔ مجھے اختلاج قلب کا مرض لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ فکر اور پریشانیوں کو بھول جاؤ۔ خوش رہا کرو۔ ورنہ۔۔۔

انہوں نے آگے کچھ نہیں کہا مگر میں جانتا ہوں کہ اس بیماری کا انجام یہی ہے کہ کسی بھی وقت حرکت قلب بند ہو جاتی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج۔۔۔ صرف آج وہ نہ آئے تو مجھے تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ میں تسلیم کرلوں گا کہ وہ آسیب زدہ نہیں تھی میں آسیب زدہ تھا۔ میں نے کسی جن کو، کسی ہمزاد کو یا کسی بدروح کو اپنے دماغ میں بٹھا لیا تھا۔

لیکن نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آئے گی۔ جیسے تمہیں مکمل یقین ہے کہ اس رات کے بعد صبح کی روشنی کمرے میں آئے گی اسی طرح مجھے یقین ہے کہ۔۔۔'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔'' دیوار گھڑی چار کے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

یک بیک زور سے بجلی کوندی۔ بہت قریب سے بجلی کوندی۔ اس کی کڑک دار آواز سے در و دیوار لرز گئے۔ کھڑکیوں کے شیشے تڑخ گئے اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

وہ خنجر بکف کھڑی تھی۔ فیصل نے اسے دیکھا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ دیدے پھیل گئے اور وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ ہشام نے پریشان ہو کر دروازے کی جانب دیکھا پھر اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا حرکت ہے، تمہیں ایک دہشت زدہ انسان کے سامنے اس طرح نہیں آنا چاہیے۔''

''آپ ہٹ جایئے سامنے سے!'' وہ جھلا کر بولی۔ ''یہ کم بخت مجھے یہاں بھی بدنام کرنے چلا آیا ہے۔ اب میں خود ہی اس کے ہاتھ میں خنجر دے کر کہتی ہوں کہ یہ میرے ٹکڑے کر دے تا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔''

ہشام نے اس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور فیصل کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

''میرے دوست! میں تمہاری آپ بیتی کے جواب ٹھوس ثبوت کے ساتھ دینا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی سے تمہیں ملا کر۔ اب یہ خود ہی آ گئی ہیں تو انہیں اچھی طرح پہچان لو۔ یہ تمہاری نئی بھابھی ہے۔ فیصل اٹھو۔ ایسے چپ کیوں ہو گئے ہو؟''

اس نے فیصل کے شانے کو ہلایا تو اس کا جسم ایک طرف ڈھلک گیا۔